ورفعنا لك ذكرك

# چہرۂ نبوت ﷺ

## قرآن کے آئینے میں

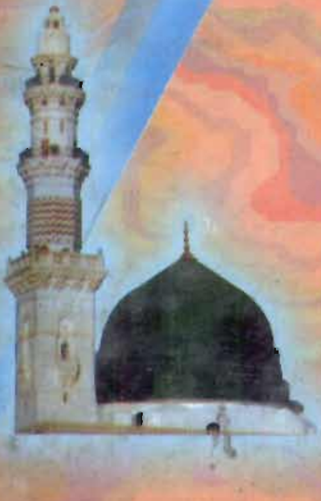

مولانا محمد حنیف ندویؒ
مولانا محمد اسحاق بھٹی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- **کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- **مجلس التحقیق الاسلامی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد **(Upload)** کی جاتی ہیں۔
- **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ **(Download)** کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

ورفعنا لک ذکرک

# چہرۂ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم

## قرآن کے آئینے میں

مولانا محمد حنیف ندویؒ

مولانا محمد اسحاق بھٹی

علم و عرفان پبلشرز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ............ | چہرۂ نبوت ﷺ قرآن کے آئینے میں |
| مصنف | ............ | مولانا محمد حنیف ندوی / |
| | | مولانا محمد اسحاق بھٹی |
| ناشر | ............ | علم و عرفان پبلشرز، لاہور |
| پرنٹرز | ............ | گنج شکر پرنٹرز، لاہور |
| بار اول | ............ | پانچ سو |
| سن اشاعت | ............ | 1999ء |
| قیمت | ............ | =/150 روپے |

## ملنے کا پتے

### علم و عرفان پبلشرز

7-C مارتھر سٹریٹ، 9- لوئر مال، عقب میاں مارکیٹ،
اردو بازار لاہور فون 7352332

### کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

# ترتیب مضامین

۱۔ قرآن اود سیرت پیغمبر ۷
۲۔ اسلام سے قبل کے مذاہب ۱۲
۳۔ قوم یہود کی عادات و اطوار ۱۶
۴۔ عیسائی اور خطا و نسیان کی بحث ۲۷
۵۔ تثلیث اور توحید ۳۹
۶۔ انبیا کی دعوت اور نبوت کا اصلی تصور ۵۴
۷۔ تصوف اور رہبانیت ۶۷
۸۔ عیسائی اور قرآن ۷۲
۹۔ صابئین کا گروہ ۷۷
۱۰۔ مشرکین اور ان کے افکار و عقائد ۸۱
۱۱۔ آفتاب نبوت ۹۶
۱۲۔ آنحضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی ۱۰۰
۱۳۔ خلق عظیم ۱۱۷
۱۴۔ مقام نبوت اور اس کی خصوصیات ۱۲۱
۱۵۔ وضاحت و تبیین کی ذمہ داریاں اور اطاعت رسول ۱۳۱
۱۶۔ نظریہ انکار حدیث کا منطقی تجزیہ ۱۵۱
۱۷۔ حفاظت حدیث اور قرآن ۱۷۵
۱۹۔ مسئلہ توحید اور وجود باری تعالیٰ ۲۱۲

۲۰۔ رسالت ۲۳۱
۲۱۔ آخرت ۲۳۵
۲۲۔ اعمال صالحہ ۲۳۹
۲۳۔ واقعہ معراج ۲۵۳
۲۴۔ ہجرت ۲۵۷
۲۵۔ تحویل قبلہ ۲۶۱
۲۶۔ جہاد ۲۶۳
۲۷۔ عہد نبوت کی جنگیں ۳۰۲
۲۸۔ واقعۂ اِفک ۳۰۶
۲۹۔ منافقین کا گروہ ۳۱۳
۳۰۔ آنحضرت ﷺ کی دنیوی زندگی کا آخری سال ۳۲۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حرفے چند

نومبر ۱۹۶۰ء کے آخری ہفتے کی بات ہے کہ ایک دن میں اور مولانا محمد حنیف ندوی انار کلی کے ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ مولانا اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھے اور میں ہفت روزہ "الاعتصام" کی ادارتی خدمات پر مامور تھا۔ نبی ﷺ کی سیرت طیبہ سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ بعض حضرات نے قرآن حکیم کی روشنی میں آنحضرت کی سیرت سے متعلق لکھنا شروع کیا تھا' لیکن یہ اہم کام ان سے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خدمت سرانجام دی جائے۔

میں نے عرض کیا یہ نہایت اہم اور مبارک کام ہے' اسے ضرور انجام دینا چاہیے۔

اس زمانے میں ہمارا معمول تھا کہ روزانہ شام کے بعد کسی ہوٹل میں بیٹھتے تھے اور دیر تک نشست رہتی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ وہ اتوار کو لکھا کریں گے اور اسی دن شام کو مضمون میرے حوالے کر دیا کریں گے۔ اس طرح ہر جمعے کو مضمون "الاعتصام" میں قسط وار چھپتا رہے گا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ اختتام کو پہنچ جائے گا۔

یہ طے ہو جانے کے بعد فرمایا: مضمون کا عنوان کیا ہونا چاہیے؟

کئی عنوان زیر غور آئے' جن میں ایک عنوان تھا "چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں" اور پھر اسی کو مستقل عنوان قرار دے دیا گیا اور سلسلہ شروع ہو گیا۔ چہرہ آئینے ہی میں دیکھا جا سکتا ہے اور نبی ﷺ کا چہرہ مبارک دیکھنے کا آئینہ قرآن ہے۔ آپ ﷺ کی تمام زندگی قرآن کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔ مضمون کی پہلی قسط ۲ دسمبر ۱۹۶۰ء کے "الاعتصام" میں اور آخری قسط ۷ ستمبر ۱۹۶۲ء کے "الاعتصام" میں شائع ہوئی۔ کل ۶۱ قسطیں ہوئیں۔ افسوس ہے مولانا اسے مکمل نہ کر سکے۔ انھیں متعدد مرتبہ اس کی تکمیل کے لیے عرض کیا گیا' خود انھوں نے بھی کئی دفعہ فرمایا کہ وہ اسے مکمل کرنا چاہتے ہیں' لیکن یہ سلسلہ مکمل نہ ہو سکا۔

اس مضمون کو اب کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ ہوا تو میں نے "الاعتصام" کے وہ شمارے دیکھے جن میں یہ شائع ہوا تھا اور اس میں مندرجہ ذیل امور انجام دیے۔

۱۔ قرآن کی جن آیات کا ترجمہ نہیں کیا گیا تھا' ان کا ترجمہ کیا۔

۲۔ آیات کے باقاعدہ حوالے دیے۔

۳۔ موضوع وار الگ الگ باب بنائے۔

۴۔ بہت سے مناسب مواقع پر ضمنی عنوان قائم کیے۔

۵۔ مولانا کا سلسلہ تحریر "توحید" پر ختم ہو گیا تھا جو نئی ترتیب کے اعتبار سے باب نمبر ۲۰ بنتا ہے۔ میں نے اپنے انداز سے اسے آگے بڑھایا اور قرآن کی روشنی میں نئے دس ابواب کا اضافہ کر کے نبی ﷺ کے وصال پر کتاب کو ختم کیا۔

یہ کتاب مضمون سے بالکل الگ اب نئی ترتیب اور نئے اسلوب سے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

جن حضرات نے اخبار میں مولانا کے اس مضمون کا مطالعہ کیا تھا، وہ ایک عرصے سے اس سلسلے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن یہ سلسلہ نامکمل بھی تھا اور کتابی شکل دینے کے لیے محنت طلب بھی تھا، اس لیے اس سے گریز کیا جا رہا تھا۔ اب جس طرح بھی ہو سکا، اسے مکمل کر دیا گیا ہے جو کتاب کی صورت میں قارئین کرام کے پیش نگاہ ہے۔

یہ کل تیس باب ہیں، جن میں بیس مولانا کے تحریر فرمودہ ہیں اور دس اس فقیر کے رقم کردہ ہیں۔ قرآن کی روشنی میں نبی ﷺ کی سیرت طیبہ کو جمع کرنے کی اپنے طور پر پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور اس موضوع کی یہ پہلی کوشش ہے۔

تاریخی اعتبار سے سیرت پیغمبر کو معرض بیان میں لانے کا اور انداز ہے، قرآن کی روشنی میں اس کو ضبط تحریر لانے کا اسلوب کچھ اور نوعیت کا ہے،

اس کتاب میں لائق احترام قارئین جہاں سیرت رسول کا ایک الگ انداز میں مطالعہ کریں گے، وہاں انھیں قرآن مجید کے بھی بیشتر مقامات پر دوسرے طریقے سے غور کرنے کا موقع ملے گا۔

اس کتاب کو شائع کرنے کی سعادت ادارہ علم و عرفان کے حصے میں آئی ہے۔ یہ ادارہ حال ہی میں ہمارے عزیز دوست گل فراز نے قائم کیا ہے اور اس کا مقصد دینی اور اسلامی کتب کی اشاعت ہے۔ اور یہ سلسلہ اس نے شروع کر دیا ہے۔

**محمد اسحاق بھٹی**
اسلامیہ کالونی، ساندہ، لاہور
۱۶ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ
۵ جنوری ۱۹۹۹ء

## (۱)

# قرآن اور سیرت پیغمبر

الفاظ بسا اوقات دھوکا دیتے ہیں۔ اس کتاب کے عنوان اور نام سے بظاہر شبہ یہ ہوتا ہے کہ چہرۂ نبوت کے نکھار اور دلآویزی و دلبری کی حیثیت بجائے خود معیار نہیں، بلکہ معیار حسن و جمال صرف قرآن ہے، اور دونوں میں نسبت و تعلق کی وہی نوعیت کار فرما ہے جو آئینہ دیکھنے والے اور آئینے میں ہوتی ہے۔ حالاں کہ امر واقعہ یہ نہیں۔ قرآن و سیرت میں اس سے کہیں زیادہ گہرا تعلق ہے۔ ایسا تعلق کہ جس کی وسعت پذیری دونوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی جہاں آنحضرت کی ادا ہائے ہوشربا پر قرآن کی ضوافشانیوں کے اثرات نمایاں ہیں، اور بقول ام المومنین اور رمز آشنائے رسالت حضرت عائشہؓ کے ‘آنحضرتؐ کی زندگی و اخلاق’ قرآن ہی کا دوسرا نام ہے، وہاں اس مصحف روشن کی تابانیوں کو بھی سیرت ہی سے فروغ حاصل ہے۔

غور فرمائیے۔ فہم و ادراک میں کس قدر پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ مطلع انوار کتاب جسے ہم قرآن مجید کے عالی قدر نام سے موسوم کرتے ہیں، کس درجہ مجمل اور گنجلک ہو کر رہ جاتی ہے، اگر اسے حضور کے نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے اور اس کے مخاطب اول اور مہبط وحی کی تشریحات فکر و نظر کی اولین تجلیات سے الگ کر لیا جائے۔ نیز اس جانی بوجھی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے کہ کتاب اپنی حتمی و قطعی ترجمانی کے لیے ہمیشہ ایک صاحب کتاب چاہتی ہے، جو اس کے اجمالات

اس کو تفصیلات کی روشنی میں لائے، اس کے عقدوں کو وا کرے، اس کی مشکلات کو سلجھائے اور اس کے مطالب و معانی کو عمل اور روزمرہ کی زندگی میں برت اور سمو کر دکھائے۔

قرآن و سیرت میں تعلق و نسبت کی اگر یہی نوعیت ہے تو کتاب کے نام و عنوان کے معنی یہ ہوئے کہ ایک آئینہ دوسرے آئینے کے مقابل میں ہے، ایک معیار کو دوسرے معیار کی رو سے جانچا اور پرکھا جا رہا ہے، یا پھر دو مستقل بالذات مگر ایک دوسرے سے وابستہ کسوٹیاں اور شمعیں ہیں، جن کے تقابل سے نقوش سیرت کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

یہ پیرایہ بیان بھی ممکن ہے، ادائے مطالب کی ذمہ داریوں سے پورے طور سے عہدہ برا نہ ہو سکے۔ مزید وضاحت کے لیے قرآن ہی سے رجوع کیجیے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو تلمیح اور مثال کی صورت میں یوں بیان فرمایا ہے:

**اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ** (النور: ۳۵)

> "خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے، اور چراغ قندیل میں ہے، اور قندیل ایسی صاف و شفاف ہے کہ موتی کا سا چمکتا ہوا جیسے ستارہ ہو۔ اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے، یعنی زیتون کا، نہ مشرق کی طرف ہے، نہ مغرب کی طرف۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تیل خواہ اسے آگ نہ بھی چھوئے تب بھی جلنے کو تیار ہے۔ گویا ایک روشنی ہے، جس کے فروغ کا اہتمام ایک دوسرے کی روشنی سے ہو رہا ہے۔ خدا اپنے نور سے، جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔"

آیئے اس مثال کا تجزیہ کریں۔ سورہ نور کی اس آیت میں ایک اللہ کا نور ہے جس کا تعلق سراسر ہدایت و رہنمائی کی تابش وضوء سے ہے۔ مگر کیا اس تابش وضو کی پوری پوری جلوہ گری کو تجرید کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے؟ نہیں۔! اس کے لیے ایک طاق، ایک محل اور مقام فرض کیجیے

اور یہ مان لیجیے کہ یہ طاق یا محل جس میں انوار ہدایت کو متشکل ہونا ہے، اسلامی معاشرہ اور وہ پاکیزہ ماحول ہے، جو اکتساب و ازدیاد نور کا باعث ہو سکتا ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس محل و مقام میں ایک مصباح اور چراغ بھی تو ہونا چاہیے۔ جس کی روشنی سے یہ معاشرہ کسب فیض کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ مصباح قلب پیغمبر ہی ہو سکتا ہے۔

اس مرحلے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قلب نبوت کی تعبیر بجائے خود کافی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے انوار ہدایت کی پوری پوری تابانیوں کی تشریح ہو جاتی ہے؟ نہیں!

نورِ ہدایت کیوں کر بڑھتا ہے اور زیادہ چمک اور رونق اختیار کرتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اس مصباح، یا قلب نبوت کو ایک زجاج عصمت فرض کرنا پڑے گا اور یوں کہنا پڑے گا کہ یہ ایک قندیل ہے چراغ نہیں! مگر پھر قندیل میں ایک صاف اور انوار پذیر تیل بھی تو ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر روشنی پیدا ہی نہیں ہو گی۔ اور تیل بھی ایسا جو بغیر آگ کے جل اٹھے اور سرچشمہ انوار ہو سکے۔ اس قندیل نبوت کے لیے وحی و تنزیل کے صاف اور نکھرے ہوئے زیتون کی ضرورت ہے، جس میں انسان کے نفسی و ذاتی خیالات و افکار کی جھلک نہ پائی جائے۔ جو خود بخود روشن ہو اور قصد و تعمد کی تاریکیاں اس پر اپنا سایہ نہ ڈال سکیں۔

تلمیح کے اس تجزیے سے دراصل ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ قرآن جو بمنزلہ نور اور آئینے کے ہے، اس کی تابانیوں کو دو چند کرنے اور عملی شکل میں دکھانے کے لیے پیغمبر کی تشریحات و عمل کی شدید ضرورت ہے جو ایک تاریخی ماحول اور منضبط معاشرے میں رونما ہوں۔ گویا "نور علی نور" اسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے۔ اس مثال سے ہم یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کی تابش و ضو اور آں حضرت کے انوار ہدایت میں تعلق و رشتے کی وہی نوعیت ہے جو اللہ کے نور اور ان متعلقات میں ہے جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اس مختصر وضاحت سے یہ غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے کہ قرآن میں سیرت کا کیا مذکور؟ سیرت سرتاپا حال، قرآن تمام کا تمام قال! ایک سراسر اصول، زندگی کے احکام و مسائل کا مجموعہ اور دوسری شے یکسر تاریخ اور ترتیب واقعات کا حسین مرقع! ایک زمانہ اور زمانیات سے آزاد، دوسری یکسر زمانی، بلکہ قید و وقت کی مناسبتوں میں جکڑی ہوئی! ایک آسمانی حقائق سے تعبیر، دوسری ارضی و زمینی مجبوریوں کی دلآویز داستان! ان دونوں میں ربط ہو تو کیوں کر اور تعلق ہو تو کس

طرح ـــ؟

اگر اوپر کی چند سطریں قلب و ذہن کی سطح پر مرتسم ہیں تو اس غلط فہمی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ آنحضرت اور قرآن‘ دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں‘ یا ایک ہی معنی کی دو تعبیریں ہیں۔ قرآن ایسے "قال" سے تعبیر ہے جو سیرت کے حال کے ساتھ مل کر زندگی کے خانوں کی تشکیل کا باعث ہوتا ہے‘ اور ایسا اصول یا احکام و مسائل کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کو اس تاریخ اور واقعات و حقائق سے گہرا تعلق ہے جو عمل کے تقاضوں سے منطقی طور سے منصۂ شہود پر آتے ہیں‘ اور اس کے اندر جو عملی مضمرات ہیں‘ ان کو واشگاف بیان کرتے اور نکھارتے ہیں۔ اسی طرح نبوت ایک ایسا افق ہے جہاں آسمان کی بلندیاں زمین کو گھیر لیتی ہیں اور زمین اپنی ارضیت کے باوجود آسمان سے چشمک کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اسلام کا یہی کمال تو دراصل داد کے قابل ہے کہ اس نے معرفت کے لیے تجسم (Incarnation) کو ضروری نہیں خیال کیا‘ بلکہ بشر کو بشر کی سطح پر رکھا ہے‘ اور زمین کو زمین ہی ٹھہرایا ہے۔ تاہم ان کو اتنا اچھال دیا ہے کہ دونوں فرق مراتب کے باوجود اپنی فطرت کی انتہائی بلندیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ فلسفہ و مذہب کا یہاں ایک اشکال (Problem) ہے‘ جس پر ہمیں سرسری نظر ڈالتے چلیے۔ وہ یہ ہے کہ خدا سے معرفت و شناسائی کا عملی تعلق بہرحال ایک شخص اور فرد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کتابیں اور صحیفے صرف اصولی حد تک اور نظریہ یا علمی مفروضے (Hypothesis) کی حد تک ہی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے ہیں۔ مگر اس وادی ایمن میں پہنچا دینا اور یہاں کی کیفیات و احوال سے دوچار کر دینا‘ یا اس مفروضۂ علمی کو عملی حقیقت کے قالب میں ڈھال دینا تو اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ذریعۂ معرفت و شناسائی کیا ہوا؟ عیسائیت کے نظریے سے اس لیے اتفاق ممکن نہیں کہ اگر تجسم کی صورت میں غلبہ اقنوم لاہوت کا زیادہ ہے تو انسان کے لیے پیروی و تتبع کی کون چیز ہوئی اور اگر ناسوت نمایاں ہے تو پھر اس میں اور نبوت میں کیا فرق رہا؟ پیروی تو گھوم پھر کر انسانی عمل ہی کی مرہون منت رہی‘ اور اسلام کا دعویٰ (Thesis) ہے کہ قلب و ذہن کو جھکانے کا واحد ذریعہ وہ بشر کامل ہے جو ہدایت آسمانی سے پوری طرح بہرہ مند ہو۔ کوئی دیوی دیوتا یا الفاظ و حروف کا مجموعہ و پیکر نہیں۔ اس کی مزید وضاحت آگے آئے گی۔ سردست ہمیں یہ

بتاتا ہے کہ اس تعلق کے پیش نظر قرآن ہی وہ کتاب ہو سکتی ہے جس پر ہدایت و رہنمائی کی اس صورت کو وضاحت سے بیان کیا جائے، جسے ہم نبوت و رسالت سے تعبیر کرتے ہیں، اور قرآن ہی وہ صحیفہ ہو سکتا ہے، جسے بہ یک وقت انسانی کمزوریوں کی اصلاح بھی کرنا ہے اور اس اسوۂ حسنہ اور نمونۂ خیر کی نشان دہی بھی کرنا ہے جس کی پیروی و اطاعت سے زندگی کی یہ کمزوریاں رفع ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن آنحضرتؐ کی سیرت پاک سے متعلق پہلا اور مستند ماخذ ہے تو اس میں ذرہ بھی مبالغہ آرائی کی جھلک نہیں پائی جاتی۔

* * *

## (۳)

# اسلام کے قبل کے مذاہب

موضوع کی تفصیلات میں جانے سے پہلے دائرہ نظر (Scope) کی وسعتوں کا اندازہ ہو جانا چاہیے اور یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ طرز استدلال کی نوعیتیں کیا ڈھنگ اختیار کریں گی تاکہ پہلے ہی قدم پر غلط فہمیوں کو ختم کر دیا جائے۔ قرآن اور کتب سیر میں جو اصولی فرق ہے، اس کی بنا پر ان دونوں نکتوں کی وضاحت اس سلسلے میں بنیادی مطالبہ ہے اور ایسا مطالبہ ہے کہ آئندہ بحث کی قدر و قیمت بڑی حد تک اسی کی تشریح پر مبنی ہے۔

ظاہر ہے، قرآن کے نقطہ نظر سے چہرۂ نبوت کی جھلکیاں اس انداز سے نہیں دکھائی جا سکتیں جس انداز سے یہ احادیث و سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں اور نہ اس کی رو سے مضمون کے تمام پھیلاؤ اور موضوع کی پوری پوری جزئیات کا احاطہ ہی ممکن ہے، اس لیے کہ دونوں کا مزاج، دونوں کے تحریری تقاضے اور ضرورتیں جدا جدا ہیں۔ یعنی جہاں سیرت، حضورؐ کی ذات گرامی کو بحث و نظر کا ہدف قرار دیتی ہے اور آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ سے تعرض کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس جامع الصفات شخصیت نے کس طرح کامیابی اور توازن کے ساتھ زندگی کی شاہراہوں پر قدم فرسائی کی، کن کن مشکلات کا مقابلہ کیا اور کس طرح تھوڑے ہی عرصے میں ایک مثالی معاشرہ قائم کر کے دکھا دیا، وہاں قرآن کا موضوع عام بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی ہے، کسی مخصوص دعوت کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔ اس کا کام زندگی کے اونچے نصب العینوں کی

نشان دہی کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ عقائد و افکار کے معاملے میں انسان نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے' نیز حکمت عملی کیا چاہتی ہے اور فلسفۂ کردار و سیرت کس نوع کے مخصوص اسلوب زیست کا طالب ہے۔

موضوع بحث کے اس تفاوت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ سیرت میں جو تفصیل ہے' اس کو بعینہ قرآن میں دیکھنا ناممکن ہے اور اس میں جو جزئیات اور واقعات کا استیعاب ہے اسے بجنسہ یہاں ڈھونڈنا عبث ہے۔ ٹھیک یہی حال انداز استدلال کا ہے۔ کتب سیرت اور احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعات و حقائق اپنی قدرتی شکل میں موجود ہیں اور وہ ساری چیزیں تاریخی اہمیت کے ساتھ اور تاریخی رنگ و روغن لیے ہوئے پائی جاتی ہیں جن سے کہ سیرت و سوانح کا حسین و جمیل مرقع تیار ہوتا ہے' مگر سیرت کے جن نقوش کو قرآن کی روشنی میں اجاگر کرنا مقصود ہے' ان کی نوعیت یہ نہیں۔ یہاں بجائے واقعات کی ایک خاص ترتیب کے اور حقائق کے ایک متعین نظام کے زیادہ تر استدلال (Inference) ہی سے کام لیا جائے گا۔ یہی نہیں' حقائق کے استخراج یا نتائج کی تعیین میں قریب قریب انہی اصولوں کو مدنظر رکھا جائے گا جو علماے اصول فقہ نے مقرر کیے ہیں۔ یعنی کہیں دلالتہ النص چلے گی' کہیں اشارۃ النص مفید ہوگی' کہیں سیاق و سباق سے مدد لی جائے گی اور کہیں ائمہ سیرت کے بجائے ائمۂ لغت و معانی کا مرہون منت ہونا پڑے گا۔

زیادت واضح تر پیرایہ بیان میں یوں کہیے کہ اگر آپ کی توقعات یہ ہیں کہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے بارے میں جملہ تفصیلات ملیں اور اسی انداز میں ملیں کہ جس انداز میں سیرت کی عام کتابوں میں ملتی ہیں' تو یہ غلط ہے' قرآن کا مزاج' ضرورت اور موضوع چوں کہ سوانحی نہیں' اس لیے یہ توقع بہرحال پوری ہونے والی نہیں۔ ہاں اس کے برعکس اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ بطور استدلال ہی کے سہی' اس میں نبوت کے ضروری اور بنیادی خدوخال کا ذکر ہو تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یقیناً اس میں ان تمام حقائق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و اہمیت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو' اگر اسی گلستان حکمت و معرفت میں اس نہال ثمرور کا وجود نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا' بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ قرآن نے قامت نبوت یا قامت یار کی رعنائیوں کو جس حسن و خوبی اور احتیاط و صحت (Preciseness) کے ساتھ بیان کیا ہے' یہ صرف اسی کا حصہ

ہے۔

تمہید کا یہ طول اگرچہ تحمل و ذوق کے حدود سے آگے نکلا جا رہا ہے، تاہم یہاں ایک اور نکتے کی وضاحت ہو ہی جانی چاہیے جو دراصل اسی بات کا تتمہ ہے کہ موضوع سیرت دو الگ الگ چیزوں کے مجموعے سے تعبیر ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے جو سراسر واقعات و حالات سے متعلق ہے۔ دوسرا پہلو یکسر متکلمانہ اور فلسفیانہ ہے جیسے حقیقت و مقام نبوت وغیرہ۔ پہلے حصے کی تفصیلات کے لیے بجز تاریخ و سیر اور احادیث صحیحہ کے اور کسی ماخذ کی طرف رجوع نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو حصہ متکلمانہ اور فلسفیانہ ہے، اس کی نزاکتیں اس بات کی مقتضی ہیں کہ اس کی چھان بین اور تعیین و تشریح کے لیے قرآن اور صرف قرآن ہی کو ماخذ ٹھہرایا جائے، کیوں کہ اس میں فکر و استدلال کی ذرا سی لغزش پر نہایت ہی سنگین اور حد درجہ قابل اعتراض نتائج مترتب ہو سکتے ہیں۔

## اسلام سے قبل کے مذاہب اور اسلامی دعوت

سیرت نبویؐ کی قرآنی تعبیر کے لیے ہمیں کن کن عنوانوں تک نظر و فکر کو محدود رکھنا چاہیے، اور ان کے ضمن میں کن کن تفصیلات کو معرض تفصیل میں لانا چاہیے؟ یہ ہے اصلی سوال۔ ہماری رائے میں مندرجہ ذیل ابواب میں اس موضوع کی وسعتوں کو سمیٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ اسلام سے پہلے کے دینی رجحانات کا جائزہ۔
۲۔ آنحضرتؐ کے بارے میں بنیادی اور ضروری تصریحات۔
۳۔ مقام نبوت اور آنحضرتؐ کی خصوصیات۔
۴۔ دعوت اسلامی اور اس کے فکری و عملی ممیزات۔
۵۔ نتائج۔

پہلی قوموں کے رجحانات سے ہماری مراد دنیا بھر کی قومیں نہیں، بلکہ قدرتاً وہی قومیں ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہے جیسے یہودی، عیسائی، صابئین اور مشرکین مکہ۔ ہماری رائے میں ان کے افکار و خیالات ایسی جامعیت لیے ہوئے ہیں کہ ان سے سبھی قوموں کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ یعنی جہاں تک مشرکانہ ذہن کا تعلق ہے، زمانی و مکانی اختلافات کے باوجود وہ ہر جگہ ایک ہی قسم کی کجروی کا حامل ہے، ایک ہی نوع کی گمراہی کا ترجمان ہے، اور ایک ہی انداز کی پستیوں کا شکار ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرک کہیں ہو، کسی دور میں ہو، ان کے سوچنے کا انداز اور سانچہ یا سطح باہم مختلف

نہیں ہے۔ اس لیے اگر مشرکین مکہ کے افکار و اعمال کا تجزیہ کر لیا جائے تو اس میں صنمیات (Mythology) کی تمام ممکن صورتیں آپ سے آپ آجائیں گی۔ یہی حال یہودیت اور عیسائیت کا ہے۔

مذہب کی ان دو شاخوں میں دراصل دو بنیادی اصولوں کی آویزش متعلق ہے۔ اس بنا پر ان کی تشریح و وضاحت سے ان تمام مذاہب کی خود بخود ترجمانی ہو جاتی ہے جو ان اصولوں پر مبنی ہیں۔

صابئیت فلسفہ و مذہب کی ایک ملی جلی صورت کا نام ہے۔ قرآن نے اس کا ذکر کر کے گویا فکر و عمل کی ان تمام گمراہیوں اور لغزشوں کو گھیر لیا ہے جو صفحات تاریخ پر ابھریں یا نظری اعتبار سے جن کا ابھرنا ممکن تھا۔

ان رجحانات پر تفصیلی گفتگو چھیڑنے سے پہلے اسلام کی موزونیت کی جی بھر کر داد دیجیے کہ یہ عین اس وقت آیا ہے اور عین اس وقت اس کی ضیا پاشیوں نے گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں کو اجالوں سے بدلا ہے، جب انسان فکر و عمل کے نقطہ نظر کے ہر اس تجربے سے دو چار ہو چکا تھا جو اللہ تعالیٰ سے دوری اور بعد کا باعث ہو سکتا ہے، جو جہل و نادانی کے اسباب کو بڑھا سکتا ہے اور جو فرد کی عقلی و تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دے سکتا ہے اور معاشرے میں خطرناک ابتری اور فساد پھیلانے کا باعث ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ کا آفتاب ہدایت ٹھیک مقام پر اور ٹھیک وقت پر طلوع ہوا ہے۔

* * *

# (۳)

# قوم یہود کی عادات و اطوار

## یہودی

نزول قرآن سے پہلے عرب میں جو قومیں آباد تھیں یہودی اپنی تاریخی روایات اور مخصوص عادات کی وجہ سے ان میں سرفہرست تھے۔ دنیا کی اس قدیم ترین اور ذہین ترین قوم کی بدنصیبی یہ ہے کہ اگرچہ ان میں انبیا کی ریل پیل رہی اور اول روز ہی سے انھیں مذہبی افکار ہی کی وجہ سے ابتلا و محن کا ہدف ٹھہرایا گیا، تاہم مذہب ہی ان میں نہیں رچا اور اپنے علم و فضل اور ذہن و فکر کی تابش کے باوجود یہ صحیح دینی روح اور ذوق ہی سے بے گانہ رہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ قوم بحیثیت مجموعی دین کے لطائف گہرائیوں اور معنویتوں سے ہمیشہ محروم رہی تو یہ ان کی نفسیات دینی کی ایسی تصویر ہوگی جسے جھٹلا دینا ممکن نہیں ـــــــ یہی نہیں بلکہ اس مختصر سے فقرے میں ان کی تاریخ کی تمام وسعتیں سمٹ آتی ہیں اور صدیوں کی بداعمالیاں نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آموجود ہوتی ہیں۔

خود بائبل کیا ہے؟ ان کی محرومیوں اور بدبختیوں کی مسلسل داستان! کتنے جلیل القدر مصلح ان میں پیدا ہوئے، کس کس انداز اور پہلو سے ان کو حقائق دینی سمجھانے کی کوشش کی گئی اور کیا کیا مواقع عبرت و نصیحت کے ان کے لیے پیدا کیے گئے، مگر انھیں نہ ماننا تھا نہ مانے اور الہام و وحی کی روشنی سے دل و دیدہ کو روشن نہ کرنا تھا نہ کرپائے۔ انھیں اگرچہ بار بار جھنجوڑا گیا، تاہم متنبہ

نہ ہوئے۔ بار بار سمجھایا گیا، تاہم مذہب ان کے حلق سے نیچے نہ اتر سکا اور انبیا کی تعلیم و حکمت ان کے ذوق دنیاپرستی پر غالب نہ آسکی۔

یہی وجہ ہے قرآن نے اس قوم کو گمراہوں کی صف میں نہیں رکھا، بلکہ ان قوموں کی صف میں شمار کیا ہے، جو مغضوب علیہم کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں۔

ان کی زندگی اور افکار و تصورات کے تفصیلی خدوخال کیا ہیں؟ اس پر تین طرح سے غور کیا جاسکتا ہے:

۱۔ خود بائبل کے نقطۂ نظر سے
۲۔ عیسائی مستشرقین کے زاویہ نگاہ سے.......... اور
۳۔ قرآن کی تصریحات کی روشنی میں۔

بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے بارے میں اس قوم کا ذہن ہرگز صاف نہیں۔ یعنی نہ تو اس کا کوئی وسیع تصور ان کے ذہن میں پایا جاتا ہے اور نہ اس سے متعلق ان کا نقطہ نظر ہی علمی اور حکیمانہ ہے۔ توحید کی اگرچہ بار بار تبلیغ کی گئی، مگر یہ عقیدہ بھی اپنی تنزیہات کے ساتھ ان کے ہاں مفقود ہے۔ یہی سبب ہے کہ محققین نے انھیں خداپرست تو قرار دیا ہے مگر موحد نہیں مانا۔ حضرت عزیر کی الوہیت ممکن ہے صرف عرب کے بعض قبائل تک محدود ہو اور اسے مقامی انحراف ہی سے تعبیر کیا جائے، لیکن اس حقیقت کو کیوں کر جھٹلایا جائے کہ عہد نامہ قدیم میں صاف ستھری توحید کی جھلک نظر نہیں آتی، بلکہ کہیں کہیں بت پرستانہ افکار کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہودی تصور اللہ کے بارے میں اتنی بات تو بہرحال مسلم ہے کہ وہ ان کا مخصوص قومی ہیرو (NAtional Hero) زیادہ ہے اور ہمہ گیر اور عالم گیر خدائی صفات سے متصف کم۔ اور یہ کہ "یہووا" میں تنزیہی عنصر کی افسوس ناک حد تک کمی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکیم فلو نے یہودی مابعد الطبیعات کو نوافلاطونیت کے سانچے میں ڈھالنے کی بہت کوششیں کی ہیں اور بشریاتی (Anthropoidal) عنصر کو بدل کر تنزیہی اور تجریدی عناصر کے روپ میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے، تاہم اس طرح کی متکلمانہ مساعی کو مسلمہ عقائد تو نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی حیثیت ایک تعبیر اور ترجمانی کی ہے، جسے نسبتاً جان دار، صحیح اور معقول کہہ لیجیے۔ مگر یہودی ذہن، یہودی فکر اور یہودی نفسیات تو گھوم پھر کر انھی تصریحات سے متاثر ہوں گی جو عہد

نامہ قدیم میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی عقیدے تو بہرحال نصوص ہی کے محور کے گرد گھومیں گے۔

موجودہ بائبل میں ایک حیرت انگیز خلا عقیدۂ آخرت کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں جتنے وعدے ہیں، جس قدر خوش خبریاں اور انعامات ہیں، وہ سب اس دنیا سے متعلق ہیں۔ حتیٰ کہ خدا کی بادشاہت کے قیام کا جو قدیم وعدہ چلا آرہا ہے، اس کے معنی بھی ان کے ہاں قومی کامیابی سے زیادہ کے نہیں، اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ یہودیوں کی دنیا طلبی اس درجہ شدید تھی کہ وہ عاجل کو چھوڑ کر آجل کو مان ہی نہیں سکتے تھے اور محسوس و مادی تعلقات سے اونچا اٹھ کر آگے کے کسی عالم اخروی کا تصور کر ہی نہیں سکتے تھے جو ان کے روحانی تقاضوں کی تکمیل کا موجب بن سکے۔ وہ تو ٹھیٹھ دنیا کے طالب تھے، جو انھیں دولت و ثروت سے مالا مال کر سکے، ان کے لیے عزت و جاہ کے مواقع پیدا کر سکے اور ان پر قومی و ملی کامرانیوں کے دروازے کھول سکے، اور بس۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا

(البقرہ: ۹۶)

ان کو تم اور لوگوں سے زندگی کے کہیں حریص دیکھو گے، یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی۔

عقائد کے بعد یہودی مسائل یا فقہ کے عجائب خصوصیت سے نظر و مطالعہ کے گوشوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان میں وہ پیچیدگی اور پھیلاؤ ہے، وہ سختی اور مشکلات ہیں کہ پورا کارخانہ ہی ٹھس ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک سبت کے بارے میں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو پر، مشتمل جو موشگافیاں ہیں ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے اور فقہائے یہود اگر ان میں ان تفصیلات کو بھی شامل کر لیں جو جدید تہذیب نے پیدا کی ہیں تو یہ تعداد اس سے کہیں بڑھ جائے۔ مثلاً پوچھا جا سکتا ہے کہ

۱۔ چیک پر دستخط کرنا "کام" کی تعریف میں داخل ہے یا نہیں؟
۲۔ کوک بھرنا یا گھڑی کا ٹائم درست کرنا کام ہے یا نہیں؟
۳۔ ریڈیو کھولنا اور چلانا، اس کے تحت آتا ہے یا نہیں؟
۴۔ سگریٹ پینا کام ہے یا نہیں؟

غرض یہ کہ ایک تو پہلے ہی یہودی فقہ غیر ضروری جزئیات کا گراں بار مجموعہ ہے، اس پر اگر اسی انداز سے غور کیا جائے، اور اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے تو یہ مجموعہ اور بھی زندگی کی روح

سے دور اور بے گانہ ہو جائے گا۔ قرآن حکیم نے اسی ذہنیت کو طوق و اغلال کی ذہنیت سے تعبیر کیا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (اعراف: ۱۵۷)

"اور یہ پیغمبران جکڑ بندیوں اور زنجیروں کو کاٹتا اور دور کرتا ہے جن کو انھوں نے زینت گلو کر رکھا تھا۔"

## عادت تحریف

عیسائی مستشرقین کے خوش سلیقہ ہاتھوں نے گزشتہ دو ڈھائی سو برس میں یہودیت کے بارے میں کن گراں قدر معلومات کو ترتیب دیا اور کن گہرہائے آب دار کو صفحات قرطاس پر بکھیرا اور سجایا ہے؟ اس کو جاننے کے لیے ایک مستقل فرصت تصنیف چاہیے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ انھوں نے مندرجہ ذیل نکات پر تحقیقی مہم کا ڈول ڈالا۔

۱۔ یہودی، عقائد و شعائر میں کن کن قوموں سے متاثر ہوئے۔
۲۔ قانون و شریعت کی ارتقائی منزلیں کیوں کر طے ہوئیں۔
۳۔ کیا بائبل مستند ہے؟ اور اگر مستند ہے تو
۴۔ استناد کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ لفظاً مستند یا معناً؟

ان گوشوں میں برسوں محنت و کاوش کے بعد ان کے نتائج کی تلخیص علی الترتیب یہ ہے۔

(ا) جہاں تک یہودی عقائد و شعائر کا تعلق ہے، بلاشبہ اس میں دوسری قوموں کے افکار و رسوم کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نظریۂ توحید کا خالص نہ ہونا اس دعوے کی واضح اور کھلی ہوئی دلیل ہے۔ سوختنی قربانی کی تفصیلات اور روح بھی دوسروں سے مستعار معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح صومعہ (Synagrgul) کے اندر جن عوامد و رسوم کو مختلف تقریبات پر ادا کیا جاتا ہے اور جن جن چیزوں کو مذہبی شعار (Rituals) کی حیثیت سے اختیار کیا جاتا ہے، یہ سب معاصر بت پرست اقوام کی نقالی پر مبنی ہیں، کیوں کہ ان میں وہ سادگی، وہ اختصار اور وہ تنزیہ ہرگز پائی نہیں جاتی جو انبیا کی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہے اس کی وجہ غالباً یہودیوں کی یہ مجبوری ہے کہ یہ جب یروشلم

سے نکلے تو ہمیشہ بت پرست اقوام ہی میں گھرے رہے اور باوجود اپنی ذہانت و محنت اور بے شمار دوسری صلاحیتوں کے کہیں بھی بااثر حیثیت حاصل نہ کر سکے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ باوجود تعصب قومی کے ان کو اپنی ان معاصر اقوام کے ساتھ گھل مل کر رہنا پڑا‘ اور انہی کے تہذیبی و ثقافتی ورثے میں چار و ناچار شریک ہونا پڑا۔ مستشرقین نے اس کے ثبوت میں عہد نامہ قدیم کے متعدد شواہد پیش کیے ہیں‘ جن سے ان کے مطالعہ و تفحص کی وسعتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ ان کے دعاوی کی بنیاد بائبل کی تصریحات پر ہے‘ محض مستشرقانہ اپج پر نہیں۔

(۲)۔ قانون و شریعت نے ان کے ہاں کیوں کر اکمال و اتمام کی منزلوں کی طرف قدم بڑھائے؟ اس کے جواب میں مستشرقین نے جو اہم قدم اٹھایا‘ اسے ایک ہی لفظ تنقید عالیہ (Higher Criticism) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ کسی مذہب کے داخلی شواہد سے اس کی ارتقائی شکلوں کا کھوج لگایا جائے اور بتایا جائے کہ اس میں کن کن افکار و تصورات کو کب کب اثر و رسوخ کے مواقع ملے؟ یا کسی قوم کی مذہبی زندگی میں کن کن عناصر اور عوامل نے تشکیل و ترتیب حیات کا فرض ادا کیا۔

ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر بڑا خطرناک ہے۔ مستشرقین نے اس سلسلے میں یہ بتایا ہے کہ یہودی فقہ اور یہودی قانون کوئی مکمل ضابطہ حیات نہیں جو ایک ہی مرتبہ اترا یا نازل ہوا ہو‘ بلکہ اس میں بتدریج ارتقا ہوا ہے اور اس میں ان تمام اقوام کے افکار و تصورات کی جھلک پائی جاتی ہے جن میں یہ رہے۔ خصوصیت سے حمورابی ضابطہ قوانین کے اثرات اس پر نمایاں ہیں اور ان تہذیبی اثرات کی چھاپ بھی صاف طور پر معلوم ہوتی ہے جو عراق کی سرزمین نظریہ آفرین نے وقتاً فوقتاً پیدا کیے۔

ہم ان کی اس تنقید عالیہ کی روح سے بہرحال متفق نہیں ہو سکتے‘ کیوں کہ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یکسر مادی اور غیر ہمدردانہ ہے۔ مغرب کے علما و محققین‘ مذہب کے بارے میں ہمیشہ اس ہمہ گیر غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ وہ کوئی آسمانی چیز نہیں‘ بلکہ نتیجہ ہے حالات کا‘ گردوپیش کے طبعی تقاضوں کا اور ان عوامل کا‘ جن کو انسانی معاشرہ جنم دیتا ہے۔ نقطہ نگاہ کی اس غلطی نے انہیں اکثر الجھا دیا ہے اور ایسے نتائج اخذ کرنے پر مجبور کیا ہے کہ ہمارے لیے جن سے متفق ہونا آسان نہیں۔ تاہم اس حقیقت کو ماننا ہی پڑے گا کہ اسباب چاہے کچھ ہوں‘ یہ واقعہ ہے کہ یہودی

قانون، یہودی عقائد کی طرح تغیر و تحریف کا بہرحال ہدف بنا ہے۔

(۳)۔ اس نکتے پر مستشرقین نے جس محنت و کاوش، جس دقیقہ رسی اور ذمہ داری و نکتہ سنجی کا ثبوت دیا ہے اور نتیجۃً جن بیش قیمت افکار کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے، اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یہی اہل علم کا وہ طائفہ ہے، جس نے سب سے پہلے بائبل کے دو حصوں میں خط امتیاز کھینچا اور بتایا کہ ایک حصہ تو وہ ہے، جو قدما میں رائج اور مقبول رہا۔ یہ روایاتی (Traditional) بائبل ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جو صرف خواص تک محدود رہا۔ یہ اپاکریفل (Apocryfil) کہلاتا ہے۔ جس کے معنے پنہاں اور مستور حصے کے ہیں۔ پھر انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ یہ بھی بتایا کہ جیروم کے عبرانی متن اور موجودہ یونانی متن میں بین اور ناقابل توجیہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ان کے ذوق تحقیق نے اس سے بھی آگے تک کی جزئیات کا جائزہ لیا اور پہلی دفعہ اس حقیقت کی نشان دہی کی کہ ایک ایک صحیفہ اور ایک ایک کتاب میں ردوبدل کی کرشمہ سازیوں کی جھلک ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے مثلاً موسیٰ کے اسفار خمسہ (Pentatouch) پر نظر ڈالی اور اس کے بارے سے اپنے نتائج تحقیق کو شائع کیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ تحقیق کسی ایک آدمی اور ایک ہی دور کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کا پھیلاؤ دو ڈھائی سو سال کی متفرق علمی کوششوں پر مشتمل ہے جو ایک ہی جہت اور ایک ہی موضوع پر مرکوز ہیں۔ سب سے پہلے جس سوال نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ ان اسفار کا مرتب یا مصنف کوئی ایک ہی شخص ہے؟ یا زبان اور طرز ادا کا اختلاف اور واقعات و حکایات کا تناقض دریادو سے زیادہ مرتب شخصیتوں کا پتا دیتا ہے؟

۱۶۷۸ء میں ایک فرانسیسی فاضل سائمن نے بائبل کی کریٹکل ہسٹری لکھ کر یہودی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے ثابت کیا کہ اسفار خمسہ میں طرز ادا، افکار اور واقعات کا اختلاف اس نوعیت کا ہے کہ ایک سے زائد مصنفین کا ماننا ناگزیر ہے۔ اس کے نزدیک اس کے بغیر لسانی اور واقعاتی اختلاف کی کوئی علمی توجیہہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

۱۷۵۳ء میں جین آسٹروُ نے جو ایک رومن کیتھولک محقق تھے، اس حقیقت کی پردہ کشائی کی کہ ان کتابوں میں قطعی طور پر دو مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک رجحان وہ ہے جس کو "یہووا" کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور دوسرا وہ جو "الوہیم" کے نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ ان

دونوں میں کیا باریک اختلافات ہیں اور ان دو رجحانات نے کن مختلف فیہ نکات کی تخلیق کی؟ آسٹرو نے اس بات کو بھی اچھی طرح واضح کیا ہے۔

۱۷۸۰ء میں ایکھارن نے جرمنی میں اس انداز تحقیق کو اور آگے بڑھایا اور نہایت ہی علمی اور متین اسلوب تحقیق سے اسفار خمسہ میں جو جو ردوبدل ہوا ہے اس کو نکھارنے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی صدی میں اسکندر گیڈس ایک سکاچ محقق نے اسفار خمسہ کے علاوہ "خروج" پر بھی تنقید کی اور ثابت کیا کہ اس میں ایک ذوق اور ایک ہی مصنف کی جولانی طبع کار فرما نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نقشے میں مختلف لوگوں نے رنگ بھرا ہے۔

۱۸۰۲ء میں ویٹر ایک جرمن فاضل نے بھی انہی خطوط پر داد تحقیق دی اور انہی نتائج سے اظہار اتفاق کیا۔ پھر کیوتین اور ولہاسن وغیرہ نے تو گویا اس موضوع کو مصرع طرح سمجھ کر اٹھا لیا اور اس پر پوری غزل کہہ ڈالی۔

انیسویں صدی ختم نہیں ہوئی تھی کہ قریب قریب تمام اہل علم نے تحقیق و تفحص کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ یہ عہد نامہ قدیم جو سامی انبیا کی طرف منسوب ہے، ہرگز الہامی وقار و احترام کا مستحق نہیں۔ بلکہ اسے یہودی قوم کے اخلاق ارتقا کی ایک داستان سمجھنا چاہیے، اور بس۔ جس پر تنقید ہو سکتی ہے، اعتراض ہو سکتا ہے، یہی نہیں، جس کے بعض حصص کو غیر مستند قرار دیا جا سکتا ہے۔

جب عہد نامہ قدیم کی تاریخی والہامی حیثیت یہ ہو تو ظاہر ہے اسے لفظاً حجت نہیں مانا جا سکتا۔ بلکہ اگر اسے کوئی درجہ استناد حاصل ہے، تو وہ معنوی، متصوفانہ اور روحانی نوعیت کا ہے، لفظی (Literal) ہرگز نہیں۔ اس حقیقت میں نکتہ نمبر ۴ کا جواب بھی مضمر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ادھر دو ڈھائی سو برس پہلے تک یہودیوں کے بارے میں مستشرقین جس حقیقت انیقہ کا کھوج لگاتے رہے وہ وہی تو ہے جس کی چودہ سو سال پہلے ایک امی نے قرآن کی زبان میں یوں خبر دی ہے۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ (مائدہ: ۴۱)

باتوں کو ان کے مقامات میں ثابت ہونے کے بعد بدل دیتے ہیں۔

## میثاق

قرآن حکیم نے یہودیوں کو کس نظر سے دیکھا ہے اور ان کے کردار و سیرت کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے؟ اس حقیقت کو جاننے کے لیے ان کی فہرست جرائم کو اصولی اور فروعی دو خانوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ اصولی اور بنیادی گناہ ان کا یہ تھا کہ انھوں نے کبھی بھی مذہب کی روح کو جاننے اور اعمال میں سمونے کی کوشش نہیں کی، کبھی بھی دین کی سچی تڑپ سے بہرہ مند ہونے کی سعی نہیں کی اور اپنی طویل عملی زندگی میں کبھی بھی اس بات کا ثبوت بہم پہنچانے کا قصد نہیں کیا کہ ان میں دین سے، دین کے تقاضوں سے، اللہ سے اور اس کے انبیا سے ادنیٰ لگاؤ بھی پایا جاتا ہے۔

"میثاق" (Covenant) یا عہد، بائبل کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ اسی کی مناسبت سے بائبل کا نام عہد نامہ قدیم ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخششوں نے اس قوم کو بارہا مختلف انبیا و رسل کے ذریعے یقین دلایا کہ اگر انھوں نے توحید کے تقاضوں کو سمجھا، انبیا کی پیروی اختیار کی، نماز پڑھی، زکوٰۃ دی، اعمال کو نیکی اور سعادت کے قالب میں ڈھالا اور بحیثیت مجموعی دین ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا قرار دیا تو جس دنیا کے حصول میں یہ بے قرار ہیں، وہ انھیں دی جائے گی اور جن مادی اور دنیاوی راحتوں کے لیے یہ بے چین ہیں، ان سب سے ان کو حصہ وافر ملے گا۔

اس میثاق کو بار بار دہرایا گیا اور یہودی بظاہر اس پر نازاں اور مغرور بھی رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے بارے میں عہد کر رکھا ہے۔ تاہم خود اس میثاق کا جہاں تک تعلق ہے کبھی بھی انھوں نے اس کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور کبھی بھی ان کی ہاں یہ حقیقت یقین کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکی کہ دین کی پیروی کے صلے میں بہرحال دنیا کے تکلفات اور آسائشیں حاصل ہوتی ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کے نقض عہد و میثاق کا متعدد جگہ ذکر فرمایا ہے اور اس طرح گویا ان کو ان کے بے یقینی پر شرم اور غیرت دلائی ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ۔ (نساء: ۱۵۵)

(تو ان کے عہد توڑ دینے اور خدا کی آیتوں سے کفر کرنے اور انبیا کو ناحق مار ڈالنے اور یہ کہنے کے سبب کہ ہمارے دلوں پر پردہ ہے۔)

(عسکری)

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (المائدہ: ۱۳)

(تو ان لوگوں کے عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے ان پر لعنت کی۔ اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔)

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہ عہد و میثاق یہودیوں ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ تمام بنی نوع انسان سے متعلق ہے۔ ہر وہ قوم جو خدا کے بتائے ہوئے جادۂ مستقیم پر چلے گی، زندگی کے اصولوں اور پیمانوں کو اختیار کرے گی، برائیوں سے بچے گی، اور حسنات کو اپنا شیوہ و عادت ٹھہرائے گی، کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومے گی۔ یہ تو مذہب ہے، تم فطرت کی دوسری فیض رسانیوں کو دیکھو۔ ان میں کہیں بھی کوئی اختصاص، استثنا یا قدغن نظر آتی ہے؟ آفتاب جہاں تاب کی روشنی اور حرارت سے ہر وہ شے استفادہ کر سکے گی جو اس کا سامنا کرے گی۔ ہوا کی جاں بخشیاں ہر اس متنفس میں جان ڈال دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں گی جو اپنا منہ اور حلق کھلا رکھے گا۔ اسی طرح پانی کے فیوض کے آگے کس نے بند باندھا ہے؟ اور اس کو جاں آفرینی اور جان طرازی سے کس نے روکا ہے؟ بالکل یہی حال اصول حیات کے مقابلے میں قوموں کا ہے۔ اس میں شرق و غرب، کالے گورے، اور اگلوں اور پچھلوں کا کوئی فرق نہیں۔ جو قوم بھی تاریخ کے کسی دور میں اس چشمہ حیواں سے پیاس بجھائے گی، حیات جاوید کی لامحالہ مستحق ٹھہرے گی۔ یعنی اللہ کا یہ عہد آج بھی قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

یہودیوں کی بدنصیبی دراصل یہ تھی کہ انھوں نے فخر و غرور کی حد تک تو اس اقرار و عہد سے اپنا تعلق قائم رکھا اور ہمیشہ اپنے کو ایک چیدہ (Elite People) قوم کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش بھی کیا، لیکن جہاں تک اس کی عملی ذمہ داریوں کا تعلق ہے اسے نبھانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ عقائد میں یہی وہ تضاد تھا جس نے ان کی تمام زندگی کو مضحکہ خیز بنا دیا اور ان کی روزمرہ کی مذہبیت میں بھی یہی مضحکہ خیزی تھی جس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان پر طنز کیا کہ تم مچھر کو تو چھانتے ہو، مگر اونٹ کو سموچا نگل جاتے ہو۔ برتن کو اوپر سے خوب دھوتے ہو اور مانجھتے ہو، مگر برتن کے اندر جو اکل حرام کا سامان مہیا ہے، اس کی طرف تمہاری نظریں ذرا دیر کے لیے بھی ملتفت نہیں ہو پاتیں۔

ان کی فروعی زندگی میں اس تضاد اور بے یقینی نے کیا کیا گل کھلا رکھے تھے، قرآن نے اس پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو صرف اس حد تک مانتے تھے جس حد تک ان کی خواہشات نفس کی تکمیل ہوتی۔

يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ط

(مائدہ: ۴۱)

لوگوں سے کہتے، اگر تم کو یہی حکم ملے تو اسے قبول کر لینا اور اگر یہ نہ ملے تو اس سے احتراز کرنا۔

حقائق دینی کا مذاق اڑانے میں انھیں بالکل تامل نہ ہوتا۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدہ: ۶۴)

اور یہودی کہتے اللہ کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے۔

رشوت اور سود کا مال بے دریغ کھاتے اور اسے اپنی مصنوعی دین داری کے منافی نہ سمجھتے۔

اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدہ: ۴۲)

اور رشوت کا مال بے تحاشہ کھانے والے۔

عام طور پر جھوٹ بولتے اور جاسوسی کی نیت سے خصوصیت سے جھوٹ وضع بھی کرتے تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور بددلی پھیلے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (المائدہ: ۴۲)

جھوٹی باتیں پھیلانے کے لیے جاسوسی کرنے والے۔

لطف یہ کہ ان تمام بداعمالیوں کے باوجود یہ سمجھتے کہ ہمیں کسی بازپرس کا سامنا نہیں کرنا ہے اور عذاب و غضب الٰہی کا مورد و مستحق نہیں ٹھہرنا ہے، بلکہ اگر جہنم کی آگ سے دوچار بھی کئے گئے تو بس چند روز۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (آل عمران: ۲۴)

آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو ہی نہیں سکتی۔

یہودیوں کی فہرست جرائم طویل ہوتی جا رہی ہے۔ دو لفظوں میں اس کے مذہبی انحطاط کے بارے میں یوں سمجھیے کہ یہ کسی قوم کی تاریخ میں وہ مقام ہے، جہاں مذہب کی افادیت ختم ہو جاتی ہے، جہاں اس کی فیض رسانیوں کا سلسلہ رک جاتا ہے اور جہاں اس سے بجز خسارے اور نقصان کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، جہاں کوئی قوم لطائف دینی سے یکسر محروم ہو جاتی ہے، جہاں دین کے نام پر اس کے پاس بجز قشر کے کچھ نہیں رہتا، جہاں چند جزئیات اور رسوم پر زور دیا جاتا ہے۔ مگر اصول، فرائض اور روح نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، جہاں دین محض ایک تہمت کی حیثیت سے باقی رہ جاتا ہے اور اس میں جو برکتیں، سعادتیں اور محرکات ہیں وہ ختم اور فنا ہو جاتے ہیں۔

مذہب سے متعلق یہ اصولی بات ہمیشہ یہودی ذہن میں پنہاں رہی کہ وہ ایک کلیّت (Totality) سے تعبیر ہے، جس کے کچھ عقائد، عبادات اور معاشرتی تقاضے ہیں اور ان کی تکمیل بحیثیت مجموعی ضروری ہے۔ یہی نہیں، جب تک اس کی کلیّت کو باقی رکھا جاتا ہے، اس کے متعلق جو خوش خبریاں اور وعدے ہیں، وہ قطعی پورے ہوں گے۔ لیکن اس کی کلیّت کو ختم کر دینے کی صورت میں ان کا نہ صرف پورا ہونا ضروری نہیں، بلکہ الٹے یہ سزا و عقوبت کا باعث و سبب ہو سکتے ہیں۔

* * *

## (۴)

# عیسائی اور خطا و نسیان کی بحث

### عیسائیت

دوسری دینی تحریک جس نے عربی ذہن و فکر کو نزول قرآن سے پہلے متاثر کر رکھا تھا' عیسائیت تھی۔ اس سے پیشتر کہ اس کے مالہ و ماعلیہ پر گفتگو کا سلسلہ چھڑے اور نقد و تبصرے کے پیمانے حرکت میں آئیں' ہمیں اجازت دیجیے کہ پہلے حضرت مسیح کو خراج عقیدت پیش کرنے کا افتخار حاصل کیا جائے اور چند لفظوں میں ان کی تعلیم کی روح اور ماحصل بیان کر دیا جائے' عیسائیت اور محسفی عیسائیت (Christianity Dosmatic) کے بارے میں کچھ کہا جائے' اس حقیقت کو بہرحال ماننا پڑے گا کہ مسیح کی شخصیت بجائے خود بہت پیاری ہے۔ ان میں اچھا خاصہ سحر (Charam) ہے' جاذبیت اور کشش ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام میں اگر قانون' ضبط و نظم' اور شریعت و مدنیت کا جمال جلوہ گر ہے تو حضرت مسیح کی زندگی میں جمال معنوی کی جھلکیاں موجزن ہیں۔ ان کا شمار ان انبیا میں ہوتا ہے' جنھوں نے روح اور باطن پر خصوصیت سے زور دیا ہے' جنھوں نے شریعت و قانون کے تقاضوں کے پہلو بہ پہلو امراض قلب کا دقت نظر سے جائزہ لیا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے خصوصیت سے لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔ تصوف و فلسفے کی اسی چاشنی نے جو ان کے انداز بیان کا طرۂ امتیاز ہے' ان کی تعلیمات کو ادبی شاہ پاروں میں بدل دیا ہے۔

افسوس ہے کہ اتنی اونچی تعلیم کو عیسائیوں نے مسخ کر ڈالا اور اس کو یکسر محسفات

(Doemas) کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا۔ خوشی کی بات ہے کہ مغرب کے اہل فکر اس چکر سے نکل رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عیسائیت کو چاروں انجیلوں اور سینٹ پال کی تعلیمات سے مستنبط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور یہ نعرہ بہت مقبول ہو رہا ہے کہ اصلی اور سچی عیسائیت کا سرچشمہ انجیلیں نہیں، حضرت مسیح کی ذات، ان کا انداز فکر و زیست ہے اور انسانیت کے بارے میں وہ آفاقی تصورات ہیں جن کو مسیح نے پیش کیا۔ یہ تبدیلی بڑی ہی صحت مند اور قابل قدر ہے۔

## اناجیل کے عدم استناد کی تین وجہیں

انجیلیں کیوں عیسائیت کا ماخذ قرار نہیں پا سکیں۔؟ اس کی تین بنیادی وجہیں ہیں

(ا) انجیل نگاروں میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے براہ راست مسیح کو دیکھا ہو اور ان کی صحبت و فیض سے استفادہ کیا ہو۔

مرقس، مثلاً پہلا انجیل نگار ہے۔ اس نے مسیح کے ۴۵ برس بعد کہیں جا کر اسے مرتب کیا۔ وہ بھی کہاں؟ مشرق کی اس سرزمین میں نہیں، جہاں مسیح نے زندگی بسر کی، جہاں کی فضاؤں میں انجیل کی شمیم انگیزیاں رچی بسیں، جہاں کا دینی و روایتی پس منظر موافق و ہم آہنگ ہو سکتا تھا، جہاں انجیل کی روح کو حقیقتاً سمجھا جا سکتا تھا، بلکہ مغرب میں مرتب کیا، یعنی روم کے کسی شہر میں۔

دوسری انجیل متی کی ہے۔ متی نے زیادہ تر مرقس ہی پر بھروسا کیا ہے اور اسی کے مرویات کو جزوی اختلافات کے ساتھ دہرایا ہے۔

تیسرا انجیل نگار لوقا ہے۔ یہ سینٹ پال کا رفیق کار مشنری اور ساتھی ہے۔ لوقا کے انداز بیان کی سادگی اور معقولیت کے مستشرقین بہت مداح ہیں۔ لیکن اس کا مرتبۂ استناد اس لیے اور بھی کم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف اس کا شمار بھی ان لوگوں میں نہیں ہوتا جنھوں نے مسیحی تعلیمات کو خود مسیح کی زبان فیض ترجمان سے سنا، بلکہ اس کی معلومات کا ماخذ زیادہ تر اس سے پہلے کے انجیل نگار ہیں اور خصوصیت سے سینٹ پال کی رفاقت تو ایسی چیز ہے جو معاملے کے مزاج کو اور بھی مشکوک بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ یہ وہی شخص تو ہے جس پر عیسائیت کو مسخ کرنے کی تمام تر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ پہلے کٹر یہودی تھا۔ پھر اس میں اچانک اور یکایک یہودیت کے خلاف ایک شدید رد عمل (Reaction) پیدا ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے نہ صرف یہودیت اور اس کی سختیوں

کو چھوڑا بلکہ قانون و شریعت کے ان بنیادی اور ضروری تقاضوں سے بھی متنفر ہو گیا، جنھیں تعمیر معاشرہ کی پہلی اینٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کیوں عیسائی ہوا؟ اس کا ایک سبب تو وہ ہے جو اس نے خود ہی بیان کیا، کہ مسیح کی روح نے اس پر پوری طرح قابو پا لیا اور یہ ستم اس ظریفی سے دو چار ہوا کہ جس کا یہ جانی دشمن تھا، وہی اس کی روشنی اور حیات نو کا موجب بنا۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں جتنا کہ بظاہر سمجھا جاتا ہے۔ محل اشتباہ یہ بات ہے کہ کہیں اس روپ میں یہودیت کی وہی پرانی سازشی اور تخریبی روح کار فرما نہ ہو جو مذاہب و ادیان کو بگاڑنے میں ہمیشہ بے قرار رہی ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے، یہ چوں کہ دوسری صدی عیسویں کے اوائل میں معرض تحریر میں آئی ہے، اس لیے منطقی طور پر استناد کے امکانات اس میں اور بھی کم اور مدھم ہو گئے ہیں۔

(۲) ان اناجیل میں مسیح کی تعلیمات کی اصلی روح اس لیے اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ محفوظ نہیں رہ پائی اور اس بنا پر انھیں قابل اعتماد ماخذ نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ جس مذہبی اور تاریخی پس منظر میں ان کی تدوین ہوئی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے اثرات ان میں پائے جائیں۔ چنانچہ خود عیسائی مستشرقین نے ان اثرات کی بے لاگ نشان دہی کی ہے اور کہا ہے کہ اناجیل میں نجوم، کہانت اور جنات کے بارے میں غیر سائنٹیفک افکار اسی تاریخی و مذہبی پس منظر کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ ناشکری ہو گی اگر ان علمی کاوش کی انھیں داد نہ دی جائے اور اس جرأت پر انھیں مبارک باد کا مستحق نہ سمجھا جائے۔

یہ تاریخی و دینی پس منظر کیا تھا؟ جس نے اناجیل اربعہ کی روح اور مغز کو بدل کر رکھ دیا؟ اس کی تفصیلات کے لیے رومن تاریخ، یہودی اثرات اور ان نیم ترقی یافتہ مذاہب و خیالات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس زمانے میں رائج تھے۔

(۳) بہت بڑا اور آخری اشکال جو انجیلوں سے متعلق اہل فکر کے حلقے میں دائر و سائر ہے، وہ اناجیل ثلاثہ کے اشکال (Synoptic Problem) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عیسائیوں میں اناجیل اربعہ کے بارے میں معروف عقیدہ یہی ہے کہ یہ الہام و وحی سے لکھی گئی ہیں۔ مگر پہلی تین انجیلوں کے مشمولات یا مضامین میں جو حیرت انگیز توافق پایا جاتا ہے، اس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور تو اور، آیات امثال اور واقعات تک میں یکسانی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جب تینوں نے الگ الگ تاثرات کے ماتحت انجیلیں لکھیں

اور تین مختلف زمانوں میں لکھیں۔ پھر تینوں کی ذہنی ساخت اور تاثر پذیری کی کیفیتیں بھی جدا جدا ہیں تو یہ یکسانی اور تکرار کیوں ہے؟ اور اس توافق کے کیا اسباب ہیں جو جملوں، فقروں سے لے کر واقعات کی ترتیب تک پھیلا ہوا ہے؟

جواب میں دو مفروضے پیش کیے جاتے ہیں۔ یا تو ان تینوں کا ماخذ کوئی اور نوشتہ ہے جس کا انھوں نے ذکر نہیں کیا، اور جس کے بارے میں نقاد پوری طرح آگاہ نہیں۔ اور پھر ان تینوں نے اپنی تحریرات میں نقل و اقتباس سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں مفروضے ایسے ہیں، جن سے نہ صرف اناجیل کا الہامی ہونے کا عقیدہ مجروح ہوتا ہے بلکہ ان کی تاریخیت بھی پایۂ استناد سے گر جاتی ہے۔ یہ اشکال انیسویں صدی کے بعد ذہنوں میں ابھرا ہے اور اب تک کوئی تسلی بخش حل اس کا نظر نہیں آیا۔

ایک اور وجہ بھی اناجیل کو غیر مستند ٹھہرانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ حضرت مسیح ذہنی طور پر اور کردار و سیرت کے اعتبار سے جس درجہ اونچے، صوفی مزاج اور بلند افکار پیغمبر ہیں، انھیں سننے والے اور ماحول ایسا نہیں ملا جو ان کے پیغام کی لطافتوں اور بلندیوں کو کماحقہ علم و ادراک کی گرفت میں لا سکے۔

اناجیل کی عدم استناد کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہرگز نہیں کہ یہ بالکل ہی جعلی ہیں اور ان میں حق و صداقت کی کوئی مقدار بھی پائی نہیں جاتی۔ ان کے غیر مستند ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ ان کو الہام و وحی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یا یہ کہ علمی سطح پر ان کو وحی و الہام کا نتیجہ قرار دینے کے لیے شواہد و دلائل کا افسوس ناک حد تک فقدان ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی حیثیت تاریخ (History) کی ہے۔ تاریخ بھی ایسی جس کی صحت کو جانچنے کے لیے کوئی قطعی کسوٹی اور معیار موجود نہیں۔۔ اس میں شبہ نہیں کہ متفرق طور پر بہت سی صحیح باتیں بھی ان میں سمٹ آئی ہیں اور کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مسیح علیہ السلام کے فکر لطیف اور درویشی و تصوف سے ہم براہ راست دو چار اور استفادہ کناں ہیں۔ لب و لہجے میں وہی سادگی، وہی گہرائی اور عذوبت اور مٹھاس پائی جاتی ہے جو ان کی تعلیمات کی جان ہے۔ اور اس کا یہ حصہ آج بھی قابل قدر اور لائق اطاعت ہے۔

## مسیحی تعسفات

عیسائیت کے بارے میں گفتگو نامکمل رہے گی اگر ہم اس کے تعسفات (Dobmsas) پر ایک نظر نہ ڈال لیں۔ تعسف جس لفظ کا ترجمہ ہے، یہ ایک یونانی اصطلاح ہے، جس کے معنی رائے، عقیدہ اور دینیات کے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس کا استعمال ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس سے مراد عام طور پر کلیسا کے وہ عقائد و رسوم اور شعائر ہوتے ہیں جن کی بنیاد صرف مشن یا سند پر ہو، عقل و تجربے سے اس کی تائید نہ ہو سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح تر الفاظ میں یوں کہیے کہ یہ ایسے عقائد سے تعبیر ہے جو غیر منطقی اور غیر سائنسی ہوں۔

عیسائیوں کے ہاں یہ دینیات کی ایک خاص قسم ہے جو کیتھلک یا کاتھولکی فرقے میں زیادہ مقبول ہے۔ تین چیزیں خصوصیت سے اس کے ضمن میں شمار ہونے کے لائق ہیں:

۱۔ جبلی اثم (Original Sin)

۲۔ تثلیث (Trinity) اور

۳۔ اعتراف (Cohnfession)

جبلی اثم کے معنی ان کے ہاں یہ ہیں کہ انسان فطری طور پر گناہ گار ہے اور کسی صورت میں بھی گناہ و معصیت کی گرفت و پاداش سے بچ نکلنا ممکن نہیں۔ جبلی یا فطری طور پر انسان کیوں گناہ گار ہے؟ اس کی وجہ آدم و حوا کے روایتی قصے میں تلاش کی جاتی ہے۔ عیسائیت کے نقطۂ نگاہ سے حضرت آدم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کی معصیت کی اور منع کرنے کے باوجود وہ چیز کھائی جو انھیں نہیں کھانا چاہیے تھی، تو اب یہ حکم عدولی اولاد آدم میں کچھ اس طرح بطریق توارث رچ بس گئی ہے، اور فطرت انسانی کا جز بن گئی ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا اس کے بس کا روگ نہیں رہا۔ چنانچہ اب اسے اور بڑھ کر گناہ کا ارتکاب کرنا ہے، خدا کے حکموں کی مخالفت کرنا ہے اور پاداش گناہ سے دوچار ہونا ہے۔

لیکن کیا اس صورت حالات کو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برداشت کر سکتی ہے؟ اور اس کی محبت و تودد بے پایاں گوارا کر سکتی ہے کہ اسؔ کے بندے گناہ و معصیت میں پڑے رہیں اور قلب و روح کو اس کی نافرمانیوں سے آلودہ کرتے رہیں؟ یا پاداش و سزا کی محرومیوں سے دوچار

رہیں؟ نہیں۔۔۔۔۔! اس کی رحمت و محبت نے اس کا مداوا یوں کیا ہے کہ گناہ و معصیت کی اس سزا کو خود برداشت کرلیا ہے اور بنی آدم کو اس حقیقی سزا اور زحمت سے بچالیا ہے جو نتیجۃً عائد ہونے والی تھی۔

اس کی صورت یوں فرض کی جاتی ہے کہ اس نے سلسلۂ انبیا کے بجائے اپنا اکلوتا بیٹا بھیجا تاکہ وہ صلیب پر موت کی سختیاں جھیلے اور اس طرح اپنی جان عزیز کو تکلیف میں ڈال کر اور موت وہلاکت کی اذیتوں کو انگیز کرکے بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ ہو۔

مختصراً یہ ہے وہ فلسفہ جسے فطری گناہ یا جبلی اثم کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے بطور تمہید کے پیش کیا جاتا ہے، اور پھر کوشش کی جاتی ہے کہ اس غیر منطقی عقیدے کی تائید میں فلسفہ و منطق کے ایسے شواہد اور دلائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے جائیں کہ جن پر خود عقل و خرد کے تقاضے انگشت بدنداں ہو کر رہ جائیں۔۔۔۔۔ دلائل کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے:

۱۔ انسان میں شر یا بدی کا عنصر زیادہ قوی، زیادہ موثر اور زور دار ہے۔۔۔۔۔۔ نیکی کا عنصر اس کے مقابلے میں کہیں کمزور اور ناتواں ہے۔

۲۔ جسم جو بدی کی طرف دعوت دیتا ہے، محسوس اور نظر و بصر کے حدود میں آنے والا ہے، لیکن روح جو نیکی پر ابھار سکتی ہے، مستور اور مخفی ہے۔ لہٰذا اس کے اثرات بھی نسبتاً کمزور اور ضعیف ہیں۔

۳۔ عقل انسانی سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ برائیوں سے علی الاطلاق روکے گی اور نیکیوں پر آمادہ کرے گی، مگر اس کی کمزوری ملاحظہ ہو کہ بے چاری خود حیلہ جو نفس کی ترغیبات کا شکار ہوجاتی ہے اور اس طرح حق کا نمائندہ و مبلغ ہونے کے بجائے شر و فساد کی حامی و وکیل بن جاتی ہے۔

۴۔ خود یہ عالم، یہ ماحول اور یہ معاشرہ جس میں کہ انسان کو ڈال دیا گیا ہے اور مجبور کردیا گیا ہے کہ ایک وقت خاص تک اس میں رہے، کب اس لائق ہے کہ کوئی شخص اس سے تعلق پیدا کرکے شر و فساد سے دامن بچا سکے اور نفس کو معصیت و گناہ کے حضیض سے نکال کر اونچا اٹھا سکے۔

یہ بے شمار بحث آرائیوں کا نچوڑ ہے اور چند گنی چنی دلیلیں ہیں جو ہم نے بطور نمونے کے

بیان کر دیں تاکہ عیسائی فلسفے کی بے مائیگی کا آپ ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکیں۔ ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ یا تو انہی کا ماحصل ہے اور یا پھر انہی پر متفرع ہے۔ آیئے اس تعسف کا منطقی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس میں حق و صداقت کی مقدار کتنی ہے؟ اور سفسطہ و مغالطہ (Falacy) کا عنصر کس درجہ ہے؟

## قصہ آدم۔ پہلا گناہ یا پہلی نیکی

سب سے پہلے اصولاً ہمیں قصہ آدم و حوا سے تعرض کرنا چاہیے۔ اس میں بنیادی چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ کیا حضرت آدم کی لغزش ایک گناہ گار کی لغزش ہے جس کی نیت میں برائی ہے؟ جس کی تہہ میں گھٹیا پن ہے؟ یا جس کا محرک شر و فساد کا ادنیٰ جذبہ ہے، یا یہ ایسی لغزش ہے، جس کا محرک خیر ہے؟

اگر حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت اختیار کو استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے تقاضائے علم سے مجبور ہو کر مزید علم کے لیے تجربہ و مشاہدہ کے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم و امر کا منشا و محل کیا ہے؟ تو یہ کوشش اپنے مزاج، اپنی فطرت اور عزم و حوصلے کی نیرنگی کے اعتبار سے بجائے پہلی برائی کے، پہلی نیکی کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔

لغزش کا پہلو صرف یہ ہے کہ حضرت آدم سے مطالبہ تو ٹھیٹھ لفظی اطاعت کا تھا لیکن انھوں نے اس میں اجتہاد سے کام لیا۔ حالاں کہ موقع و محل اسکا مقتضی نہ تھا۔ گویا غرض وغایت بہرحال نیک تھی احسن تھی، اور ارادہ و عقل کے استعمال کے عین مطابق تھی۔

چوک یا سہو کا حصہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ بے جا اجتہاد و رائے کے پیمانوں کو آزمانے کی سعی کی گئی۔

یہ واقعہ کی ایک تعبیر ہے۔ اسے ایک دوسرے انداز سے سوچئے۔

اگر آدم علیہ السلام اپنی قوت ارادی کو استعمال نہ کرتے، علم کی ٹٹول اور جستجو کے لیے وہ جرات آزما قدم نہ اٹھاتے جسے تم گناہ سے تعبیر کرتے ہو، یا اپنے عمل سے تجربہ و مشاہدہ کی یہ گراں قیمت ادا نہ کرتے، اور اس ارض خاکی کو اپنی تگ و دو کا میدان نہ قرار دیتے تو کیا اولاد آدم علیہ السلام میں راز جوئی کے یہ جذبات ابھرتے؟ علم و حکمت کی صلاحیتیں بیدار ہوتیں؟ اور یہ زمین جو اس وقت تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے، کبھی رونق اور گہما گہمی کا مرکز حسین بن سکتی؟ زندگی کی یہ تمام شادابیاں، فکر کی یہ ساری بلندیاں اور

تجربہ و مشاہدہ کی سب تحیر زائیاں اس ایک لغزش اجتہاد کا نتیجہ ہیں، جسے متعسفی عیسائیت نے خواہ مخواہ بھیانک گناہ کا روپ دے رکھا ہے۔

اس پر کوئی من چلا اگر کہہ بیٹھے تو اس کا کیا جواب ان کے پاس ہے کہ جناب! یہ حسین دنیا اور یہ دلکش عالم "گناہ کا نتیجہ کیوں کر ہے؟ جس میں انسان کو اپنی انفرادیت اجاگر کرنے کا پورا پورا موقع ملتا ہے، جس میں اس کی عظمت کے علم گاڑے جاتے ہیں، اور اس کی رفعت کے پھریرے لہرائے جاتے ہیں، جہاں صحیح معنوں میں اس کے ممکنات دروں اور مضمرات فطرت بر روئے کار آتے ہیں۔ نہیں! نہیں!! جہاں یہ اختیار و ارادے کے صحیح استعمال سے درحقیقت خلافت الٰہی کے استحقاق کو ثابت کرتا ہے۔

اگر گناہ و معصیت کے صلے میں اولاد آدم کو اس درجہ انعامات سے نوازا جاتا ہے اور اس طرح کی نوازشہائے گوناگوں سے بہرہ مند کیا جاتا ہے، اگر انسان کی یہ بے نظیر فکری صلاحیتیں، اس کی یہ حیرت ناک بیداری، اس کا یہ کوہ وقار و عزم و حوصلہ اور اس کی یہ ذوق تمدن آفرینی و صناعی، سب براہ راست شر ہی کا انجام ہے تو یہ شر اس خیر سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا تصور عیسائی آبا کے ذہن میں ہے۔

قصہ آدم کو ہم انسانیت کے ارتقا کا پہلا قدم تصور کرتے ہیں اور ہبوط آدم کو معراج آدم کی بنیادی تمہید سمجھتے ہیں، جس کو تم گناہ کہتے ہو، وہ گناہ نہیں، ایک لغزش ہے، جو تکوینی چوکھٹے میں زندگی سے تعبیر ہے، تجربہ و مشاہدہ سے ہم آہنگ ہے، اور ایک ایسا اقدام ہے جو آئندہ انسانی ترقی کے لیے، استحقاق خلافت کے لیے اور منصب انسانیت کی بلندیوں کے لیے نہایت ضروری تھا۔ یہ قدم اٹھنا چاہیے تھا، ورنہ آج انسان ذہن و فکر کے اعتبار سے بالکل مفلس ہوتا۔

## ایک دلچسپ سوال

آدم و حوا کے سلسلے میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جبلی اثم یا فطری گناہ کے عقیدے کی بنیاد اس پر رکھی بھی جا سکتی ہے یا نہیں، جب کہ خود عیسائی محققین کے نزدیک اس قصے کی صحت ہی محل نظر ہے۔ ڈرائیور (Driver) نے کتاب تکوین (Genesis) کی مکمل اور نہایت نفیس شرح لکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس میں جس انداز سے تخلیق کائنات کی تشریح کی گئی ہے اور جس نہج سے آدم و حوا اور اس کی اولاد و احفاد کا تذکرہ آیا ہے، اس کا یہ تقاضا ہے کہ

اسکے پیرایہ بیان سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ یعنی اس قصے کے پردے میں بتانا یہ مقصود ہے کہ عبرانی ذہن شروع شروع میں سلسلہ کائنات سے متعلق کن خیالات و افکار سے متاثر تھا، تخلیق کائنات کی علمی اور سائنٹیفک توجیہہ بیان کرنا کتاب کے مقاصد میں شامل نہیں۔

ڈرائیور کے نزدیک بائبل کے الہامی ہونے کے معنی یہ نہیں۔ کہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک پیراگراف الہام و وحی کی خصوصیات کا حامل ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس میں چند ابدی حقائق کی ترجمانی کی گئی ہے۔ الہامی کتاب کا یہ تصور کہ اس کے مشمولات کا ایک ایک گوشہ صحیح ہے، اس کی تائید ان کے نقطہ خیال سے نہ تو بائبل کے اندرونی شواہد سے ہوتی ہے اور نہ الہام کے عقلی مفہوم سے۔۔۔!

عہد نامہ قدیم کے موجودہ شارحین کو اس کی حجیت و استناد سے متعلق اس معذرت کی ضرورت خصوصیت سے اس لیے محسوس ہوئی کہ علم ارضیات (Geology) سے ان تفصیلات کی تائید نہیں ہو پاتی جو پیدائش زمین سے متعلق کتاب تکوین میں مذکور ہیں۔ اسی طرح علم بشریات (Antaropoloy) کے ماہرین کہتے ہیں کہ حضرت انسان کروڑوں برس سے اس دنیا میں رونق افروز ہے اور اس کی تگ و تاز کی وسعتیں مرتبین بائبل کے اس انداز سے کہیں بڑھ کر ہیں، جس کی نشان دہی آدم و حوا کے قصے میں کی گئی ہے۔

یہ تعبیریا معذرت اگر صحیح ہے اور آدم و حوا کی تفصیلات فی الواقع مستشرقین اور موجودہ شارحین کے نقطہ نظر سے تاریخی اہمیت سے محروم ہیں تو اس عقیدے کی سند کے لحاظ سے کوئی قدرومنزلت باقی نہیں رہتی۔

## عقلی دلائل کا تجزیہ

رہے عقلی دلائل، تو ان پر ہمارا پہلا اور بنیادی اعتراض یہ ہے کہ کیا عقائد کبھی سند سے بے نیاز ہوئے ہیں؟ اور کیا عقلی اندازہ و تخمین پر کسی نے عقائد کی مضبوط و مستحکم عمارتیں کھڑی کی ہیں؟

عقائد کو ہمیشہ سند سے مستنبط ہونا چاہیے۔ کیوں کہ عقل و فکر کے کمزور سہاروں پر تو انھیں زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ عقل و ادراک کے دھارے ہمیشہ اپنا رخ بدلتے رہتے ہیں اور فکر و خیال کی دنیا نت نئی وسعتوں کو اپناتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سمتیں، اس کے حدود اور منزلیں کبھی بھی قید تعیین کو گوارا نہیں کرتیں۔ اس لیے جو عقائد اس

پر مبنی ہوں گے' انھیں ہر آن ایک تغیر اور تبدیلی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

پھر کیا یہ حضرات عقائد کے بارے میں اس لچک کو ماننے پر آمادہ ہیں؟

مشکل یہ ہے کہ یہ دلائل بھی کچھ ایسے نہیں جن میں محکمیت اور استواری کی جھلک پائی جائے۔ اس کے برعکس ایک طرح کی سطحیت اور جذباتیت ان میں نمایاں ہے' جسے کسی درجے میں بھی عقلیت کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً پہلے اسی دلیل کو لیجیے کہ انسان میں خیر سے زیادہ شر کے دواعی پائے جاتے ہیں۔ اس کی ترکیب و ساخت میں نیکی سے کہیں زیادہ گناہ و معصیت کے عناصر کی رعایت رکھی گئی ہے۔

## اسباب خیر و شر کی تشریح

سوال یہ ہے کہ دواعی خیر اور عناصر گناہ و معصیت سے کیا مراد ہے؟ کیا ان سے مقصود وہ جذبات و عواطف اور وہ طبعی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں' جنھیں ارادہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے؟ یا خود ارادے کی وہ دوگونہ فطرت ہے جس کی بنا پر نیکی یا برائی کو یہ اختیار کرتا ہے؟

یہ دو بالکل الگ الگ سوال ہیں اور دو بالکل مختلف نئے نکتے ہیں' جن پر غور ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انھی کے ٹھیک تجزیے اور جوب پر اس عقیدے کی صحت و عدم صحت موقوف ہے۔ عیسائی متکلمین نے متفقہ طور پر اس سلسلے میں سب سے بڑی غلطی یہی کی ہے کہ ان دونوں کا تجزیہ نہیں کیا اور دونوں پر علیحدہ علیحدہ غور نہیں کیا۔ کیوں۔ ؟ اس لیے نہیں کہ وہ تجزیے کے فن سے ناواقف تھے' یا تجزیہ و تحلیل کی منطقی اہمیت سے ناآشنا تھے' بلکہ اس لیے کہ مجرد اس تجزیے ہی سے وہ پیچ نکھر کر نظر و بصر کے سامنے آجاتا ہے جو اس طرز استدلال میں پنہاں ہے۔

## دواعی خیر و شر میں فرق حقیقت کا نہیں' استعمال کا ہے

بات یہ ہے کہ جو قوتیں یا صلاحیتیں ایک برائی پر ابھارتی یا آمادہ کرتی ہیں' بعینہٖ وہی نیکی یا خیر پر انسان کو مائل کرتی ہیں۔ مثلاً جو قوت غصہ و غضب پر برانگیختہ کرتی ہے' اسی کی ایک سلجھی ہوئی صورت وہ ہے' جسے ہم غیرت و حمیت سے تعبیر کرتے ہیں یا بہادری و شجاعت سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے اخلاق کے ان دونوں نمونوں میں اختلاف استعمال کا ہے' حقیقت کا نہیں۔

یہی حال جذبہ جنس کا ہے، جس کی مذمت و تحقیر پر ساری کلیسائی دنیا متفق اللسان ہے۔ مگر کیا اس کے بھی دو بالکل ہی مختلف استعمال نہیں پائے جاتے؟ اسی کا ایک اظہار اگر زنا و فواحش کی فہرست میں شمار ہوتا ہے تو کیا یہ واقعہ نہیں کہ اسی کے دوسرے اظہار پر کائنات کی یہ ساری گہما گہمی قائم ہے، اور اس پر نہ صرف نوع انسانی کی افزائش و ترقی کا دارومدار ہے، بلکہ فکر و ذہن اور کردار و سیرت کی ساری بلندیاں بھی استوار ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ صلاحیتیں اور یہ طبعی قوتیں اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے نہ اخلاقی (Moral) ہیں اور نہ غیر اخلاقی (Immoral) بلکہ یہ صرف قوتیں ہیں، جنھیں نیکی اور برائی دونوں طرح کے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، اور اگر وجود، عدم وجود سے بہتر ہے، اور قوت، عدم قوت سے برتر ہے تو ہم کہیں گے کہ ان کا وجود ایک لحاظ سے بجائے خود نیکی بھی ہے۔

## ارادے کی تعریف

دوسرا سوال ارادے سے متعلق ہے۔ اگر قوت و صلاحیت پر برائی کا اطلاق نہیں ہوتا، تو ارادے کو بھی اس سلسلے میں متہم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ ارادے کی منطقی تعریف کیا ہے؟ یہی نا کہ ارادہ عقل و ادراک کے ایسے موڑ سے تعبیر ہے جہاں یہ قوت کے خانے سے نکل کر فعل کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، جہاں خوب و ناخوب کا فرق اس درجہ نمایاں ہو جاتا ہے، جہاں خوب و ناخوب کا فرق اس درجہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کو بہرحال چننا ہی پڑتا ہے۔ گویا ارادے میں اخلاقیت یا خیر و شر کا تصور اس وقت ابھرتا ہے، جب یہ تعقل کے حدود سے نکل کر فعل کے دائرے میں قدم دھرتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔ اس سے پہلے وہ صرف قوت ہے۔ جس کا وجود انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وجود و ضرورت کے نقطہ نگاہ سے ہم اسے بھی خیر ہی کہیں گے۔

مسئلے کی اس تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ فطری گناہ سے متعلق یہ استدلال حد درجہ بودا اور غیر منطقی مقدمات پر مبنی ہے کہ انسان میں دواعی خیر کم ہیں؟ اور دواعی شر زیادہ!

علاوہ ازیں غور طلب یہ سوال ہے کہ کیا عیسائی متکلمین کے ذہن میں زندگی کا کوئی ایسا نقشہ موجود ہے، جس میں خیر و شر کے دوگونہ احتمالات پائے نہ جائیں؟ یا کردار و سیرت کا کوئی ایسا امتزاج ممکن ہے جس میں زندگی کے ولولے تو ہوں، لیکن اوارے کی کار فرمائیاں نہ ہوں؟ یعنی کیا موجودہ انسان سے بہتر انسان کا کوئی تصور دل و دماغ میں ابھرتا ہے!؟

جس میں زندگی بھی ہو، زندگی کی قوتیں اور صلاحیتیں بھی ہوں، ارادے بھی ہو اور اس کے اختیارات بھی ہوں، لیکن زندگی کی رنگا رنگی، تلون اور بو قلمونی نہ ہو؟

دوسری دلیل یہ ہے کہ جہاں جسم کے تقاضے شدید ہیں، وہاں روح کی لطافتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ یعنی حرص و آز میں جو زور و قوت ہے وہ عقل و فرزانگی میں نہیں، اور ادنیٰ درجے کے جذبات و خواہشات میں جس قدر غلبہ و استیلا ہے، ادراک و تعقل کی کارفرمائیوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ مزید برآں ان دونوں میں پرلے درجے کا تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں روح آسمان تک اڑنا چاہتی ہے اور اخلاق و کردار کی انتہائی بلندیوں پر آشیانہ بنانے اور رہنے کا داعیہ رکھتی ہے، وہاں جسم و قالب کی کثافتیں زمین ہی کو اپنا مستقر و مرکز ٹھہرانے پر مجبور ہیں۔ اور اس کشاکش اور تضاد کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ عقل و روح اگر دس قدم آگے بڑھتی ہے تو جسم اور اس کے تقاضے اس کو بیس قدم پیچھے ہٹا دیتے ہیں اور اگر عقل و ادراک کی تیز رفتاری اس سے آگے بڑھنے میں کامیابی حاصل بھی کر لے، تب بھی جسم و قالب کی مزاحمتوں اور رکاوٹوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان حالات میں کامل نیکی اور خیر محض کا تصور کیوں کر ممکن ہے؟ اور کیوں کر توقع کی جا سکتی ہے کہ انسان کبھی بھی تقویٰ و پاکیزگی کی اعلیٰ قدروں سے بہرہ مند ہو سکے گا اور اس مشن کو پورا کر سکے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو سونپا گیا ہے۔

## اصولی غلطی

اس دلیل اور ان تمام دلائل میں جو فطری اثم کے سلسلے میں پیش کیے جاتے ہیں ایک اصولی غلطی یہ ہے کہ عیسائی متکلمین نے زندگی کے نصب العین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور انسانی شرف و اعزاز کا صحیح صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اسی طرح اس کائنات پر اس نقطہ نظر سے غور نہیں کیا کہ ایک حوصلہ مند اور ترقی پذیر معاشرہ اس میں کیا کیا تغیرات پیدا کر سکتا ہے اور کس طرح اس کی ناہمواریوں کو اپنے لیے سازگار ٹھہرا سکتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے ایک ‘ناکام’ اپاہج

مفلوج انسان کے زاویہ نگاہ سے اس پر نظر ڈالی۔ اور جب اس کی رکاوٹوں اور مزاحمتوں کو ناقابل عبور پایا تو بجائے اپنی اصلاح کے فطرت انسانی ہی کو مفلوج اور ناکارہ سمجھ لیا۔

سوال یہ ہے کہ روح کے تقاضوں میں اگر شدت نہیں تو کیوں؟ کیا اس لیے کہ روح میں فطرت و تخلیق کی کمزوریاں ہیں یا اس لیے کہ اس کی قوتوں کو بڑھانے کی کوئی اجتماعی کوشش ہی نہیں کی گئی؟

دراصل عیسائیوں کے سامنے زندگی کا صرف انفرادی نقشہ ہی ہے، جس میں ایک انسان صرف اپنی صواب دید ہی کے بل پر جدوجہد کرتا ہے اور بغیر مناسب تربیت، مناسب ماحول اور مناسب شرائط کے اس کارزارِ حیات میں حصہ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں گمراہی اور ضلالت کے امکانات زیادہ ہیں۔ لیکن اگر تعلیم سے ذہنوں کو صیقل کر لیا جائے، تربیت سے عادات کو سنوار لیا جائے اور اجتماعی زندگی کو ایسے قالب میں ڈھال لیا جائے کہ لغزش و معصیت کے امکانات گھٹ جائیں اور ایسی شرائط کے ساتھ مشروط و مقید کر دیا جائے کہ جن کے ہوتے ہوئے فرد کی زیادتیوں کی روک تھام ہو سکے تو اس صورت میں روح کی طاقت بڑھ جاتی ہے، کردار و سیرت کا معیار اونچا ہو جاتا ہے اور شر و معصیت کے دائرے سمٹاؤ اختیار کر لیتے ہیں۔

## کیا روح و جسم میں تضاد پایا جاتا ہے؟

یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ روح و جسم میں حقیقتاً کوئی تضاد پایا جاتا ہے، یا ان میں واقعی دوئی اور ثنویت کار فرما ہے۔ روح و جسم مل کر ایک وحدت ہیں اور ان میں جو اختلاف ہے وہ بعینہ اسی نوعیت کا ہے جو کسی مرکب اور اس کے اجزائے ترکیبی میں پایا جاتا ہے۔ بنابریں یوں کہنا چاہیے کہ ان میں تضاد و تنافر کے بجائے کمال درجے کی ہم آہنگی، ائتلاف اور سازگاری رونما ہے۔ اور کیوں نہ ہو، اشرف المخلوقات انسان کی تخلیق کہیں بے جوڑ اور انمل عناصر کے امتزاج کی رہین منت ہو سکتی ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ صوفیا نے اپنی تحریروں میں نفس انسانی کی دو مستقل سطحوں کو مانا ہے۔ ایک کو وہ اپنی اصطلاح میں اونچی قرار دیتے ہیں اور دوسری کو ادنیٰ اور اسفل۔ تمام اچھے کام اور خیر و خوبی کے مظاہر نفس کی سطح اعلیٰ سے متعلق ہیں اور تمام گھٹیا خواہشات کا مدار و محور ادنیٰ سطح ہے۔ کبھی ان دو سطحوں کے فرق کو سمجھانے کے لیے متصوفانہ لٹریچر میں روح و جسم، یا من اور تن

کے الفاظ بھی آتے ہیں، اور ان کے الگ الگ تقاضوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لیکن اس سے مقصود روح و جسم کے تضاد یا ثنویت کو ظاہر کرنا نہیں ہوتا بلکہ عقل و ادراک ہی کی ادنیٰ و اعلیٰ سطحوں کے ممیزات کو واضح کرنا مطلوب ہوتا ہے۔!

یہاں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس پیرایہ بیان کے باوجود صوفیا اس بات کے قائل ہیں کہ عقل و ادراک کے اعلیٰ تقاضے، ادنیٰ تقاضوں پر غلبہ و استیلا حاصل کر سکتے ہیں اور انسان اعلیٰ درجے کی روحانی منزلیں طے کرنے پر قادر ہے۔ بلکہ تصوف کا تو نصب العین ہی یہ ہے کہ انسان خواہشات کے تنگ حصار سے نکل کر علم و معرفت کے کشادہ اور وسیع میدانوں میں داخل ہو اور ایسی زندگی بسر کرے، جس میں نفس و روح کو نشاط انگیزیوں کا پورا پورا موقع ملے۔ عیسائی متکلمین نے اس سلسلے میں پہلی غلطی یہ کی ہے کہ نفس اعلیٰ اور نفس ادنیٰ کی تقسیم کو اصلی و حقیقی سمجھ لیا ہے اور دوسری غلطی یہ کی ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے مقابلے میں بلاوجہ زیادہ قوی اور زیادہ برتر مان لیا ہے۔

## کیا خیر محض کا حصول ممکن ہے؟

انسانی نصب العین کی تعیین میں بھی عیسائیت نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کے سامنے زندگی کے دو ہی جانے بوجھے نقشے ہیں۔ یا تو اس دنیا میں یہ گناہوں سے مغلوب ہے، اور یا پھر خدا کی بادشاہت میں خیر محض سے بہرہ اندوز ہے۔ بیچ کی راہ کو اس نے نظرانداز کر دیا ہے حالاں کہ وہی صحیح راہ ہے۔ کیوں کہ شاعری سے قطع نظر جہاں تک حقائق کا تعلق ہے، انسانی زندگی کا نصب العین خیر محض کا حصول نہیں، خیر اغلب کا حصول ہے۔ یعنی بحیثیت مجموعی ایسی زندگی بسر کرنا اس کے دائرہ اختیار میں شامل ہے، جو صحت مند اقدار پر مبنی ہو، اور جس میں فکر و خیال کی ترقی کی پوری گنجائش پائی جائے۔

زندگی کے بارے میں خیر محض کا تصور عملاً بے معنی ہے۔

انسان کلیتہ خطا و لغزش سے اسی وقت دامن بچا سکتا ہے جب زندگی کی رفتار ساکن ہو جائے، جب عمل و کردار کی جنبشیں ختم ہو جائیں، جب حیات انسانی کے رواں دواں قافلے تھم جائیں اور انسان کے جذبہ عمل و سعی پر موت اپنی ابدی مہر ثبت کر دے۔ ورنہ جب تک زندگی کی رمق موجود ہے، اور انسان اختیار و ارادے کی قوتوں سے بہرہ مند ہے، اس سے اچھے کاموں کے ساتھ ساتھ لغزشیں اور معصیتیں بھی

سرزد ہوں گی۔ کوشش صرف یہ ہونا چاہیے۔ کہ نیکیوں کا پلڑا بھاری رہے اور عزم و حوصلے کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے رہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ معصیت و لغزش کے امکانات انسان کی روحانی ترقی میں حائل نہیں ہو سکیں گے۔

خیر محض کے متعلق سمجھ لینے کی بات یہ ہے کہ یہ مجہول جذبے سے تعبیر نہیں، زندگی کی نفی کا نام نہیں، بلکہ فعالیت اور حرکت کا دوسرا نام ہے۔ ایسی فعالیت اور حرکت جو بھرپور ہو، مکمل ہو اور خطا و لغزش کے ہر امکان سے پاک ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ ایسے مکمل انسان کا تصور کر سکیں، جس کی ذہنی و فکری قوتیں پوری طرح بالیدہ ہوں ایسے سازگار ماحول کو فرض کر سکیں جس میں کوئی چیز بھی رکاوٹ پیدا کرنے والی نہ ہو۔ مزید برآں جب منزل اور راستوں کا پہلے سے پورا پورا اندازہ ہو۔۔۔ ایسی صورت حال اگر پیدا ہو جائے تو البتہ خیر محض کا تصور ممکن ہے۔ مگر اس کے لیے کس کس کھکھیڑ کا سامنا کرنا ہوگا، کیا یہ آپ جانتے ہیں؟ اس کے لیے نہ صرف ذہن انسانی کی موجودہ مشینری کو یکسر بدلنا ہوگا، بلکہ نظام عالم کے نظم و نسق اور مزاج و فطرت میں بھی تغیرات پیدا کرنا ہوں گے۔

## تیسری دلیل کا منطقی تجزیہ۔۔۔ کیا عقل فطرتاً کمزور ہے؟

تیسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل انسانی جس سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ ترغیبات کے مقابلے میں ایک مبلغ حق کا فرض ادا کرے گی، خود ترغیبات کا شکار ہو جاتی ہے اور بجائے اصلاح کے الٹا ان کے لیے دلائل و حیل تراشنا شروع کر دیتی ہے۔ بلاشبہ عقل کی کمزوری و درماندگی کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ لیکن اس میں ایک بل ہے، جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عقل سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ ایسا جوہر ہے جس کی قوتوں کو بڑھایا نہیں جا سکتا، جس کی طاقت اور اثر اندازی کے دائروں کو وسیع نہیں کیا جا سکتا اور جو فطرتاً جذبات کے مقابلے میں کمزور اور بے بس ہے؟ یا یہ ایسی شے ہے جو بڑھ سکتی ہے، ترقی کر سکتی ہے اور جس کی قوت و طاقت میں بے اندازہ اضافہ ممکن ہے۔

اگر عقل و ادراک کی طاقتیں ہمیشہ جذبات کے مقابلے میں سپر ڈال دینے والی ہوتیں تو پھر دعوت و ارشاد کی تاریخ میں کردار و سیرت کے یہ عظیم پیکر کیوں کر ابھرتے، جنھیں ہم انبیا و رسل کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی دینی تحریکیں کس طرح کامیاب ہوتیں جنھوں نے

مختلف زمانوں میں ہدایت اور کامیابی کی راہ دکھائی اور انسان بحیثیت مجموعی تہذیب میں، تمدن میں اور علوم و فنون میں یہ معجزات کیوں کر دکھاتا، جس پر آج اس کو ناز ہے۔ کیا یہ ساری چیزیں، یہ ساری کامیابیاں ایسی نہیں جو عقل و ادراک کی قوت و تابش پر دال ہوں اور جن سے اس کی وسعتوں، اور اثر اندازیوں کا اندازہ ہو سکے۔ کیوں کہ اگر عقل ہمیشہ مغلوب ہی رہتی، تو انسان ادنیٰ حیوانی زندگی کی سطح سے کبھی بھی اونچا نہ اٹھ سکتا اور کبھی بھی اس لائق نہ ہوتا کہ تہذیب و مذہب کے فرازوں کو چھو سکے۔

## کیا عقل و جذبات میں دوئی پائی جاتی ہے؟

اور پھر جذبات و ترغیبات کی مذمت کس نے کی ہے؟ اور ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کس نے کیا ہے؟ کیا جذبات و ترغیبات میں عقل و ادراک کی آمیزش نہیں ہوتی اور کیا جذبات و ترغیبات ہی کی مدد سے عقل میں فعل و تخلیق کی قوتیں نہیں پیدا ہوتیں؟ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور بجائے دوئی کے یہ کہنا چاہیے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مناسب تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو بہترین سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عقل جذبے ہی کی مدد سے تو ایک فعال اور خلاق عنصر کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ اور جذبہ عقل ہی کے بل پر تو عشق کا وہ مقام بلند حاصل کرتا ہے، جہاں تنہا خرد کبھی بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ ساری خرابی دراصل ان کی تفریق اور علیحدگی میں ہے۔ عقل مجرد، جس کے ساتھ جذبہ یا خواہش کی وابستگی نہ پائی جائے، حد درجہ خطرناک ہے، اور خالص جذبہ جو عقل و خرد کی رہنمائی سے محروم ہو سخت گمراہ کن ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے عقل و خرد کی علی الاطلاق مذمت کی ہے اور اس کے ضعف و واماندگی کا رونا رویا ہے، ہمارے نزدیک توہین انسانیت کے مرتکب اور شرف انسانیت کے منکر ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اس عنصر لطیف کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کی ہے، جس پر تمام انسانی لطائف و ترقیات کی بنیاد ہے، بلکہ اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر دیا ہے، کہ اگر عقل و خرد ایسی ہی بودی اور کمزور شے ہے تو پھر اس کے بعد انسانیت کی اصلاح و ترقی کے لیے کیا پیغام رہ جاتا ہے جو پہنچایا جائے؟ اور ایسے لوگ انسان کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ نیز ان کی دعوت اور سچائی پر کیا دلیل پیش کی جا سکتے [illegible] پیغام یا دعوت کو حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ کھلا ہوا

تضاد نہیں کہ عقل کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں، مگر پیمانہ، مخالفت وہی عقل۔ سوال یہ ہے کہ اس سے اس کا ضعف ثابت ہوتا ہے یا قوت و برتری؟

## عیسائی متکلمین کی معذوری:

عیسائی متکلمین کو ہم اس بنا پر اس معاملے میں معذور سمجھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک ناقص اور بے راہ رو معاشرہ ہے، جس میں نہ تو عقل و خرد کے تقاضے واضح ہیں، نہ کوئی صحت مند قومی تصور پایا جاتا ہے اور نہ مذہبی و دینی اقدار کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا اہتمام ہی ہے۔ ایسے ماحول میں ایک فرد اگر رہے گا تو ظاہر ہے کہ اپنے ذاتی مفادات اور ذاتی خواہشات کے سوا اور کوئی نصب العین اس میں عمل و حرکت کے دواعی کو بیدار نہیں کر سکے گا، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ جس جس مسئلے پر بھی غور کرے گا، اس میں اپنی ذات ہی کو مقدم ٹھہرائے گا اور اسی کے نقطۂ نظر سے زندگی کا پورا نقشہ مرتب کرے گا۔

ایسے حالات میں ترغیبات و خواہشات کا عقل کی کمزوریوں پر غلبہ پالینا قطعی قرین قیاس ہے۔

اب فرض کرو، اس کے مقابلے میں ایسا معاشرہ ہے، جس کی ایک متعین منزل ہے، جو انصاف و عدل کی اعلیٰ قدروں پر مبنی ہے، جو روحانی و اخلاقی اقدار پر ایمان رکھتا ہے، علاوہ ازیں جس کی زندگی کی تشکیل عملاً ایسے انداز سے کی گئی ہے، اور ایسے بنیادی تغیرات اس میں روا رکھے گئے ہیں کہ خود غرضی کے امکانات کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، بلکہ جس میں ہر ہر شخص ذاتی خواہشات سے قطع نظر اجتماعی مقاصد اور اعلیٰ اقدار کی طرف رواں دواں ہے، ایسا معاشرہ اگر پیدا ہو جائے تو اس میں ترغیبات کا دامن بڑی حد تک سمٹاؤ اختیار کر لے گا اور شر یا برائی کے امکانات کہیں کم ہو جائیں گے۔

## انسان کا اصلی اشکال:

عیسائیت کو اپنا نقطۂ نظر بدلنا چاہیے۔ انسان کے سامنے بنیادی سوال یہ نہیں کہ عقل و خرد کس درجہ کمزور اور ناتواں ہے، بلکہ بنیادی سوال یہ ہے کہ عقل و خرد کو کیوں کر اس درجے اس اعتماد اور اس رہنمائی کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے، جس کی کہ وہ فطری طور پر سزاوار ہے۔ اسی طرح مسئلہ یہ نہیں کہ انسان کے گرد و پیش رنگا رنگ کی ترغیبات کا جو حسین جال بچھا ہوا ہے، اس سے

ہم مخلصی حاصل نہیں کر سکتے، لہذا تھک ہار کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ کیوں کر زندگی کے پورے نقشے میں ایسی تبدیلیاں پیدا کی جائیں کہ جن کی بدولت شر و فساد کے امکانات کم سے کم تر ہو جائیں اور انسان کو موقع ملے کہ اپنی بہترین فکری و عملی صلاحیتوں کو علوم و فنون کی خدمت و ارتقا کے لیے وقف کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں عقل و خرد سے وہ کام لے سکے جو اس کا اصلی اور بنیادی کام ہے۔

گناہ یا معصیت انسان کا اصلی اشکال نہیں۔ اصلی اشکال ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہے، عقل و خرد کو وحی و ہدایت کی روشنی سے چمکانا اور سنوارنا ہے اور معاشرے میں ایسی صحت مند تبدیلیاں پیدا کرنا اور ایسے نصب العین عطا کرنا ہے، جو شر و فساد کا قلع قمع کر دیں اور معاشرے کو حرکت پذیر رکھیں۔

گناہ یا معصیت انسانی فطرت کا کوئی ناگزیر تقاضا نہیں۔ بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ معاشرے میں کہیں خلل ہے، عقل و تدبیر میں کہیں خامی ہے یا نصب العین اور ایمان کا فقدان ہے۔ یہ ساری چیزیں اگر موجود ہوں اور تعلیم و تربیت سے ان کو ترقی و فروغ دینے کا اہتمام بھی پایا جائے تو یہ مسئلہ اس درجہ تشویش ناک نہیں رہتا کہ اس کے لیے نہ سمجھ میں آنے والے تعسفات کی آڑ لی جائے۔

حقائق کی یہ ترتیب اگر صحیح ہے تو اس سے چوتھی دلیل کا کھوکھلا پن بھی واضح ہو جاتا ہے، جس کا منشا یہ ثابت کرنا ہے، کہ یہ عالم گناہوں اور معصیتوں کا گہوارہ ہے۔ کیوں کہ یہ عالم یا یہ دنیا بجائے خود گناہ یا معصیت پر ابھارنے والی نہیں، گناہ یا معصیت اس غلط اور ناہموار نظام حیات کا نتیجہ ہے جس کی ترتیب و ساخت میں عقل و ادراک کے صحت مند تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

## مسئلے کا فلسفیانہ پہلو:

اس وقت تک ہم نے بحث و فکر کا انداز یہ رکھا ہے کہ عیسائیت کے تصور گناہ میں جو خامیاں ہیں ان کو واضح کیا جائے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم اس مسئلے کے فلسفیانہ پہلوؤں سے ناآشنا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خیر و شر کی یہ بحث بہت پرانی ہے اور عیسائیت نے اس کی مشکلات اور وسعتوں پر غور کیے بغیر صرف کفارے کی حد تک اس سے فائدہ اٹھانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

کفارہ کیا ہے؟ اور اس کی فکری توجیہ کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل مقدمات پر غور یجیے۔

۱۔ انسان فطری طور پر گناہ گار ہے۔

۲۔ چوں کہ بہ تقاضائے فطرت یہ گناہوں سے دامن کشاں نہیں رہ سکتا' اس لیے صرف اعمال کے بل پر نجات کا استحقاق حاصل نہیں کیا حاصل کیا جا سکتا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی حمیت اس مرحلے پر جوش میں آتی ہے' جس کی صورت یہ ہے کہ وہ خود گناہ کی سزا کو مسیح کی موت کی صورت میں برداشت کرتا ہے۔

مقدمات کی اس ترتیب سے ظاہر ہے کہ اس بحث کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ انسان فطری طور پر گناہوں کی طرف مائل ہے' اور نیکی سے نفور اور گریزاں ہے۔ اس لیے نجات و فلاح کا دارومدار قدرتاً اس کے اعمال اور کردار پر نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر ہے' اور وہ بھی اس صورت میں کہ پہلے عدل و انصاف اور جزا و سزا کے تقاضے پورے ہو لیں اور اللہ تعالیٰ نسان کی شکل میں خود گناہوں کی پوری پوری اذیت برداشت کر لے۔

اس عقیدے میں کیا منطقی خلل ہے؟ اور ان مقدمات میں کہاں کہاں غلطی پائی جاتی ہے؟ س پر ایک حد تک بحث ہو چکی ہے۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ عیسائیت صرف کفارے کی جہ سے خیر و شر کے مسئلے سے تعرض کرنے پر مجبور ہوئی ہے' ورنہ یہ مسئلہ بجائے خود اس کا وضوع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے صرف گناہ اور معصیت سے بحث کی ہے جو انسانی فطرت کا صہ ہے۔ مگر شر و فساد کی ان صورتوں اور ناہمواریوں کا کوئی جواب نہیں دیا جو کائنات کا خاصہ ں۔ سوال یہ ہے کہ گناہوں کا حل تو کفارے کے عقیدے میں تلاش کر لیا گیا۔ ان مصائب کی کیا یہ ہے جو کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ ہولناک زلزلے کیوں آتے ہیں؟ اور انسانی آبادیاں ن کی آن میں کیوں تہس نہس ہو جاتی ہیں؟ یہ سیلاب کیوں زندگی کی رونق اور شادابیوں کو بے حمی سے بہا لے جاتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ ان کی تباہ کاریوں کی زد میں کتنی قیمتی جانیں آتی ں؟ یہ طرح طرح کی بیماریاں کیوں آئے دن اس حسین و جمیل پیکروں کو ختم کر دینے کے درپے ں' جنھیں خود اللہ تعالیٰ نے بنایا اور تیار کیا ہے؟ اسی طرح ان آندھیوں اور گرد و باد کے مہیب فانوں کی کیا توجیہہ پیش کی جائے گی جن سے بے پناہ مالی و جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

## حقیقی سوال:

غرض یہ ہے کہ اصلی و حقیقی اشکال صرف یہ نہیں کہ انسان اخلاقی نقطہ نگاہ سے کیوں گناہوں سے دوچار ہے' اصلی و حقیقی اشکال یہ ہے کہ اس کے پہلو بہ پہلو یہ بتایا جائے کہ کائنات کے سامنے کیا ضابطہ اخلاق ہے؟ اور فطرت کیوں ان ناسازگاریوں سے متہم ہے؟ ذرا غور و تعمق سے کام لیجے تو سوال اور آگے بڑھے گا اور اس متعین صورت میں آپ کے سامنے آئے گا' کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی خیر محض ہے تو مخلوق میں یہ شر و فساد اور نقص و عیب کیوں پایا جاتا ہے؟

اسلام نے اس اشکال کا کیا جواب دیا ہے' اس کے تفصیلی تذکرے کا محل دراصل غور و فکر کا وہ موڑ ہے' جہاں اسلامی دعوت کی خصوصیات بیان کی جائیں گی اور یہ بتایا جائے گا کہ آنحضرت نے دنیا کو کیا پیغام دیا اور انسانیت اور کائنات کے بارے میں کس نقطہ نگاہ کی تلقین کی۔ اس مرحلے میں ہمیں بحث و نظر کی صرف اس دشواری کی طرف اشارہ کرنا ہے' جو عیسائیت کے لیے حد درجہ پریشان کن ہے' اور جس کا عیسائیت کے پاس کوئی جواب نہیں۔

غور طلب یہ نکتہ ہے کہ اگر اشکال کا مذکورہ بالا تجزیہ صحیح ہے اور اگر شر و خلل کا دائرہ صرف انسانی اعمال ہی تک ممتد نہیں' بلکہ پوری کائنات تک پھیلا ہوا ہے' یہی نہیں بلکہ اس کی لپیٹ میں خود اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی بھی آتی ہے تو عیسائیت شر کے اس وسیع ترین مفہوم کے پیش نظر اشکال کا کیا حل پیش کرتی ہے؟

صرف کفارے کی توجیہہ سے کام نہیں چلے گا۔ کیوں کہ اس سے تو صرف انسانی اعمال کے ضعف و دوا ماندگی کا مداوا ہوتا ہے' اگرچہ اس سوال کا جواب اس میں بھی نہیں ملتا کہ آخر انسان میں یہ بدی آئی کیسے؟ جب کہ یہ اس خدا کی مخلوق ہے جو بے عیب و قدوس ہے۔

ظاہر ہے کائنات میں جو شر یا خلل کے پہلو ہیں' ان کی توجیہہ کے لیے عیسائیت کو بہرحال کسی دوسرے ہی پیمانہ فکر کا سہارا لینا پڑے گا اور کوئی دوسرا ہی اصول پیش کرنا پڑے گا' جو بہ یک وقت دونوں قسم کی دشواریوں پر حاوی ہو۔ یہی وجہ ہے ہم اس مطالبے کو پیش کرنے میں قطعی حق بجانب ہیں کہ ان دونوں سوالوں کو بہ یک وقت سامنے رکھ کر کوئی حل پیش کیا جائے' جس سے ایک طرف تو انسانی لغزشوں کی موزوں توجیہہ ہو سکے اور دوسری طرف نظام کائنات کی ناہمواریوں کے لیے مناسب عذر ڈھونڈا جائے۔ صرف انسانی اعمال سے تعرض کم نگہی پر دال ہے۔

کائنات کے بارے میں یہ سوال اس لیے نسبتاً زیادہ سنجیدگی و سنگینی اختیار کرلیتا ہے کہ انسانی اعمال سے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے خلق و ارتکاب کی براہ راست ذمہ داری نفس انسانی پر عائد ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا تعلق محض بالواسطہ ہے۔ لیکن کائنات میں جو عیوب اور ناسازگاریاں ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے دست تصرف کا نتیجہ ہیں۔

## افلاطون کا حل اور اس کا لازمی نتیجہ:

اس چکر سے عیسائیت کو سینٹ پال اور اس کا فلسفہ نہیں نکال سکتا اور اس گرفت کا آگسٹائن اور اس کے علم الکلام میں کوئی جواب نہیں مل سکتا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی شخص دست گیری کر سکتا ہے تو وہ افلاطون (Plato) ہے۔ اس کے نزدیک خدا ہمہ خیر ہے اور یہ کائنات بھی اپنے تمام اجزا اور تصرفات کے اعتبار سے خیر ہے۔ اس میں کہیں شر یا خلل نہیں، کہیں نقص یا عیب نہیں، عیب و خلل نقطہ نگاہ کا ہے۔ یہ زلزلے، یہ آندھیاں، یہ آتش فشاں پہاڑ، اور ان کا لاوا، ان میں کوئی چیز بھی شر نہیں، کوئی چیز بھی ضرر و فساد کی حامل نہیں۔ سوال یہ ہے کہ انسانی اخلاقیات کو فطرت پر عائد ہی کیوں کیا جائے؟ اور انسانی نقطہ نظر سے کائنات کی اخلاقیات کا جائزہ ہی کیوں لیا جائے؟ انسان کی اخلاقیات تشریعی ہیں، فطرت کی تکوینی۔ مزید برآں انسانی اعمال کے نتائج و عواقب ہمارے سامنے ہیں، اور ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ ان پر خیر و شر کے نقطہ نظر سے بحث کر سکیں۔ مگر کائنات اور اس کے تمام تغیرات تو ہمارے سامنے نہیں۔ اس کی حرکت و ارتقا کی کڑیاں ابھی مکمل ہی کہاں ہو پائی ہیں کہ ہم ان پر حسن و قبح کی چھاپ لگا سکیں۔

اس کے برعکس انسان کا تعلق جو کائنات سے ہے، وہ صرف اس کے بعض حصص اور بعض پہلوؤں سے ہے، اس کے کلی نظام اور وسیع تریں مقاصد سے نہیں۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ اگر کائنات کی پوری مصلحتیں ہمارے سامنے ہوں اور ہم اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کی حرکت و ارتقا کی ایک ایک کڑی کو دیکھ سکیں اور اس کی چال کے ساتھ ساتھ اس کے دور رس مقاصد بھی معلوم کر سکیں تو لامحالہ ہمیں کہنا پڑے گا کہ ان میں نقص و خلل کا تو کیا مذکور، سراسر حسن و جمال اور خیر و انفعیت ہی کا دور دورہ ہے۔

قصور کائنات کا نہیں، ہمارے جزوی نقطہ نظر کا ہے۔ ہم چوں کہ اس کے بعض پہلوؤں ہی کو

دیکھتے ہیں اور اس کے وسیع تر مقاصد ہمارے پیش نظر نہیں رہے اس لیے اس کے بعض تغیرات کو خواہ مخواہ شر سے تعبیر کرنے لگتے ہیں' حالاں کہ نتائج و مقاصد کے اعتبار سے ان میں قطعاً شر نہیں پایا جاتا۔

گویا کائنات کے شر سے بچ نکلنے کا ایک ہی منطقی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس شر کو سرے سے شر ہی تسلیم نہ کیا جائے اور ایک صوفی شاعر کے ہم نوا ہو کر اس حقیقت کا اعلان کیا جائے کہ

ع

خوش نویس است نہ خواہد بد نوشت

لیکن افلاطون کے اس حل کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسانی گناہ کی وہ سنگینی بھی باقی نہیں رہے گی جس پر عیسائیت کے تعصب کی بنیاد ہے' اور گناہ اگرچہ شریعت و آئین کی نگاہ میں گناہ ہی متصور ہو گا تاہم تکوین کے چوکھٹے میں اس کی حیثیت گناہ کی نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسے ناگزیر قدم و حرکت کی ہو جائے گی' جس کی کا رخ بہرحال خیر ہی کی طرف ہے۔

* * *

## (۵)

# تثلیث اور توحید

### تثلیث:

تعسفی عیسائیت کا دوسرا عقیدہ **تثلیث** ہے، اس میں فکر و منطق کی کون کون گمراہیاں پائی جاتی ہیں، اور اس کی تعمیر و ثبوت میں عیسائی متکلمین نے کن عجائب فکر کا مظاہر کیا ہے اس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

### حق و صداقت کی ایک سادہ کسوٹی:

علامہ ابن تیمیہؒ نے عقائد کی چھان پھٹک کے معاملے میں کیا عمدہ بات کہی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ حق، ثبوت و استدلال کی تحیر زائیوں کا رہین منت نہیں۔ اسے اگر کھول کر بیان کر دیا جائے تو یہی بہت ہے، یعنی اس کا مجرد ذکر اور بیان ہی یہ بتا دیتا ہے کہ اس میں کس درجہ صداقت پنہاں ہے۔ سچی بات خود بخود ذہن و قلب کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی چلی جاتی ہے اور جھوٹ ہزار بناؤ اور تکلف کے بعد بھی دل کی بارگاہ میں بار پانے کا مجاز نہیں ہو پاتا۔

**تثلیث** کو سب سے پہلے اسی معیار پر پرکھنے کی کوشش کیجیے۔ توحید کیا ہے؟ ایک اللہ کی پرستاری کا عہد! اور ایک محبوب سے تعلق عبودیت و محبت استوار کرنے کا اقرار۔!! اور **تثلیث** کیا ہے؟ تین تین آلہ سے اظہار عقیدت۔

واضح تر اسلوب بیان میں یوں کہیے کہ اگر ایک ہی شخص کے سامنے بہ یک وقت یہ دو عقیدے پیش کیے جائیں تو وہ ان دونوں میں سے بغیر کسی غور و تعمق کے کس کو قبول کرے گا اور کس پر اپنی فلاح و ترقی کی بنیاد رکھے گا؟ خدا کے عقیدے پر یا تین خداؤں کے عقیدے پر؟

## تثلیث کو بزورِ شمشیر نافذ کیا گیا:

دراصل اس بدعت کی بنیاد نیقیہ کی مشہور کونسل میں رکھی گئی، جس کا انعقاد چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا، اس سے پہلے چوں کہ عیسائیت پر یہودی عقائد کا اثر غالب رہا، اس لیے اس میں توحید کے رجحانات کو بھی نسبتاً تفوق حاصل رہا۔ عیسائی علما کے اس اجتماع میں خصوصیت سے یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مسیحی الہیات میں یہودی عقائد کے باقیات کو قائم رہنے دیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔ آریوس اور اس کے ہم نوا توحید کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ توحید ہی کو عیسائی نظام عقائد کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ لیکن دوسرے علما اس کے خلاف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آریوس کی بات مسترد کر دی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ "جو شخص یہ کہے کہ کسی وقت خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا۔ یا پیدا ہونے سے پہلے وہ کلمہ کی شکل میں پایا نہیں جاتا تھا۔ یا اسے کتم عدم سے معرض ظہور میں لایا گیا ہے، یا اس کا جوہر جس سے اس کی تخلیق ہوئی، ربانی نہ تھا، یا یہ جوہر ایسا ہے کہ اس میں تغیر و بدل ہو سکتا ہے، اور ایسی صفات سے متصف ہے جو مخلوق کے ساتھ خاص ہیں، تو ایسے شخص کو کلیسا ملعون قرار دیتا ہے"

ممکن ہے اس فیصلے کے بعد بھی عیسائیت بحیثیت مجموعی توحید کی نعمتوں سے محروم نہ رہتی اور اچھی خاصی تعداد اہل علم کی بہرحال ایسی رہتی، جن کو ایک خدا کی پرستش کے سوا اور کوئی عقیدہ مطمئن نہ کر سکتا۔ مگر ہوا یہ کہ قسطنطین نے کونسل کے اس فیصلے کو بزورِ شمشیر نافذ کر دیا اور سرکاری طور پر کوشش کی کہ عیسائی دنیا میں جہاں تک عقائد کا تعلق ہے کم از کم کسی قسم کا اختلاف رائے باقی نہ رہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کے باوجود موحدین (Unitarian) کی ایک جماعت **تثلیث** سے برابر بیزار رہی، مگر اس رجحان کو کبھی بھی کلیسا میں بنیادی اور مسلمہ (Classical) حیثیت حاصل نہیں رہی اور کبھی بھی عیسائی متکلمین کے حلقوں میں اس کو اصلی اور حقیقی عیسائیت قرار نہیں دیا گیا۔

ماحصل یہ ہے کہ چوں کہ ماضی کی طویل ترین مذہبی تاریخ میں انبیا و رسل کا تجربہ کامیاب نہیں رہا اور اس سے تاکستان حیات کی حفاظت و نگہداشت کے وہ اونچے مقاصد پورے نہیں ہو پائے، جن کی بجاطور پر توقع کی جا سکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل نے فیصلہ کیا کہ اب خود پہنچنا چاہیے اور اس کارگاہ زندگی میں ایک بشر اور ایک انسان کی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیے۔

لیکن پھر کیا یہ مقصد پورا ہوا؟ اور خداوند تعالیٰ کی اس جلوہ گری کے بعد واقعی یہ تاکستان محفوظ ہو گیا؟ کیا اب فکر و عمل کی گمراہی کے امکانات باقی نہیں رہے اور انسان کی خواہشات حیوانی اس مے سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا پائے گی جو اس تاکستان سے کشید کی جائے گی؟ کیا اب انسان ظلم و فساد پر آمادہ نہیں ہوں گے؟ ایک دوسرے کا گلہ نہیں کاٹیں گے؟ ایک دوسرے کی دشمنی اور عداوت پر کمربستہ نہیں ہوں گے؟ اور ایسے اخلاق حمیدہ کے اور اوصاف کریمانہ کے پیکر بن جائیں گے کہ جن پر انسانیت کو ناز ہو؟

سوال یہ ہے کہ خود تاریخ کا جواب کیا ہے؟ تھوڑی دیر اس فلسفہ آرائی کو رہنے دیجیے اور فکر و استدلال کی استواریوں سے تعرض کیے بغیر یہ دیکھنے کی کوشش کیجیے کہ عیسائیت کے اس نئے عہد کے بعد جس میں اللہ تعالیٰ نے قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لی اور انبیا و رسل کے نظام کو قابل اعتماد نہیں سمجھا، رشد و ہدایت کے سلسلے میں کیا اہم تغیر رونما ہوا؟

دور جانے کی ضرورت نہیں، عیسائی تاریخ کے موٹے موٹے عنوانات دیکھ لیے جائیں۔ کیا عیسائیوں نے خود عیسائیوں کے گلے نہیں کاٹے؟ اور صدیوں تک اپنے ہی بھائیوں کے خلاف بغض و عناد کے الاؤ نہیں دھکائے؟ کیا عیسائی مقدسین نے رہبانیت کے پردے میں شرم ناک اقدامات نہیں کیے علوم و فنون کا گلا نہیں گھونٹا۔ اور احتساب کی آڑ میں آزادی رائے اور حریت فکر پر قدغن نہیں بٹھائی؟

ان واقعات کو بھی جانے دیجیے۔ دو سو سال کی گزشتہ تاریخ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے چلیے۔ جس میں یورپ کے استعمار نے پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ ظلم و نہب اور لوٹ کھسوٹ کے ایسے مہیب واقعات کا ارتکاب کیا ہے کہ اس پر عدل و انصاف کی نگاہیں مارے شرم و ندامت کے آج بھی جھکی جا رہی ہیں۔

## ایک بلند تمثیل اور اس کے اشکالات:

تثلیث کے اقانیم میں اگرچہ باپ' بیٹا اور روح القدس داخل ہیں تاہم عقیدے کی اہمیت کا تعلق دراصل جس محور سے ہے' وہ حضرت مسیح کی ذات گرامی ہے اور ان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدوسیت ان میں سمٹ آئی ہے۔ اور باوجود ظاہری بشریت کے ان کا اصلی جوہر ربانی ہے اور ان کی اپنی فطرت جو بشریت کے جامے میں کار فرما اور جاری و ساری ہے' لاہوتی ہے۔

اس عقیدے کی مذہبی وجہ جواز (Tustification) کیا ہے؟ اسے انجیل کی ایک بلیغ مثال میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> "پہلے تو تاکستان شریعت کی نگہبانی کے لیے رسول اور نبی بھیجے گئے' تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں اور اسے حیوانات اور درندوں کی دست برد سے بچائیں۔ مگر جب خداوند نے دیکھا کہ اس نگہبانی کے باوجود تاکستان محفوظ نہیں ہے تو اس نے بنفس نفیس آنے کی زحمت برداشت کی۔"

مثال نہایت عمدہ ہے اور بلاشبہ دینی لٹریچر میں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جس حقیقت کو نہایت سادہ پیرایہ بیان میں اجاگر کرنے اور جس اشکال کو بغیر کسی الجھاؤ کے حل کرنے کی کوشش کی گئی' وہ یہ ہے کہ تعلیمات الٰہی نے آخر اتنا پلٹا کیوں کھایا؟ اور ایسا کیوں ہوا کہ انبیا و رسل کو بھیجنے اور مبعوث فرمانے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے خود تشریف فرمائی کی ٹھانی۔

نبوت کے بجائے تجسم مسیح (Incarnation) کا عقیدہ دو قسم کے واضح اشکالات سے دو چار ہے۔ ایک اشکال تاریخی نوعیت کا ہے اور دوسرا فلسفیانہ نہج کا۔

تاریخی اشکال یہ ہے کہ جب عبرانی انبیا نے بالاتفاق عقیدہ توحید کی تلقین کی ہے' توحید ہی کو مذہب و معاشرے کی بنیاد اور اساس ٹھہرایا ہے اور اسی کو اپنی دعوت کی مابہ الامتیاز خصوصیت قرار دیا ہے' تو ہزاروں برس کے اس متفقہ دینی شعور کو جھٹلانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

فلسفیانہ اشکال یہ ہے کہ لاہوت نے کیوں اپنی وسعتوں کو سمیٹا اور کیوں اپنی ربانی خصوصیات کو بشری کمزوریوں میں سمویا اور ڈھالا؟

اس تمثیل میں بہ یک وقت ان دونوں اشکالات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جس کا ؟؟

( یہ صفحہ غلط لگ گیا ہے )

## تاریخ کا فیصلہ:

گویا تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ انگوری باغ کی تمثیل صحیح ثابت نہیں ہوئی اور اس کے اندر جو فلسفہ یا غرض و غایت پنہاں ہے واقعات اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔

تمثیل بہ ظاہر بہت سادہ' دلنشین اور موثر ہے مگر اس کے معنوی لوازم اس درجہ خطرناک اور نمایاں ہیں کہ کوئی شخص بھی ان کو غور و فکر کا ہدف ٹھہرائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا

یہ تمثیل اگر صحیح ہے تو مندرجہ ذیل سوالات کا کیا جواب عیسائی متکلمین پیش کرتے ہیں:

۱۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نظام رشد و ہدایت میں ایسی بنیادی تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں جو دعوت و فکر کی بنیادوں ہی کو بدل کر رکھ دیں؟ یہی نہیں بلکہ جن کے ماننے سے مذہب کی تمام اقدار ہی بدل جائیں؟

۲۔ عہد نامہ قدیم میں توحید کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں جن دلائل کو انبیا نے بار بار دہرایا ہے' کیا تجسم کے بعد ان کی منطقی استواری ختم ہو جاتی ہے؟ یا وہ دلائل اب دلائل نہیں رہتے؟

۳۔ کیا بنیادی عقائد بھی مصلحت کے تابع ہیں اور انھیں بھی مصلحت کے تحت بدلا جا سکتا ہے؟

۴۔ جواب اگر اثبات میں ہے تو پھر مذہب کے دائرۂ بحث میں باقی کیا رہ جائے گا جو غیر متبدل ہو؟

* * *

# (۶)

# انبیا کی دعوت اور نبوت کا اصلی تصور

## کیا نبوت فکر و اندیشہ کی تاثر پذیری سے تعبیر ہے؟:

ان اشکالات کا قدر مشترک یہ ہے کہ آسمان تاریخ پر اگرچہ ہزاروں انبیا آفتاب و قمر بن کر چمکے ہیں اور رشد و ہدایت کے لیے ہر دور اور زمانے میں حالات و ظروف کے مطابق اظہار و تشریح کی بوقلموں صورتیں اختیار کی ہیں تاہم روح اور اصل کے اعتبار سے ان میں پوری پوری یکسانی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یعنی سب نے ایک ہی آواز بلند کی ہے، ایک ہی دعوت پر زور دیا ہے اور ایک ہی سچائی کی طرف لوگوں کو بار بار بلایا ہے۔ اور یہی یکسانی اور ہم آہنگی اس بات کی دلیل ہے کہ ان نفوس قدسیہ کو براہ راست اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اور یہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وحی کی بنا پر کہتے ہیں۔ اس میں حدیث نفس یا تقاضائے وقت کی دخل اندازیاں کارفرما نہیں۔

پیغام و دعوت کی یکسانی کی فلسفیانہ اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس نزاع کے بارے میں غور کیجیے، جو تصور نبوت سے متعلق اہل علم میں دائر و سائر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا نبوت نفس و باطن ہی کے ہیجان و جوش سے بھرپور ہے؟ اور کیا نبی اپنی ہی تاثرات و جذبات کو وحی الٰہی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ یا نبوت بیرونی اور ایسے معروضی فیضان سے تعبیر ہے، جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت خاص سے ہے؟

پہلا خیال ان لوگوں کے افکار کی ترجمانی کرتا ہے جو نبوت کو سراسر موضوعی (Subjective) سمجھتے ہیں۔

دوسرے خیال میں ان لوگوں کے عقائد و ایمانیات کی تشریح ہوتی ہے جو نبوت کو معروضی حقیقت (Objective Reality) جانتے ہیں۔

اگر پہلا نقطۂ نظر صحیح ہے تو اس میں دعوت و اصلاح کے نقشے میں نہ صرف اختلاف ممکن ہے بلکہ ضروری ہے، اور اگر دوسرا زاویہ نظر درست ہے تو پھر اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی، اختلاف الشاان کے کذب دلالت کناں ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

(النساء: ۸۲)

"اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت سے اختلاف پاتے"

زیادہ واضح تر پیرایہ بیان میں یوں سمجھیے کہ:

خارقہ نبوت کس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں دو رائے ہیں۔

ایک مدرسہ فکر یہ ہے کہ انبیا وہ ذہین و فریس اور دردمند و حساس حضرات ہوتے ہیں جو اصلاح و تجدید کی صلاحیتوں کو قدرت سے لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جب گردوپیش کی گمراہیوں کو دیکھتے ہیں تو بے قرار ہو اٹھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی اصلاح کے درپے ہوں۔ ان کا یہی تاثر، یہی آرزوئے اصلاح اور حق و صواب کے لیے تڑپ اور بے قراری انھیں اصلاح و تجدید پر ابھارتی اور تیار کرتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کام کے لیے پیدا کیا ہے وحی و الہام کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہی جذبات و افکار شدت تاثر کے ایسے مرحلے میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں نفسیاتی طور پر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انھیں منصب نبوت پر فائز کیا جا رہا ہے اور کسی متعین نصب العین کی اشاعت و تبلیغ پر مجبور کیا جا رہا ہے---------- اس صورت میں جبرئیل، فرشتے، اور وحی کا وجود، محض فکر و خیال کی کرشمہ سازی ٹھہرے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ایک طرح کی تمثیل (Dramatization) پر مبنی ہے۔

دوسرا مدرسہ فکر یہ ہے کہ نبوت شخصی جذبات و تاثر پذیری کا نتیجہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی

صفت ربوبیت کا منطقی تقاضا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ خدا جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس نے اس کی مادی اور دینی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا ہے، وہ اس کی روحانی و اعلیٰ معاشرتی ضرورتوں اور احتیاجوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ جس نے ماں کے پیٹ میں اس کے لیے غذا کا اہتمام کیا، جس نے ایسی حالت میں ماں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشموں کی تخلیق کی کہ اسے اپنی اولین ضروریات تک کا احساس نہ تھا، وہ رحیم و شفیق خدا کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کا بندہ جب کارگاہ حیات میں قدم رکھے اور اس کی مشکلات گوناگوں سے دوچار ہو تو اس کے سامنے کوئی چچا تلا نصب العین نہ ہو، کوئی متعین روشنی نہ ہو اور اس کے روحانی و معاشرتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے رشد و ہدایت کا کوئی اہتمام نہ ہو۔

## نبوت کا حقیقی تصور:

یہ چیز اس کی صفت ربوبیت کے منافی تھی، لہٰذا نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے بلند کردار اور بلند اذہان اشخاص بھیجے ہیں جو پیش آئند مشکلات میں انسان کی راہنمائی کریں، جو گمراہیوں کے خلاف لڑیں، ظلمتوں اور تاریکیوں کو فکر و اندیشہ کی تاب ناکیوں سے بدل کر رکھ دیں، جو اپنے عمل و کردار کے ایسے اونچے نمونے پیش کریں کہ انسانیت ان سے سبق و عبرت حاصل کر سکے۔ مزید براں جو ایسے دستور العمل، ایسی کتاب اور آئین سے انسانوں کو بہرہ مند کریں کہ جس سے تہذیب و تمدن کے قافلے ایک خاص منزل اور خاص سمت کی طرف قدم بڑھا سکیں۔

نبوت کا پہلا نقشہ چوں کہ محض ذاتی و انفرادی تاثرات پر مبنی ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ سلسلہ انبیا میں فکری و نظری یکسانی پائی جائے یا اس میں رابطہ و نظم کے لوازم موجود رہیں۔ بخلاف دوسرے نقشے کے اس میں پورے پورے تطابق فکر و عقیدہ کا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ان انبیا کا سرچشمہ علم ایک ہے، مصدر عرفان ایک ہے اور ان کی منزل و سمت ایک ہے۔

اب اگر ترتیب اشیا یہ ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل، دوسرے معنوں میں نبی ہیں، ان کو فی الواقع اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، یا ان کی نبوت ان کے لیے اپنے ہی تاثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ رہین منت ہے اللہ تعالیٰ کے اہتمام ربوبیت کی اور اس سلسلہ ہدایت کی جس کی ایک کڑی حضرت مسیح بھی ہیں تو ان کے پیغام اور دعوت میں اصولی اور بنیادی اختلاف ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ان حقائق کی روشنی میں انگوری باغ کی تمثیل پر غور کیجیے‘ تو معلوم ہو گا کہ اس میں مابعد کے ان ملحدانہ افکار کی جھلک صاف نمایاں ہے‘ جو مابعد کے بت پرستانہ ماحول میں پروان چڑھے‘ اور اسرائیلی تصور نبوت اور تاریخ نبوت سے جن کا دور کا واسطہ بھی پایا نہیں جاتا۔

## ایک دلچسپ تضاد:

وہ چارپائی تو آپ نے اکثر دیکھی ہو گی جو برسات کے چند ہی چھینٹوں سے بھینگی ہو جاتی ہے‘ اس کی ناہمواری ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ اگر ایک طرف بیٹھیے تو دوسری طرف کا پایہ اٹھ جاتا ہے اور دوسری طرف وزن ڈالیے تو ادھر کا پایہ اپنی جگہ پر برقرار نہیں رہ پاتا۔ بعینہ یہی عالم ان عقائد کا ہو جاتا ہے جن میں انسانی تحریفات سے توازن قائم نہیں رہتا اور طرح طرح کے عقائد کے تضادات اور اختلافات ابھر آتے ہیں۔ اگر ایک عقیدہ کو حق بجانب ثابت کیجیے۔ تو دوسرے تصورات میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے‘ اور اس ٹیڑھ کو درست کرنے کی کوشش کیجیے تو اس سے پہلا عقیدہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

کفارے اور تثلیث میں عیسائی متکلمین کو کچھ اسی قسم کی ناہمواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کفارہ کے سلسلے میں انھوں نے انسانی زندگی کے اس پہلو پر زور دیا تھا کہ یہ گنہگار ہے‘ معصیت پسند ہے اور برائی و عیب اس کی گھٹی میں داخل ہے‘ تثلیث کی نوبت آئی تو انسانیت کو اس حد تک اچھالنا پڑا کہ الوہیت مسیح کے معنی ہی انسانیت میں لاہوتی عنصر کی نشان دہی کے ہوئے۔ چنانچہ انجیل کے شارحین کو عقیدہ تثلیث کی تعریف کچھ اس طرح کے الفاظ میں بیان کرنی پڑتی ہے کہ کہ اس سے ایک نئے دور انسانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس سے بشریت زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے‘ جب انسان بشری لباس اتار دیتا ہے اور کسوت لاہوت میں جلوہ گر ہوتا ہے‘ جب خالق و مخلوق کے درمیان دوری اور ثنویت کے پردے ہٹ جاتے ہیں‘ جب زمین فلک تک رسائی حاصل کر لیتی ہے اور پستیاں بلندیوں سے جا ملتی ہیں‘ اور جب ہماری آنکھیں ذرے کو آفتاب اور قطرے کو یم کی شکل میں باہم متحد دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔

دیکھا وہ گنہگار انسان جس سے نیکی کی کوئی امید نہیں کیا جا سکتی تھی‘ جس میں خیر کے پہلو کمزور اور برائی کے پہلو شدید تر تھے‘ کس طرح بہ یک جست آسمان تک جا پہنچا ہے۔

فکر و عقیدے کا یہ تضاد ہمارے نزدیک کسی طرح بھی جرح و تنقید کا مستحق نہیں۔ دیکھنے کی

چیز صرف یہ ہے کہ عقائد و تصورات کی عدم استواری (Inconsistency) فکر و نظر کے سامنے کتنے دلچسپ مرقعے پیش کرتی رہتی ہے۔

## کیا ارتقاے انسانی کے مضمرات محدود ہیں؟:

تھوڑی دیر کے لیے ہم ان عیسائی متکلمین کے موقف کو مان لیتے ہیں کہ

> "الوہیت مسیح کے عقیدے سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے' ترقی کا ایک نیا افق نظر و بصر کے سامنے آتا ہے' اور انسانی عزم و حوصلے کو تگ و تازاور فکر و تعمق کا ایک نیا میدان ہاتھ آجاتا ہے۔ یعنی بشریت' عجز و مجبوری کے حدود سے نکلتی ہے اور اختیار و تخلیق کے وسیع و عریض میدانوں میں قدم فرسا ہوتی ہے۔

> مگر اس مرحلے پر سوال یہ پیدا ہوتا کہ:

> پہلے دور کو ختم کس نے کیا ہے؟ اور انسانی مضمرات ارتقا کا پورا پورا جائزہ کس نے لیا ہے؟

ذرا چشم بصیرت وا کیجیے اور تاریخ کے اس دور کو سامنے لایئے' جب انسان نے باہمی زندگی شروع ہی کی ہے' جب تہذیب و تمدن کے خانے یکسر مفقود ہیں' جب اس کا سرمایہ علمی صرف اتنا ہے کہ گردوپیش کی چند چیزوں کو پہچاننے لگا ہے۔

جب یہ جنگلوں میں رہتا اور شکار پر گزر بسر کرتا ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں' کوئی ٹھکانا نہیں' کوئی اثاثہ اور سامان نہیں سوا ایک پتھر کے ایک ڈھیلے اور لاٹھی کے' اور کسی ہتھیار سے واقف نہیں' جس سے کہ یہ دفاع کر سکے اور دشمنوں سے نمٹ سکے۔

پھر ایک دور آتا ہے جب اس نے جھونپڑا بنانا سیکھ لیا ہے' زبان نے بھی خاصی ترقی کر لی ہے اور ڈھیلے اور لاٹھی سے آگے بڑھ کر اب اس کے پاس گھر کے استعمال کے لیے پتھر کے کچھ برتن بھی جمع ہو گئے ہیں۔

زندگی اور آگے بڑھتی ہے۔ اب اس نے زراعت کے کچھ اصول بھی سیکھ لیے ہیں۔ زراعت کے بعد جماعتی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور ابتدائی جماعتی زندگی تہذیب و تمدن کے کچھ مدھم سے نقوش کو ابھار دینے کا باعث ہوتی ہے۔ زندگی کا قافلہ رکتا نہیں' صدیوں کے بعد انسانی

علم و تجربے میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ دور شروع ہوتا ہے جسے ہم ابتدائی زمینداری (Foodlism) کا دور کہتے ہیں۔ یہ دور ابھی جاری ہی رہتا ہے کہ اس کے بطن سے وہ تمدن جنم لیتا ہے جس میں بڑے بڑے زمینداروں کو غلاموں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ دور بھی اچھا خاصا طویل ہے۔ اس میں غلاموں کی مدد سے بڑی بڑی عمارتیں، ہیکل اور مندر تعمیر ہوتے ہیں اور انھی کی وجہ سے روم و یونان میں فارغ البالی اور دولت کی وہ ریل پیل ہوتی ہے، جو سقراط، افلاطون، اور ارسطا طالیس ایسے مفکرین کو پیدا کرنے کا باعث ہوئی ہے۔

یہ دور بھی صدیوں تک قائم رہتا ہے اور اسی دور کے تقاضوں سے حکومت و ملوکیت کے دائرے بننے شروع ہوتے ہیں اور قانون و فلسفہ کے لیے ذہنوں کی زمین ہموار ہوتی ہے۔

ترقی کے ان گزشتہ ادوار کو دیکھیے اور پھر آج کی ترقی و زندگی کا جائزہ لیجیے۔ کتنا فرق ہے کتنے فاصلے ہیں اور کسی بڑی مسافت ہے جو انسانی فکر و عمل نے طے کر ڈالی ہے۔

آج کا انسان کتنا اونچا ہے، علم و معرفت کے اسلحہ سے کس درجہ لیس ہے اور تہذیب و تمدن کی ترقیات و نتائج کے بارے میں کتنا خوش قسمت ہے۔

فطرت کی وہ قوتیں اور طاقتیں کل تک یہ جنھیں دیوی اور دیوتا سمجھتا تھا، آج اس کی تابع فرمان ہیں۔ وہ بجلی جس کی چمک اور کڑک سے یہ سہم سہم جاتا تھا آج اس کی ادنی کنیز ہے۔ اس کے کتنے کام ہیں جو بلا حیل و حجت یہ انجام دیتی ہے۔ پنکھا یہ جھلتی ہے، کھانا یہ پکاتی ہے، روشنی کا یہ اہتمام کرتی ہے، کارخانے یہ چلاتی ہے، اور کتنے بڑے بڑے انجن اور دیو پیکر مشینیں ہیں جن کو یہ صبح و شام متحرک رکھتی ہے۔

انسانی علم و ادراک اور حوصلہ و عزم کا یہ حال ہے کہ ہمالہ کی چوٹیوں کو سر کر رہا ہے اور چاند اور مریخ کی بلندیوں پر راکٹ پھینک رہا ہے، تسخیر فطرت کے یہ خوارق کبھی ذہن و فکر کے اندازوں میں آنے والے تھے؟

آج جسمانیات سے لے کر نفس و روح کی باریکیوں تک کتنے علوم ہیں جو انسان کے عزم و ارادے کی زد میں ہیں۔

غرض یہ ہے کہ انسان کے لیے اس کی فطرت میں ترقی و کمال کے اتنے بوقلموں مضمرات ہیں جو ختم ہونے والے نہیں اور کوئی مقام ایسا نہیں مانا جا سکتا کہ جس کے آگے اور کوئی مقام نہ ہو۔

مادی و فکری ترقیات کی تحیر زائیاں آپ کے سامنے ہیں۔ ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ ابھی انسان کو اپنے باطن میں ڈوبنا ہے، قلب و ضمیر کی گہرائیوں میں اترنا ہے اور کردار و سیرت کو اور چمکانا اور سنوارنا ہے۔ اس کے سامنے اس کی تگ و دو اور سعی و کوشش کے ہزاروں اور لاکھوں میدان باقی ہیں اور فکر و ادراک کی کروڑوں منزلیں ایسی ہیں جو ہنوز انسان کی قدم فرسائیوں کی چشم براہ ہیں، جن کو اسے ابھی طے کرنا ہے اور آگے بڑھنا ہے۔

## مقام انسانی کے بارے میں عیسائیت کی تنگ نگہی:

مختصر لفظوں میں یوں سمجھے کہ عیسائیت کے نظریہ الوہیت مسیح میں تنگ نگہی یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کے بارے میں یہ غلط خیال قائم کر رکھا ہے کہ چوں کہ یہ ناقص ہے، اس کی صلاحیت اور قوتیں محدود ہیں اور اس کے عزم و حوصلے کے داعیے سمٹے ہوئے ہیں للٰذا مزید ترقی و کمال کے لیے اس کے ڈانڈے عالم لاہوت سے ملنے چاہئیں اور اسے بشریت کی سطح سے اونچا اٹھ کر بلا محابا "انا الحق" کا نعرہ بلند کرنا چاہیے۔

ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انسان "انا البشر" کی سطحوں سے آگے کب نکلا ہے کہ نعرہ "انا الحق" کی ضرورت لاحق ہو۔ ابھی تو اسے بشریت کے حدود میں رہ کر ترقی و کمال کی بے شمار منزلیں طے کرنا ہے۔

ہمیں ان سادہ لوح پادریوں پر بے اختیار ہنسی آتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب مسیح کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ دیکھو! تمھارے رسول بشریت کے دائرے سے آگے نہیں نکلے اور ہمارے مسیح خداوندی اور الوہیت کے فرازوں پر متمکن ہیں۔ ان متعصبوں کو یہ نہیں معلوم کہ "بشر" ہونا کتنی بڑی بات ہے۔ بشریت کی زد میں علم و ادراک کی کتنی وسعتیں آتی ہیں اور کردار و سیرت کی کتنی بلندیاں ہیں جو اس میں پنہاں ہیں۔

"بشریت" وجود و حیات اور عقل و فکر کی کروٹوں کا وہ موڑ ہے جہاں ان الفاظ میں در حقیقت معنویت پیدا ہو جاتی ہے، جہاں وجود میں مقصد ابھرتا ہے، جہاں حیات کی سمتیں متعین ہوتی ہیں اور جہاں عقل و ادراک کا نصب العین نکھر کر نظر و فکر کے سامنے آتا ہے اور آنحضرت کو "بشر" قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ:

"آپ کی ذات گرامی اس وسعت، اس ہمہ گیری اور اس بلندی و سرفرازی

سے مالا مال ہے کہ جس سے کوئی ذی ادراک ہستی مالا مال ہو سکتی ہے۔"

## عقیدۂ الوہیت مسیح کا تجزیہ:

الوہیت مسیح پر اس سے بھی زیادہ وزنی اعتراض اس وقت ابھرتا ہے' جب اس کا عقلی تجزیہ کر کے پوچھا جائے کہ یہ معرض وجود میں آئی کیوں کر؟ کیا خود اللہ تعالیٰ کی فیضان و کرم سے یا حضرت مسیح کی اپنی کوشش سے؟

اگر پہلا جواب صحیح ہے تو اس میں حضرت مسیح یا انسان کا کمال کیا ہوا۔؟ مزید براں اس صورت میں اس فلسفیانہ اشکال کا کیا جواب عیسائی متکلمین دیں گے جو اس مفروضے میں پوشیدہ ہے کہ الوہیت مسیح کے معنی اللہ تعالیٰ کے تنزل کے ہیں' محدودیت کے نہیں ہیں' اور جسمانیت و موت سے مصالحت کے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ان صفات سے متصف ہو سکتی ہے؟ اگر انسانیت کی سطح پر اتر کر بھی وہ الوہیت سے محروم نہیں ہوتی' محدود میں سما کر بھی اس کی غیر محدودیت میں فرق نہیں آتا اور جسم کے پیکر میں آنے کے بعد بھی اس کی ذات غیر فانی ہی رہتی ہے تو اس اختصاص کے کیا معنی ہوئے جو الوہیت سے تعبیر ہے؟ الفاظ کے سحر اور تراکیب کی خوش نمائی سے ہٹ کر دیکھیے۔ کہ کوئی ٹھوس حقیقت ذہن و فکر کی گرفت میں آتی ہے؟ اور اگر کوئی ٹھوس حقیقت سمجھ میں آتی ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس کے ساتھ الوہیت مسیح کا عقیدہ بھی سمجھ میں آتا ہے؟

اگر دوسرا جواب درست ہے تو اس پر علاوہ ان اعتراضات کے جو پہلے موقف پر عائد ہوتے ہیں' اصولی اعتراض یہ ہے کہ یہ خود انجیل کی روح کے منافی ہے کہ کوئی شخص اپنی کوشش اور عمل سے الوہیت کے تخت اقتدار پر جلوہ گر ہو سکے۔۔۔۔۔۔ اور اس کے منطقی معنی یہ ہیں کہ عیسائیت کے جس دست ہنرمند نے انسانیت کی ترقی و کمال کے دروازوں کو کھولا تھا' خود اسی نے سختی سے ان کو دوبارہ بند کر دیا۔

## تیسرا تعسف اور اس کا تاریخی پس منظر:

تیسرا تعسف (Dogma) اعتراف (Confession) ہے۔ اس کا تعلق دراصل ایک رسم سے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ: جب کوئی عیسائی محسوس کرے کہ اس سے کوئی فرد گزاشت

سرزد ہوئی ہے' یا اس نے انجیل کے احکام و روح کی خلاف ورزی کی ہے تو اسے پادری کے سامنے اپنے اس گناہ کا اعتراف کرنا چاہیے اور بلا کم و کاست بتانا چاہیے کہ وہ کیوں اور کس طرح گناہوں سے مغلوب ہوا ہے اور کس طرح معصیت کے چنگل میں پھنسا ہے۔ اس رسم کو تعسف کی شکل میں ڈھالنے والی چیز خدا اور بندے کے درمیان پادری کا وجود ہے' جسے شفیع اور وسیلے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے' جو ایک خطاکار کی درخواست عفو کو نہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے بلکہ سفارش بھی کرتا ہے کہ:

> "اس کی لغزشوں اور گناہوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے۔"

> یہی نہیں' اس کے بارے میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ:

> "اس کے بغیر خطائیں اور درخواستیں اجابت و قبول کی منزلیں طے نہیں کر پاتیں۔"

اس **تعسف** کا بائبل سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اناجیل اربعہ میں بھی اس کی تائید میں کوئی نص پیش نہیں کی جا سکتی یہ ممکن بھی کیوں کر ہے جب کہ انبیاے سابقین کا مقصد حیات ہی بندوں اور خدا کے درمیان بلا واسطہ اور براہ راست تعلقات نیاز استوار کرنا ہے۔

عقیدے کی حیثیت سے پہلے پہل اسے پیش کرنے والی ٹورنٹ کونسل ہے۔ اس میں جہاں **تعسفی** عیسائیت کے دوسرے اصول و ضوابط کی تعیین کی گئی اور عیسائیت کے نام پر جہاں دوسری بدعات کو رواج دیا گیا وہاں اسے بھی کلیسائی روایات کا جزو لاینفک قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ:

> ہر ہر عیسائی کو اس کی مذہبی و دینی حیثیت تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا اور بندے کا تعلق براہ راست نہ رہا اور کوئی شخص انفرادی طور پر اس کا مجاز نہ رہا کہ: پادری کو نظر انداز کر کے بلا واسطہ اپنے آقا و مولا سے دل کی بات کہہ سکے۔

"ٹورنٹ کونسل" کے اس فیصلے کو رومن کیتھولک حلقوں میں تو قبول عام حاصل ہوا' مگر پروٹسٹنٹ اور دوسرے عقل پسند گروہوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔

وسیلے اور شفیع کے اس مسئلے کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اور اس عقیدے نے کس طرح اور کیوں کر ارتقائی منزلیں طے کی ہیں؟ اس کی تحقیق اور چھان پھٹک کے لیے ہمیں قدیم بابلی اور

اسیری تہذیبی نوشتوں کی طرف عنان توجہ کو موڑنا چاہیے۔ یہ نوشتے مناجاتوں اور دعاؤں کی شکل میں دریافت ہو گئے ہیں جو سمیاتی ادب کا نمونہ ہیں۔ اس کے مطالعہ سے محققین اثریات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابتدا میں اسیری اپنی دعاؤں کو بغیر کسی پروہت اور کاہن کی وساطت کے اپنے بتوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔

پروہت اور درمیانی واسطے کی ضرورت انھیں اس وقت محسوس ہوئی جب یہ مال و دولت کی محبت میں اپنے قومی مذہب سے غافل ہو گئے' اور دنیاوی مشاغل میں پڑ کر ان مناجاتوں اور دعاؤں کو بھول گئے جو ان کو دیوتاؤں کی نگاہ عتاب سے بچا سکتی تھیں اور ان کی خوش نودی کے حصول میں ممد و معاون ہو سکتی تھیں۔ اس مرحلے پر ایسے لوگوں نے آگے بڑھ کر ان روایات کو زندہ رکھنے کی ٹھانی جنھوں نے مندروں اور ہیکلوں میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی تھی اور اسیری تہذیب و تمدن کے مطالعہ و حفاظت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس اعلیٰ مقصد نے پیشے کی شکل اختیار کر لی۔ لوگوں کی مذہب سے ناآشنائی بڑھتی چلی گئی اور مذہب اور دیوتاؤں سے تعلق و رشتے کی مجبوریوں نے آخر کار وسیلے کے اس تصور کی تخلیق کی' جس نے آئندہ چل کر تمام انحطاط پذیر سامی مذاہب میں توحید کے صاف ستھرے عقیدے کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

رسم اعتراف اسی پرانے بت پرستانہ شعار کی ارتقائی شکل ہے۔

## انسانی بے چارگی کا لطیفہ:

انسانی بیچارگی اور بدنصیبی کا یہ لطیفہ کس درجہ عبرت آموز ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی توحید کو تو اس بنا پر چھوڑا کہ جو آنکھوں سے اوجھل ہے' جو لطیف تر ہے' جو جسمانیات سے بالا اور منزہ ہے' اس سے تعلقات عبودیت کیوں کر قائم کیے جائیں۔

اور بتوں کی پرستش کو اس بنا پر اختیار کیا کہ انھیں ہم دیکھتے تو ہیں' چھو تو سکتے ہیں' براہ راست ان کے سامنے دست سوال دراز تو کر سکتے ہیں۔ مگر پھر اس گمراہی پر بھی قلب و ذہن کی کج روی قانع نہ رہ سکی۔ اس کے لیے بھی پروہتوں اور کاہنوں کا وسیلہ اختیار کیا گیا اور ان محسوس دیوتاؤں تک پہنچنے اور رسائی حاصل کرنے کے لیے بھی درمیانی ذرائع و وسائل کی تلاش کی گئی۔ گویا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے تنزیہی تصور کو بربنائے تجرید قبول نہ کیا تھا' وہ بت پرستی پر بھی قائم نہ

رہ سکے اور شرک کی اس گمراہی نے انھیں اس سے بھی گھٹیا اور فرد تر شرک کی طرف ڈھکیل دیا۔

چرچ نے "اعتراف" کے اس بت پرستانہ تصور کو کیوں اپنایا؟ اس کے لیے ہمیں اس دور کی سیاسی تاریخ پر بھی نظر ڈالنا چاہیے۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک طرف سلاطین مغرب اپنے حدود اقتدار کو دنیا کے کناروں تک بڑھانے کے خواب دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف چرچ یہ چاہتا تھا کہ اس کا قبضہ بھی دلوں پر بدستور قائم رہے اور براہ راست نہ سہی بالواسطہ زمام اختیار انہی کے ہاتھ میں رہے، جسے چاہیں تخت و تاج کا مستحق گردانیں اور جسے چاہیں سازش کے ذریعے معزول کردیں۔

اس کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ یہ لوگ سلاطین و امرا کی عیاشیوں اور بدمعاشیوں سے کسی طرح آگاہ رہیں اور بہ وقت ضرورت ان سے کام لے سکیں۔

ظاہر ہے کہ "اعتراف" کی مذہبی حیثیت تسلیم کر لینے سے یہ غرض بہ احسن وجوہ پوری ہو جاتی ہے اور کلیسا کو اچھی طرح موقع مل جاتا ہے کہ عوام و خواص کی کمزوریوں اور لغزشوں سے حسب خواہش سیاسی فائدے اٹھا سکیں اور مذہب کی آڑ میں ہوس اقتدار کے دائروں کو وسیع تر حدود تک پھیلا سکیں۔

اس دینی و سیاسی پس منظر کی وضاحت کے بعد وسیلے و سفارش کی منطقی حیثیت زیر بحث آتی ہے۔ اس میں دو اصول اور بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ چوں کہ سراسر تجرید و تنزیہہ (Abstraction) سے بہرہ مند ہے، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے ایسے وسیلے و شفیع کی جو مجرد و محسوس میں تعلق و ربط کی نوعیتوں کو سمجھ سکے اور محسوس کی ضرورتیں غیر محسوس تک پہنچا سکے۔

۲۔ عام انسان چوں کہ گناہوں سے ملوث ہوتے ہیں، اس لیے اس لائق نہیں ہوتے کہ اس کی بارگاہ قدس میں پیش ہونے کا فخر حاصل کر سکیں۔

آیئے! ان مفروضات کی صحت و استواری کا جائزہ لیں۔

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی تنزیہہ و تجرید کی صفات حسنہ سے متصف ہے، مگر یہ تنزیہہ ارسطو کی تنزیہہ نہیں جو عقل محض اور حکمت بحت سے تعبیر ہو، بلکہ یہ وہ تنزیہ ہے جو

سمع، بصر، اجابت، عفو، رحم اور کرم ایسی تمام خوبیوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ مذہب جس خدا کو تسلیم کرتا ہے وہ اس حقیقت کا نام ہے جو محسوسات سے قریب تر ہے، جس کی رحمتیں براہ راست ہر ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، جو بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی پکار پر متوجہ ہوتا ہے، جس کا احاطہ علم و ادراک لبوں کی جنبش اور دل کی دھڑکنوں تک وسیع ہے، وہ لطیف اور ماورائے حسیات و جسمانیات صرف ان معنوں میں ہے کہ وجود و جسم کی کسی نوعیت کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ وہ ان بندوں سے الگ تھلگ اور لا تعلق رہنا چاہتے ہے اور ان کی ضروریات و حاجات کا علم نہیں رکھتا۔

فلسفہ و مذہب کے تصور خدا میں یہی وہ فرق ہے جو قابل غور ہے کہ جہاں فلسفہ ایسے مجرد خدا کے وجود پر مطمئن ہو جاتا ہے، جو صرف ذہن و فکر کے لطافت کی حد تک انسان کی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکے، وہاں مذہب ایسے مجرد تصور پر قانع نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس وہ ایسا حیی و قیوم اور سمیع و بصیر خدا چاہتا ہے جس کے سامنے اس کی جبین نیاز جھک سکے، جس کو بغیر کسی وساطت و ذریعے کے پکار سکے، جس کے سامنے بغیر کسی خوف و جھجک کے دل کی بات کھول کر رکھ سکے۔ یہی نہیں، جس کے سامنے آنسوؤں کے موتی بکھیر سکے اور شیشۂ دل کے شکستہ ٹکڑے پیش کر سکے، جس کو اپنی بندگی و غلامی کا یقین دلایا جا سکے اور بغیر کسی تامل اور مایوسی کے جس کے حضور میں دامن طلب پھیلا سکے۔

اگر خدا کا یہ تصور صحیح ہے تو پھر وسیلے و ذریعے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اب دوسرا مفروضہ کو لیجیے۔

سوال یہ ہے کہ مانا انسان گنہگار ہے۔۔ مگر یہ پادری کون ہے؟ یہ وسیلہ و ذریعہ کیا ہے؟ کیا یہ انسان نہیں؟ کیا اس میں بشری کمزوریاں پائی نہیں جاتیں؟ یہ گناہوں سے ملوث نہیں ہوتا؟ اس کو پاک بازی و تقدس کا سرٹیفکیٹ دینے والا کون ہے؟ اور اگر یہ بھی عام انسانوں کی طرح عاصی اور خطاکار ہے تو اس کو وسیلہ و ذریعہ کس نے ٹھہرایا ہے؟ اور کس نے یہ حق بخشا ہے کہ گنہگار انسانوں کی نمائندگی کا فرض انجام دے؟

اصل بات یہ ہے کہ شرک اور وسیلہ پرستی ایک طرح کی نفسیاتی مایوسی ہے، خدا کی رحمتوں کے بارے میں ایک طرح کے سوئے ظن کی پیداوار ہے۔ جب ایک شخص اپنے گناہوں کا اندازہ تو

کرتا ہے، مگر اس کی بخششوں اور رحمتوں کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں ابھرتا، تو وہ وسیلے کی آڑ لیتا ہے اور اپنی ہی سطح کی اشیا کی طرف دوڑتا اور لپکتا ہے۔۔۔۔۔۔ وسیلے اور ذریعے کے عقیدے پر ہمارا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے زندگی کے بارے میں مایوسی پھیلتی ہے اور اس مقصد کی توہین ہوتی ہے، جسے بالا و بلند کرنے کے لیے انسان پیدا ہوا ہے۔

* * *

## (۷)

# تصوف اور رہبانیت

### معیار صداقت:

تعسفات کے علاوہ بنیادی طور پر عیسائیت میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ اس کا وہ طرز عمل ہے جو اس دنیا کے بارے میں اختیار کیا اور مذاہب عالم میں یہی وہ شے ہے جسے معیار یا کسوٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر کوئی مذہب دنیا کو قبول کرتا ہے' اس کی نعمتوں سے صحیح معنوں میں بہرہ مند ہونے کی تلقین کرتا ہے اور اس کی کشاکش اور تلاطم آفرینیوں میں براہ راست مردانہ وادر کودپڑتا اور حصہ لینے میں ممدو معاون ثابت ہوتا ہے' تو وہ شائستۂ التفات ہے اور اس لائق ہے کہ اس کے نظام حیات پر غور کیا جائے۔

لیکن اگر کوئی مذہب اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو پہلے ہی قدم پر چھوڑ دینے کے لائق ہے۔ ایسے مذہب کی عمل و سیرت کے نقطۂ نظر سے کوئی قدر و قیمت نہیں۔

عیسائیت کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو مستحقر و ذلیل جانا' گناہوں' معصیتوں سے معمور مانا اور ہرگز اس لائق نہ سمجھا کہ اس میں حصہ لیا جائے' اس کی زلف گرہ گیر کو سلجھایا جائے اور اس کی شمیم آرائیوں سے قلب و ذہن کی بشاشتوں کا اہتمام کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ رہبانیت نے فروغ پایا' شہر ویران ہوئے اور ویرانے آباد۔ تہذیب و تمدن کے مرکزوں کو تحقیر و نفرت کی نظر سے دیکھا گیا' خانقاہوں سے متعلق سمجھا گیا کہ روح کی جلا اور سر

بلندی کے یہ وہ گہوارے ہیں جن پر عیسائیت کو فخر و ناز ہو سکتا ہے۔ نفس کشی، کٹھن مجاہدے اور شدید جسمانی اذیتوں کو تزکیۂ نفس کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ نہانا، دھونا، صفائی، پاکیزگی، اور زندگی کے دوسرے صحت مند اصول یکسر متروک ہوئے۔ ان کے بجائے غلاظت، گندا پن اور عفونت کو روحانیت کی معراج سمجھایا گیا۔

ترک دنیا کے اس جذبے نے بگاڑ اور اخلاقی انحطاط کی کیا کیا شرم ناک صورتیں اختیار کیں۔ ڈریپر نے اپی مشہور کتاب ”آویزش مذہب و علم“ (Between religin and since Conflict) میں اسے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

## تقاضائے تصوف اور رہبانیت میں فرق:

تعلق باللہ اور محبت الٰہی کی ایسی والہانہ اور مستثنیٰ صورتیں اپنے مزاج اور غرض و غایت کے لحاظ سے رہبانیت سے بالکل مختلف ہیں جن میں بعض حضرات عبوری دور کے لیے اور عارضی طور پر امور دنیا میں تساہل اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ: زندگی بجائے خود ناپاک ہے، اس لیے بھی نہیں کہ یہ دنیا بحیثیت مجموعی گمراہیوں اور معصیتوں کا گہوارہ ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے سامنے جو نصب العین ہے وہ زیادہ اہم اور زیادہ التفات و توجہ کی یک سوئی کا طالب ہے۔

رہبانیت یہ ہے کہ مستقل طور پر ترک دنیا کو ایک قدر (Value) سمجھ لیا جائے اور ذہن و فکر اور عمل و کردار، پوری کی عمارت کو اسی بنیاد پر تعمیر کیا جائے، دنیا اور اس کی تہذیبی اور روایات کی طرف سے نہ صرف یہ کہ آنکھیں بند کر لی جائیں بلکہ اس کی رفتار ترقی کو روک دیا جائے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ صحت مند تصوف اور رہبانیت میں نیت و مقصد سے لے کر طریق و منزل کی تفصیلات تک بنیادی اختلاف ہے۔ صوفی اگر امور دنیا کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تو اس بنیاد پر کہ تزکیہ و تحلیہ سے پہلے وہ اپنے نفس کو اس قابل نہیں پاتا کہ امور دنیا سے بہ احسن وجوہ نمٹ سکے، لہٰذا فکر و ذکر کی کچھ فرصتیں چاہتا ہے۔ اس کا نصب العین بہرحال یہی ہے کہ نفس و روح کی پوری پوری تیاری کے ساتھ کار زار دنیا میں اترے اور ایک جاں باز سپاہی اور مجاہد کی حیثیت سے اس میں شریک ہو۔ اس کے برعکس راہب ایک طرح کے ذہنی فرار کا شکار ہوتا ہے اور کسی منزل میں بھی دنیا کا ساتھ نہیں دینا چاہتا۔ اس کے نزدیک زندگی اور اس کے جملہ مظاہر ناپاک، معصیت آلود

اور ناقابلِ التفات ہیں۔

عیسائیت میں یہ رجحان کب پیدا ہوا، اور اس نے کس طرح ترقی کرکے علیحدگی و انزوا کی مکمل صورت اختیار کی؟ اس کا سراغ لگالینا کچھ مشکل نہیں۔ حضرت مسیح کی تعلیمات میں اگرچہ تصوف کا رنگ غالب ہے، تاہم وہ تصوف ایسا ہے جو رہبانیت کا مترادف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عیسائیت میں پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے اواخر تک بلکہ تیسری صدی کے اوائل تک بحیثیت عقیدہ (Creed) کے رہبانیت کی ہمہ گیریوں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ الٹا جو نوشتے حال ہی میں وادیٔ قمران (Dead Sea Scroll) سے دریافت ہوئے ہیں ان کے مندرجات سے عیسائی دنیا میں اچھی خاصی تمدنی چہل پہل کا پتا چلتا ہے۔ اس میں شادی بیاہ اور حقوق و فرائض کی وہ جملہ تفصیلات پائی جاتی ہیں جو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

رہبانیت کے سلسلے میں دو بنیادی سوال فکر و نظر کے سامنے آتے ہیں:

۱۔ کیا دنیا کو ترک کر دینا ممکن ہے؟

۲۔ کیا اس سے واقعی روحانی و اخلاقی زندگی میں ترفع اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے؟

## ترک دنیا کے دو معنے:

ترک دنیا کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا کوئی بندہ تہذیب و تمدن کی ٹیم ٹام اور تکلفات کو چھوڑ کر ضروریات کی حد تک قانع ہو جائے، اور طلب و شوق کے تقاضوں کو سادگی کے حدود سے آگے نہ بڑھنے نہ دے، تاکہ جو وقت اور طاقت ان سے بچے، اس کو حصول خیر، ذکر و فکر ایسے اونچے مقاصد کے لیے وقف کر سکے۔

ان معنوں میں رہبانیت نہ صرف یہ کہ کوئی خلاف فطرت تقاضا نہیں ہے بلکہ مذہب و تصوف کا اصلی بنیادی تقاضا ہے۔ یعنی ہم اگر زندگی کے مزخرفات سے دامن بچائیں، اپنی تمام فکری و عملی قوتوں کو اعلیٰ نصب العینوں کے لیے صرف کر سکیں تو اور کیا چاہیے۔ یہی تو وہ شے ہے، جس سے کردار و سیرت کے محیر العقول نمونے صفحۂ تاریخ پر ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور بات یہیں سمجھ لینے کی ہے، وہ یہ کہ جہاں تک ذکر و فکر کا تعلق ہے، ہم اسے محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتے، ہمارے نزدیک ذکر و فکر کا دائرہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے لے کر ان جملہ آیات میں تدبر و تفکر تک وسیع ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک اللہ کا نام لینے والا، ایک عابد شب

زندہ وار اور محبت الٰہی میں مستغرق ذاکر رہتا ہے' اسی طرح ایک سائنٹسٹ بھی ذاکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں اس کی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں مصروف ہے' اور اس کے اصولوں کی دریافت میں منہمک ہے' بشرطیکہ نقطہ نگاہ یہ ہو کہ تحقیق و تجربے کی ہر ہر دریافت سے اس کی قدرت کاملہ کی طرف عنان توجہ کو موڑنا اور ایجادات سے اس کے بندوں کو بغیر کسی امتیاز و تخصیص کے بہرہ مند کرنا ہے۔

ترک دنیا کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ نفس زندگی ہی کو قابل نفرت سمجھ کر' کنارہ کشی اختیار کرلی جائے۔ علاوہ ازیں کوشش کی جائے کہ اس کے تمام لوازم' تمام تقاضے' اور جملہ اسباب و ذرائع' حد درجے کا سمٹاؤ اختیار کرلیں۔ ایسا سمٹاؤ جس کا تحمل انسانی فطرت کے لیے آسان نہ ہو۔ یہی وہ نقطہ نظر ہے جس نے راہبوں اور تارک الدنیا درویشوں کو مجبور کیا ہے کہ شہروں کی بھری پڑی دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں کو بسائیں' ویرانوں کو رونق بخشیں' اور غاروں اور پہاڑوں پر بودوباش اختیار کریں۔ اور یہی وہ زاویہ نظر ہے جس پر رہبانیت کا اولین اطلاق ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اتنا کرنے سے کیا ترک دنیا کا مقصد حقیقتاً پورا ہو گیا؟ دنیا کیا واقعی چھوٹ گئی اور کنارہ کشی کے تقاضے تمام ہوئے۔۔۔۔۔؟

آیئے اس سوال سے عہدہ برا ہونے سے پہلے خود دنیا کی تعیین کرلیں کہ

یہ کون معشوق ہزار شیوہ ہے؟

جس سے اس درجہ اجتناب ضروری ہے اور کون قتالہ عالم ہے جس کے زلف گرہ گیر میں گرفتار ہونا گناہ و معصیت کو دعوت دیتا ہے؟ کیا اس کا وجود نفس کے باہر کہیں جلوہ گر ہے' یا اس کی جلوہ گاہ ناز خود نفس و باطن کے اندر پنہاں و مستور ہے۔۔۔۔۔؟

اگر صورت معاملہ یہ ہے کہ نفس کی شورشیں' جذبات کے ہنگامے' طلب و خواہش کے طوفان' حرص و شہوات کی قیامتیں سب کا تعلق بہرحال اندرون خانہ سے ہے' باطن سے ہے' تو آپ نے ترک کیا چیز کی؟ کنارہ کشی کے کیا معنی؟ اور کس کو چھوڑا اور کس کو مارا؟ دشمن تو آپ کے پہلو اور بغل میں پناہ گزیں ہے' دل اور نفس میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس کو جب بھی موقع ملے گا ہزار ریاضت اور چلہ کشی کے بعد بھی وار کرتا رہے گا' اس بنا پر باہر کے ہنگاموں کو ترک کرکے یہ سمجھ لینا کہ نفس کے ہنگاموں کی طرف سے یک سوئی حاصل ہو گئی' محض فریب نفس اور شیطان کی

کرشمہ سازی ہے۔

دوسرا سوال زیادہ اہم ہے۔ کیا چلہ کشی اور سخت اور شدید ریاضتوں سے دل اور روح میں نئی زندگی کروٹ لیتی ہے؟ علم و عرفان کا کوئی آفتاب تازہ سطح قلب پر طلوع ہوتا ہے' یا اخلاق و عادت کے چہرۂ زیبا پر حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے؟

## بدھ کا ذاتی تجربہ:

ہمیں عارف بدھ کی زبان میں کہنے دیجیے کہ یہ سب مشغلے بے سود ہیں' ان سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ اصل بیداری وہ ہے جو زندگی میں کچھ اصولوں اور نصب العینوں کو آزمانے اور برتنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر نصب العین صحیح ہے' اونچا ہے اور اس لائق ہے کہ قلب و ذہن کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر سکے' تو پھر اس کی راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان سے نمٹنا' ان سے عہدہ بر آ ہونا اصلی ریاضت ہے' اصلی چلہ کشی ہے۔ اگر نصب العین ہی صحیح نہیں' اس میں اس بات کی اہلیت ہی نہیں کہ ہماری مختلف ذہنی و فکری صلاحیتوں کو چمکائے اور سنوارے' تو ہزار ریاضت بھی بے کار اور بے مصرف ہے۔ اس سے قلب و روح کی دنیا میں کوئی خوش گوار تبدیلی رونما ہونے والی نہیں۔

دوسرے لفظوں میں روحانی و اخلاقی تبدیلی کا آغاز ہی خاص نقطہ نگاہ کو اپنانے سے ہوتا ہے' ایک خاص طرز عمل اختیار کر لینے سے نہیں۔ اگر یہ خاص نقطہ نگاہ ہم نے اپنا لیا ہے' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس اور اس کی تمام شورشوں پر ہم نے قابو پا لیا ہے' جذبات اور ان کی تمام طوفان خیزیوں کے آگے ہم نے ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی ہے' یہی نہیں' ایک سائنس دان کی طرح ہم اس لائق ہو گئے کہ نفس کی بے پناہ طاقت سے مفید تعمیری کام لے سکیں۔

رہبانیت پر ہمارا آخری اور منطقی اعتراض یہ ہے کہ:

یہ اصلاح کے صرف منفی "Negative" پہلو کی ترجمان ہے۔

حالاں کہ تعمیر و ترقی کے تقاضے' منفی اور مثبت (Positive) دونوں پہلوؤں کے متقاضی ہیں۔

* * *

## (۸)

# عیسائیت اور قرآن

## عیسائیت سے متعلق قرآن کا نقطہ نظر:

قرآن حکیم نے عیسائیت کو کس نظر سے دیکھا ہے؟ اس کا فکر و عقل کے کن پیمانوں سے جائزہ لیا ہے؟ بحث کے اس مرحلے میں ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے۔

عیسائیت کی بڑی بڑی گمراہیاں تین تھیں۔

☆ **تثلیث**

☆ **کفارہ** ------ اور

☆ **رھبانیت**۔

**تثلیث** نے عقائد و ایمان میں بگاڑ پیدا کیا اور ان نعمتوں سے انسان کو محروم رکھا جو توحید اور صرف توحید سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ یہی نہیں، قلب و روح کے ان لطائف اور زندگی کے ان زندہ منطقی نتائج اور اصولوں کی طرف سے اغماض برتا، جن کا حصول بغیر خدا کی وحدانیت کے اقرار کے ممکن ہی نہیں!

کفارے نے بے عملی کو رواج دیا اور شخصی ذمہ داری کے اصول کو نظر انداز کیا۔

رہبانیت نے زندگی کے جس نقشے کی داغ بیل ڈالی، اس میں اجتماعیت اور ارتقا کے فطری تقاضوں کی مخالفت پائی جاتی تھی۔ قرآن حکیم نے ان تینوں عقائد کے بارے میں اپنی جچی تلی رائے

ظاہر کی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ (المائدہ: ۷۳)

ان لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے، حالاں کہ اس معبود یکتا کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

کفارے کی تردید میں عملی زندگی کا ایک جانا بوجھا اصول پیش فرمایا:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (زمر: ۷)

اور کوئی بھی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا پائے گا۔

رہبانیت۔ پر اصولاً دو اعتراض وارد کیے جاسکتے تھے۔

○ ایک یہ کہ قدیم عیسائیت میں اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ یہ بدعت اور سراسر بعد کی اختراع ہے۔

○ دوسرے یہ کہ یہ ایسا التزام ہے جو غیر فطری ہے۔

اس لیے زندگی کے کارخانے کی تعمیر اس پر نہیں کی جاسکتی۔

قرآن نے اس مختصر آیت میں دیکھیے کس خوبی سے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (حدید: ۲۷)

اور رہبانیت! تو اس کی ایجاد کا سہرا ان کے سر ہے، ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ مگر انھوں نے خدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے آپ ہی اس کا التزام کر لیا۔ اور پھر جیسا ان کو نبھانا چاہیے تھا نباہ بھی نہ سکے۔

تاریخ صرف واقعات و حالات کے تکرار کا نام نہیں، بلکہ اس حقیقت سے تعبیر ہے کہ جس قوم یا گروہ کا آپ ذکر کر رہے ہیں، ان کی نفسیات بھی بیان کی جائیں۔

قرآن نے تاریخ کے اس علمی تقاضے کو بہ احسن وجہ پورا کیا ہے۔ اس نے صرف اس بات پر

اکتفا نہیں کیا کہ عیسائیت کی موٹی موٹی گمراہیوں کی نشان دہی کر دی جائے، بلکہ اس نے عیسائیوں کی نفسی کیفیتوں کو بھی واشگاف طور پر بیان کیا ہے اور مذہبی اور دینی مزاج کی بھی تعیین کی ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس سلسلے میں کسی تعصب، کسی پاس داری یا پچ کو جائز نہیں رکھا، بلکہ برائیوں کے پہلو بہ پہلو ان میں جو خوبیاں تھیں ان کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔

یہودیوں کی قساوت قلبی، سختی اور بغض و عناد کے بارے میں آپ گزشتہ بحثوں میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔

ان کے برعکس بعض عیسائیوں میں جو میانہ روی، رقت قلب و تاثر پذیری اور اہل حق کے لیے مودت و رافت کے جذبات پائے جاتے ہیں، ان کی ایک جھلک مندرجہ ذیل آیات میں دیکھیے۔

○ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ (مائدہ: ٦٦)

ان میں کچھ لوگ میانہ رو اور متوازن ہیں۔

○ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ (مائدہ: ۸۲)

"اور دوستی کے لحاظ سے ان لوگوں کو مومنوں سے قریب تر پاؤ گے جو عیسائی کہلاتے ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی، اور ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کبر و پندار کی عادت نہیں۔

○ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ (حدید: ۲۷)

اور جن لوگوں نے مسیح کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت و مہربانی ڈال دی۔

## تفاوت مزاج کی عقلی توجیہہ:

یہودیوں اور عیسائیوں میں نفسیات و مزاج کا یہ تفاوت کیوں ہے؟

یہودی کیوں سخت دل، متعصب اور تنگ نظر ہیں، عیسائیوں میں نسبتاً وسعت قلب، تاثر پذیری اور نرمی کے جذبات کی فراوانی کیوں پائی جاتی ہے؟

یہ سوال بہ یک وقت نفسیات اور فلسفۂ مذہب و قانون کے ایک طالب علم

کے لیے حد درجہ دلچسپ ہے۔

بات یہ ہے کہ کبھی تو کسی قوم کی طبیعت و مزاج کے تقاضے، قانون و شریعت کے سانچوں کی تشکیل کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ مزاج و طبیعت کی خصوصیات اس سے نمایاں اور پختہ ہو جاتی ہیں، اور کبھی قانون و شریعت کی اثر آفرینیاں اس درجہ شدید ہوتی ہیں کہ ان سے طبیعت و نفسیات کا رخ یکسر بدل جاتا ہے۔

چنانچہ یہودیوں میں قانون کی جو سختی دکھائی دیتی ہے وہ ان کی طبع شور پسند کا نتیجہ ہے۔۔۔۔۔۔ اور

عیسائیوں میں جو نرمی اور روا داری پائی جاتی ہے اسے ان کی تعلیمات کا اثر قرار دینا چاہیے۔

ان دونوں گروہوں میں باہمی روابط کا کیا عالم تھا، اور اختلاف و تحزب کے کن کن تعصبات کو انھوں نے پیدا کر رکھا تھا؟ قرآن نے اس پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ نجات اخروی کے سلسلے میں یہ کن طفلانہ خیالات کے حامل تھے اور گوناگوں گمراہیوں کے باوجود کن کن خوش فہمیوں کا شکار تھے۔

○ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ط۔ (مائدہ: ۱۴)

اور ہم نے ان میں قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ ڈال دیا ہے۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ط (مائدہ: ۶۴)

"اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے بغض و عداوت ڈال دی ہے۔"

○ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط (بقرہ: ۱۱۳)

اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی ٹھیک راہ پر گامزن نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی جادۂ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ دونوں کتاب الٰہی پڑھتے ہیں۔

○ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ

(بقرہ: ۱۱۱)

یہودی اور عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جائے گا۔ یہ ان لوگوں کے خیالات باطل ہیں۔

## نجات اور فلاح اخروی میں فرق عیسائیوں کی خوش فہمی کا تجزیہ:

اسلام نے فلاح و کامرانی میں اخروی نعمتوں سے بہرہ مندی کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث تو آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کے ضمن میں آئے گی، یہاں عیسائیوں اور یہودیوں کی اس خوش فہمی کا مختصر سا تجزیہ ہونا چاہیے جو نجات کو ان دونوں گروہوں میں منحصر سمجھتے تھے۔

یہاں پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام کے سامنے جو مسئلہ ہے وہ نجات بنی آدم کا نہیں، بلکہ بنی آدم کے ارتقاو تقدم اور حیات و زندگی جاوید کا ہے۔ نجات کا محدود اور سمٹا ہوا تصور فطری اثم (Orignal Sin) ایسے غیر منطقی عقیدے کی پیداوار ہے۔

دوسرا قابل لحاظ نکتہ یہ ہے کہ اسلام فلاح و کامرانی کا جو نقشہ پیش کرتا ہے، اس کا آغاز اسی زندگی سے ہو جاتا ہے، اور موت کے بعد جسم و روح کی جن کامرانیوں اور نعمتوں کا وعدہ ہے، وہ کوئی بالکل ہی الگ اور اس زندگی سے منقطع شے نہیں، بلکہ اسی حیات دنیوی کی مسلسل اور مربوط کڑیاں ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اسلام جسم و روح کی ان نشاط آفرینیوں کا نام لیبل اور تعصب و پندار میں منحصر نہیں جانتا، بلکہ اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ اگر قلب و روح کی جلا چاہتے ہو، اگر آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کی خواہش و آرزو رکھتے ہو تو اس کے لیے صرف انتساب کافی نہیں، بلکہ کچھ ایسے حقائق ہیں جنھیں روز مرہ کی زندگی کا جز بنانا پڑے گا۔ یہی نہیں، اجتماعی زندگی کی کچھ کٹھن منزلیں ہیں جن میں سے گزرنا ہو گا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا۔ (بقرہ: ۲۱۴)

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ یوں ہی بہشت میں داخل ہو جاؤ گے، ابھی تم کو پہلے لوگوں کی مشکلیں تو پیش آئی ہی نہیں۔ ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور صعوبتوں میں ہلا ہلا دیے گئے۔"

## (۹)

# صابئین کا گروہ

## صابئین کی تاریخ‘ عقائد اور ثقافت پر ایک نظر!:

نزول قرآن کے وقت جن مذہبی گروہوں کا چرچا تھا‘ ان میں صابئین بھی تھے‘ سورہ بقرہ اور سورہ حج میں دوسرے فرقوں کے ضمن میں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کون لوگ تھے؟ ان کے افکار و اعمال کی تفصیلات کیا ہیں؟ ان کو اہل کتاب میں شمار کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور کن مذہبی صحائف پر ان کے عقائد و نظریات کی عمارت استوار ہے؟ یہ تمام امور مشرق و مغرب کے اہل علم میں مابہ النزاع ہیں۔۔ کچھ لوگ انھیں حضرت نوح علیہ السلام کا پیرو بتلاتے ہیں۔ کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں‘ بعض کا کہنا ہے کہ یہ عیسائیت ہی کی ایک شاخ تھی‘ جو سینٹ جان کو اپنا رہنما قرار دیتی تھی۔

عرب مورخین نے بہت کچھ ان کے بارے میں لکھا ہے‘ خصوصاً شہرستانی نے خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے خدوخال کی ٹھیک ٹھیک تعیین نہیں ہو سکی۔

تازہ ترین تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بصرے کے قریب اب بھی کوئی دو ہزار کے لگ بھگ ایسے قبائل ہیں جنھیں صابی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ چوں کہ ان پڑھ ہیں اور نام کے صابی ہیں اس لیے نہیں بتا سکتے کہ ان کی تہذیبی اقدار کیا ہیں‘ ان کا کیا ماخذ ہے اور ان کے آباؤ اجداد فکر و

عقیدے کی کن نوعیتوں کے حامل تھے۔ یہ مرنجاں مرنج اور بے ضرر قسم کے لوگ ہیں اس لیے اب بھی مسلمان قبائل کے ساتھ ان کے تعلقات خوش گوار ہمسایہ قبائل کے سے ہیں۔ ان سے متعلق تحقیقی انداز میں کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ وہی صابی ہیں جو قرآن کے مخاطب و منطوق ہیں یا کوئی دوسرا گروہ ہے۔

پرانے زمانے میں حضرت مسیح سے کوئی سات آٹھ سو برس پہلے، یمن میں انھوں نے کامیاب حکومت قائم کر رکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے عربوں پر ان کے اثرات کا کیا عالم رہا ہو گا۔

جو باتیں مستشرقین اور مسلمان محققین کی تحقیق و کاوش کے نتیجے میں ان سے متعلق اب تک منظر عام پر آ سکی ہیں، وہ اختصار کے ساتھ یہ ہیں کہ:

۱۔ یہ ایک قدیم باطنی نوع کا مذہب تھا، جو زندگی کے اسرار و رموز کو جاننے کا مدعی تھا۔ آرامی زبان میں کتاب غنزا (Ginga) کا بھی پتا چلتا ہے جس کو یہ الہامی مانتے تھے۔

۲۔ یہ عموماً آگ پرست تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمات کا یہ حصہ زرتشت کے فلسفۂ "نور و ظلمت" سے متاثر ہے اور غالباً یہی وہ حصہ ہے جس کی وجہ سے عرب مشرکین نے "ستارہ پرستی" کے رجحان کو اپنایا۔ چنانچہ ان کے صنمیات میں جو "شعریٰ" کا ذکر آیا ہے، وہ اسی مناسبت سے ہے۔

قرآن نے ان کے اس رجحان کی سورہ "نجم" میں واضح طور پر تردید کی ہے:

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (النجم: ۴۹)

اور وہی شعریٰ کا بھی پروردگار ہے۔

ستاروں کی اثر آفرینیوں کے بارے میں آج سے ہزاروں برس پیشتر انسان نے عقائد و افکار کے مختلف افسانے تراش رکھے تھے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پرستش اول اول اس خیال سے شروع ہوئی کہ یہ انوار الٰہی کی تجلیات ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو جسمانی معنوں میں نور مانا جائے گا، جیسا کہ ان قدیم بت پرستانہ مذاہب نے مانا تو پھر قدرتاً، نجوم و کواکب سے بڑھ کر کوئی چیز انھیں نہ مل سکے گی جو اس نور کا مظہر ہو، جو اس کی ضیا گستریوں کی کامیاب ترجمانی کر سکے اور بتا سکے کہ اس نور بحت اور ضیائے

محض کا کیا عالم ہے، جو نجوم و کواکب کے پیچھے تجلی فرما ہے۔ قرآن نے بھی اللہ تعالیٰ کو نور تسلیم کیا ہے، مگر ان معنوں میں نہیں کہ وہ کوئی مادی و جسمانی قسم کی روشنی ہے بلکہ ان معنوں میں کہ اس کا وجود و اثبات ایسی روشن حقیقت ہے کہ اس کو مان لینے کے بعد کائنات کے بارے میں فکر و عقیدے کی تمام ارضی و سماوی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں اور وہ تمام مشکلات اور عقیدے حل ہو جاتے ہیں جو نہ ماننے کی صورت میں ابھرتے اور پیدا ہوتے ہیں۔

صابئین کی ستارہ پرستی ہی نے ان لوگوں کو علم النجوم کی اہمیتوں کی طرف متوجہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فلسفۂ دین میں "علم النجوم" کو خاص مقام حاصل ہے اور ان میں کئی نامور علما گزرے ہیں، جنھوں نے اس فن کو بہت ترقی دی ہے۔ سات بڑے بڑے ستاروں کا تصور، ان کی منزلوں کی تعیین، سات کے عدد کی تقدیس، صابی علما ہی کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔

(۳) ان کا خیال تھا کہ ہر ہر شے کا ایک رب النوع ہے، جس کی نگرانی، ہدایت اور کار فرمائیوں سے ہر ہر شے تکمیل و ارتقا کی طبعی منزلیں طے کرتی ہے۔ یہ تصور انھوں نے یونانیوں سے لیا ہے، جن میں کا ایک گروہ اس عقیدے کا خاص طور پر مبلغ و داعی تھا۔ ان کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ خاص قسم کی ارواح ہیں اور "خدا" سب سے بڑی روح ہے جو ان سے کام لیتی ہے۔

(۴) یہ سور کو حرام سمجھتے تھے، کتوں اور شکاری پرندوں کو بھی ذبح کرنا اور کھانا ممنوع قرار دیتے تھے ــــــ اور تو اور، کبوتر بھی ان کے ہاں حرام جانوروں کی فہرست میں داخل ہے۔

(۵) ختنے کے قائل نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمی تعلیمات کا ان پر کوئی اثر نہیں تھا۔

(۶) یہ عجب اتفاق ہے کہ طلاق کے متعلق ان کا طرز عمل نہایت درجہ ترقی پسندانہ تھا۔ یعنی آج سے ہزاروں برس پہلے یہ لوگ اس حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے کہ فیصلے کا حق مرد کو نہیں، اور جب تک حاکم وقت اس بات کی تصدیق نہ کر دے کہ طلاق دینے والا، اس معاملے میں حق بجانب ہے، اس وقت تک مرد و عورت میں علیحدگی نہ ہونی چاہیے۔

(۷) اصطباغ کو یہ تبدیلی مذہب کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے عیسائیت نے یہ رسم انھی سے لی ہے۔

افسوس ہے تاریخ نے ان کے بارے میں زیادہ فیاضی سے کام نہیں لیا' اس لیے تحقیق سے دعویٰ نہیں کیا سکتا کہ جاہلیت میں عربوں کی اجتماعی و فکری زندگی کے کون کون سے گوشے ان لوگوں کے نظریات سے خصوصیت سے متاثر ہوئے۔

نزول قرآن کے بعد دو تین صدیوں میں ان لوگوں نے اسلامی فرقوں کے خیالات و افکار کی سمتوں کو کس حد تک بدلا۔ یہ ہمارا موضوع نہیں۔ اس سلسلے میں مبتدع شیعی فرقوں کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو نہایت ہی دلچسپ حقائق فکر و نظر کے سامنے آئیں گے' جن کی تفصیل کے لیے شہرستانی' اور ابن حزم کی "**ملل والنحل**" کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہو گا۔

* * *

## (۱۰)

# مشرکین اور ان کے افکار و عقائد

## مشرکین مکہ:

چوتھا گروہ جس کو خصوصیت سے قرآن نے مخاطب کیا' مشرکین مکہ ہیں۔ شرک کے معنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک و سہیم قرار دینے کے ہیں' اور مشرکین معنی کے لحاظ سے وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اس جرم کا ارتکاب کریں۔ لیکن قرآن کی اصطلاح میں مشرک ایک فرقہ' مذہب اور طائفہ سے تعبیر ہے جو علاوہ مشرکانہ ذہنیت کے زندگی کے بارے میں ایک خاص طرز فکر رکھتا ہے' جو مخصوص روایات کا حامل ہے' جس کے اپنے تعصبات و عقائد ہیں' رسوم و عوائد ہیں اور جو اپنے آباو اجداد کی تقلید و اتباع پر نازاں ہے۔ مزید براں جو ایک خاص طرح کی شان ارستقراطیت (Aristocrary) لیے ہوئے ہے۔

مشرکین' اہل کتاب اور کفار سے علیحدہ اپنا ایک وجود (Entity) رکھتے ہیں۔ اس کے لیے قرآن کی شہادت ملاحظہ ہو:

مَایَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ
عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ: ۱۰۵)

جو لوگ کافر ہیں' اہل کتاب یا مشرک وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم پر

تمہارے پروردگار کی طرف سے خیر و برکت نازل ہو۔

وَلَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (بینہ:۱)

”جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک وہ باز آنے والے نہ تھے‘ جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی۔“

یوں بھی قرآن جب ان تعلقات سے بحث کرتا ہے جو اہل کتاب کے کفرو شرک کے باوجود ان سے استوار کیے جاسکتے ہیں تو مشرکین کو وہ ان کا سزاوار قرار نہیں دیتا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ط وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (بقرہ:۲۲۱)

اور مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں‘ نکاح نہ کرنا۔ کیوں کہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے‘ اس سے اللہ کی بندی جو مومن ہے‘ کہیں بہتر ہے‘ اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائے مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا‘ کیوں کہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے‘ عبد مومن کہیں بہتر ہے۔

اسی طرح جب اہل کتاب کو ”کلمہء سواء“ کی طرف بلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آؤ! اختلافات کے باوجود کچھ تعاون و اتحاد کی صورتیں پیدا کریں‘ تو مشرکین کے معاملے میں قرآن اس رواداری کو جائز نہیں سمجھتا‘ بلکہ ان سے صاف طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ بت پرستی اور توحید میں کوئی بیچ کی راہ نہیں‘ کوئی مصالحت کی صورت نہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ○ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ (سورہ کافرون:۱)

اے پیغمبر! ان منکرین توحید سے کہہ دو کہ اے کافرو! جن بتوں کو تم پوجتے

ہو، ان کو میں نہیں پوجتا اور جس خدا کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے اور جن اصنام باطلہ کی تم پرستش کرتے ہو، میں کبھی بھی ان کی پرستش کرنے والا نہیں، اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے ہو، جس کی میں بندگی کرنے والا ہوں۔ تم اپنے دین پر اور میں اپنے دین پر۔

## ان کا فلسفۂ حیات:

زندگی کے بارے میں ان کا فلسفۂ حیات بالکل وہی تھا، جو آج یورپ کا ہے، یا جو قدیم یونانی حکیم ایپقور (Epicupas) کا تھا۔ آخرت کی باز پرس اور ثواب و عقاب کو یہ لوگ محض ڈھکوسلا سمجھتے تھے، اور برملا کہتے تھے کہ اس دنیوی اور جسمانی زندگی کی عیش کوشیوں کے سوا اور کسی شے کی حقیقت نہیں، اور کوئی عالم بالا نہیں، کوئی عقبیٰ نہیں۔

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ○

(المومنون: ۳۷)

اور کہتے ہیں کہ ہماری جو دنیا کی زندگی ہے بس یہی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں کیے جائیں گے۔

وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَا اِلَّا الدَّهْرُ۔ (الجاثیہ: ۲۴)

اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاکت کی تاریکیوں میں پھینکنے والا زمانہ یا دہر ہے۔

دہر کی ہلاکت سے غالباً ان کی مراد یہ تھی کہ زندگی و موت کا یہ کارخانہ کسی مصلحت، کسی غرض، اور کسی اخلاقی و روحانی نصب العین کے تابع نہیں، بلکہ یہ وقت و زمان کی مناسبتیں ہیں، جو سطح وجود پر زندگی کے نقوش ابھارتی اور ختم کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا جب کوئی نقش لوح وجود پر مرتسم نہیں رہتا، اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی اور عالم میں اس کا مثنی یا ہم مثل موجود ہے۔ جس کو جزا و سزا کی ذمہ داریوں کا سامنا کرنا ہے۔ بلکہ اس کے سمٹنے کے معنی کلیتہً ناپید ہو جانے اور ختم ہو جانے کے ہیں۔

جس طرح آج کل کی مادیت زندگی کو غیر روحانی شے سمجھتی ہے اور یہ رائے رکھتی ہے کہ یہ مادہ ہی کی ترتیب و امتزاج سے تعبیر ہے۔ ٹھیک اسی طرح مکہ کے یہ مشرک زندگی کے اس غیر روحانی تصور کے قائل تھے اور قرآن کہتا تھا کہ:

> "تمھیں پھر حیات اخروی سے دوچار ہونا ہے، اور عقائد و اعمال کے سلسلے میں جواب دینے کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے۔"
>
> تو یہ تعجب سے پوچھتے تھے کیا:
>
> ایسا ہونا ممکن ہے؟ کیا گوشت پوست کا یہ بنا ہوا پیکر خاکی، پھر زندہ ہو سکے گا جب کہ اس کی ہڈیاں گل سڑ کر ختم ہو چکی ہوں گی؟
>
> قَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا۝
>
> (بنی اسرائیل: ۴۹)
>
> اور کہتے ہیں جب ہم مر کر بوسیدہ ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے، تو از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے۔

## انکار آخرت کی توجیہہ:

ہم نہیں کہہ سکتے کہ آخرت سے متعلق یہ نقطہ نظر کسی فلسفیانہ تاثر کا نتیجہ تھا یا زندگی کی نشاط آفرینیوں نے انھیں اس راستے پر ڈال دیا تھا۔ بہرحال اتنا قطعی ہے کہ مشرکین مکہ زندگی کو عقبیٰ و آخرت تک وسیع نہیں سمجھتے تھے اور اس کے پھیلاؤ کو اس درجہ محیط اور اس درجہ حاوی نہیں مانتے کہ اس میں مابعد الموت کی جاودانیوں کے لیے کوئی گنجائش نکل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جب اس عقیدے کو پیش کیا کہ:

> "حیات اخروی کے معاملے میں موت کوئی فیصلہ کن شے نہیں ہے بلکہ زندگی رواں دواں ہے اور تغیر پذیر ہے، متحرک ہے، تمھیں بہرحال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر جزا و سزا کے مرحلوں سے گزرنا ہے۔"

تو اس سے ان میں نہ صرف، تعجب و استہزا کے جذبات ہی پیدا ہوئے، بلکہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرز فکر سے تو عیش کوشیوں اور طرب آفرینیوں کی وہ بساط ہی الٹ جاتی ہے جس کو انھوں نے صدیوں سے معاشرے میں بچھا رکھا تھا۔ زندگی کا وہ رخ اور مزاج ہی بدل دیا جاتا

ہے جس پر کہ خمر و قمار کی دلچسپیاں قائم تھیں۔ آخرت کو مان لینے کے بعد بھلا ناؤ نوش کی وہ کیفیتیں کیوں کر باقی رہ سکتی تھیں، جن کی رنگینیوں کا نقشہ شعرائے جاہلیت نے کھینچا ہے۔ آخرت زندگی کا نصب العین چاہتی ہے، پابندی اخلاق کی طالب ہے، واجبات اور فرائض کے ایسے دستور اور نظام کی خواہاں ہے جو دنیوی زندگی کے پہلو بہ پہلو حیات اور مابعد الموت کی مسرتوں میں اضافہ کا موجب ہو سکے۔۔۔۔ اور ذمہ داری کی یہی وہ صورتیں ہیں جو عربوں کی خوئے آزادی پر بار تھیں۔

عربوں کے انکار بعثت کی ایک قابل فہم توجیہہ یہ بھی ممکن ہے کہ آخرت کا عقیدہ ذہنی اور اجتماعی زندگی کے اس ارتقائی مرحلے پر ابھرتا ہے جب کہ قومیں اور روز مرہ کی زندگی میں قانون و شریعت کے تقاضوں کو نافذ اور جاری و ساری دیکھتی ہیں اور عرب چوں کہ اس وقت تک حضارت و تمدن کے اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئے تھے جہاں قانون و شریعت کے خانے حرکت میں آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلہ و جزا کا ہمہ گیر خیال پیدا ہوتا اور ابھرتا ہے، اس لیے حیات مابعد الموت کا کوئی تصور ان میں اگر پایا نہیں جاتا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

## عوائد و رسوم:

ان کی رسمیات و عوائد کا کیا انداز تھا؟ ادب و تاریخ کی کتابوں میں اس کی تفصیلات کا خصوصیت سے ذکر ملتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں جن امور کی نشان دہی کی ہے اور جن حقائق کی پردہ کشائی فرمائی ہے، ان سے ان کے مشاغل و ذوق کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ لوگ پڑھے لکھے نہیں تھے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ (آل عمران: ۲۰)

اور اہل کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دیجیے کیا تم فرمان بردار بنتے ہو اور اسلام لاتے ہو۔

اس بنا پر ان کی مصروفیات اور دلچسپیوں کا سلسلہ وہی ہو سکتا ہے جو ان پڑھ قوموں کا قدرتی طور پر ہوتا ہے اور عوائد و رسوم کا نقشہ بھی بعینہ وہی ہوگا جو ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو علوم و فنون سے ناآشنا اور تہذیب و تمدن کی لطافتوں سے بے گانہ ہوں۔

شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی' جوئے اور قمار سے فطری مناسبت تھی اور بت پرستی قومی شعار۔ ان مشغلوں نے اعتماد علی النفس کی قوتوں کو اس درجہ کمزور کر دیا تھا اور ضعیف الاعتقادی نے طبائع پر اس حد تک قابو پالیا تھا کہ پانسوں اور تیروں سے قسمت کی نیرنگیوں کا اندازہ کرتے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (مائدہ: ۹۰)

اے ایمان والو! شراب اور جواء اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں۔"

ایک طرف قبائلی عصبیتیں انھیں جنگ و پیکار پر ہمیشہ آمادہ رکھتی تھیں:

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً (آل عمران: ۱۰۳)

اور یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔

دوسری طرف حج کی رعایت سے یہ عقیدہ بھی دلوں میں جاگزیں تھا کہ سال میں چار مہینے کم از کم ایسے ہیں جن میں کسی نوع کی دشمنی اور عداوت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (توبہ: ۳۶)

ان میں چار مہینے ادب کے ہیں۔

اس وجہ سے سخت مشکل میں تھے۔ اگر ان چار مہینوں میں طبع جنگ جو کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں تو آداب حج میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ تاخیر روا رکھتے ہیں تو دلوں کے کینے سرو پڑ جاتے ہیں۔ اس مشکل سے عہدہ برا ہونے کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟

یہ تھا ایک اہم سوال جس نے جاہلیت و کہانت کے علم برداروں کو پریشان کر رکھا تھا۔ شیطان نے بالآخر ایک صورت سجھا ہی دی اور وہ یہ تھی کہ:

کیوں نہ تقویم اور کیلنڈر ہی کو ہر سال حسب منشا بدل لیا جایا کرے۔

اس کو اصطلاح میں "نَسِی" کہتے ہیں۔ عملی صورت یہ ہوتی کہ:

اگر محرم میں مثلاً: لڑنا ضروری ہوتا تو ان میں کا ایک سربراہ ایام حج میں پکار کر کہتا کہ:

"اب کی محرم میں جنگ و پیکار حلال ہے اور اس کے بدلے میں صفر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔"

اس پر قبائل کا سمجھوتہ ہو جاتا اور لڑائی محرم میں شروع ہو جاتی۔

قرآن نے حیلہ جوئی کی اس عادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

إِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا (توبہ ۳۷)

ادب کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرنا ہے۔ اس سے کافر گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔

حج ہی کے متعلق ان کے دو لطیفے اور ملاحظہ ہوں:

ان کا کہنا تھا کہ طواف کعبہ ایسی حالت میں ہونا چاہیے کہ جسم لباس کی منت پذیریوں سے بالکل آزاد ہو۔

قرآن نے ان کے اس خیال کی تردید کی اور فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ (اعراف: ۳۱)

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت زینت و آرائش کے تقاضوں کا خیال رکھو۔

دوسرا وہم ان کا یہ تھا کہ حج سے واپسی پر گھروں میں بجائے دروازوں کے 'پچھواڑے سے دیوار پھاند کر آنا چاہیے۔

قرآن نے زحمت بے جا کی اس صورت سے منع کیا اور بتایا کہ اس تکلف میں دین و دنیا کا کوئی فائدہ مضمر نہیں۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (بقرہ: ۱۸۹)

اور نیکی اس بات میں نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ' بلکہ نیکو کار وہ ہے جو پرہیز گار ہو' اور گھروں میں ان کے دروازوں

سے آیا کرو۔

کھانے پینے اور حلال و حرام کے بارے میں' ان کے عقائد و افکار کی بو العجمی مطالعہ کے لائق ہے۔

اگر ذبح کے وقت جانور کے پیٹ سے زندہ بچہ برآمد ہوتا تو کہتے کہ:

اس میں صرف مردوں کا حصہ ہے' عورتوں کا نہیں' اور اگر سوئے اتفاق سے بچہ مردہ نکلتا تو اس کو مرد و زن دونوں رغبت سے کھاتے۔

وَقَالُوْا مَافِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓی اَزْوَاجِنَا وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ (بقرہ: ۱۳۹)

اور یہ بھی کہتے کہ جو بچہ جو ان چار پایوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں کو اس کا کھانا حرام ہے اور اگر وہ بچہ مرا ہوا ہے تو سب اس میں شریک ہیں۔

کچھ جانوروں پر سوار ہونا ممنوع سمجھتے:

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا (انعام: ۱۳۸)

اور کچھ جانور ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا منع کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح کھیتی اور زرعی پیداوار میں کچھ حصوں کے استعمال کو حرام سمجھتے۔

وَحَرْثٌ حِجْرٌ (انعام: ۱۲۸)

اور یہ کھیتی منع ہے۔

غرض مشرکین مکہ عجیب و غریب اوہام میں مبتلا تھے اور ایسی ایسی رسموں اور پابندیوں کو انھوں نے انگیز کر رکھا تھا کہ جن کے لیے فکر و عقل کی روشنی میں کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جا سکتی۔

## بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام:

ان عجیب و غریب رسوم میں جن کے لیے عقل و خرد کے لحاظ سے کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، اور حام کا احترام و توقیر بھی ہے۔۔۔۔۔۔ بت پرستی کا جذبہ بھی کن کن خرافات کو رواج دیتا ہے اور توہین آدمیت کی کن کن نئی صورتوں کو جنم دیتا ہے۔ مشرکین کی سب بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ یہ بے جان پتھر اور بے شعور حیوانات میں تو تقدیس و احترام کے عناصر کو خواہ مخواہ ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ مگر اس شرف، اس بزرگی اور عظمت کا سراغ نہیں لگا پاتے جو خود انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور جو خود ان کی عقل و فکر کی کروٹوں میں مضمر ہے، یعنی انسان کے سوا، ہر ہر شے قابل احترام ہے، لائق صد ادب و تعظیم ہے، اور پوری کائنات میں یہی بدنصیب ایسا ہے جو کسی اعزاز اور کسی تکریم کا مستحق نہیں۔

بحیرہ: عرب اس اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی بت کی نذر گردانتے اور بطور علامت کے اس کے کان پھاڑ دیتے۔ اس کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ اب اس کا دودھ عوام استعمال نہیں کر سکتے۔

سائبہ: اس اونٹنی کو کہتے، جسے بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا، اس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اس پر سوار نہیں ہونا چاہیے۔

وصیلہ: اس بکری کو کہتے ہیں جو اول عمر میں اوپر تلے، سات جڑواں، مادین بچے جنتی۔ اگر آٹھواں بچہ نر ہوتا تو اسے اللہ کے نام پر ذبح کر ڈالتے۔ اور اگر ایک مادہ اور ایک نر پیدا ہوتا تو اس کی بدولت یہ ذبح ہونے سے بچ جاتا اس بکری کا دودھ عورتیں نہیں پی سکتی تھیں اور اس کو نہایت درجہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حام: اس کا اطلاق اس طویل العمر اونٹ پر ہوتا تھا، جس کی نسل کا دائرہ وسیع تر ہو۔ اس کا بھی احترام کیا جاتا تھا۔ احترام کی شکل یہ تھی کہ نہ اس کو ذبح کیا جاتا نہ اس کی اون سے استفادہ کیا جاتا، اور نہ اس سے سواری کا کام لیا جاتا تھا۔

قرآن حکیم نے صنمیات کی ان تمام صورتوں کو ایک ہی آیت میں جمع کر دیا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا

یَعْقِلُوْنَ۔ (مائدہ: ۱۰۳)

خدا نے نہ تو بحیرہ کو کوئی اہمیت دی ہے، نہ سائبہ کو کسی توقیر کا مستحق جانا ہے، نہ وصیلہ کی تقدیس کا حکم دیا ہے اور نہ حام کی پرستش کی اجازت بخشی ہے۔ اس معاملے میں کافر خدا پر جھوٹ افترا کرتے ہیں، اور ان میں کے اکثر عقل و خرد کے تقاضوں سے محروم ہیں۔

حیوانات میں ان خاص خاص صورتوں کو جو ان مشرکین مکہ نے ادب و احترام کے لیے اختیار کر رکھی تھیں، دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اسے یہ تعلیمات ابراہیمی کا نتیجہ قرار دیتے تھے، حالاں کہ شرک و بت پرستی کی اس تہذیب کو مٹانے کے لیے تو حضرت ابراہیم مبعوث ہوئے تھے اور جہل و نادانی کی تاریکیوں کو دور کرنے کی غرض سے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بھیجا تھا۔ اس آیت میں اس حقیقت کے پیش نظر ان اوہام و خرافات کی تردید کی گئی اور اسے سراسر افترا اور بہتان قرار دیا گیا ہے۔ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ بھلا ابراہیم ایسے موحد جو شمس و قمر کی ضیاگستریوں سے بھی متاثر نہ ہوئے اور یہ کہہ کر شرک کی ہر ہر صورت سے بے زار ہو گئے کہ

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ۔ (الانعام: ۷۶)

مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔

وہ ابراہیم، جنھیں بابل و نینوا کے اونچے اونچے اور عظیم ہیکل مرعوب نہ کر سکے، وہ حیوانات کی تقدیس و احترام کے قائل ہوتے تو کیوں کر؟

اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفاً وَّلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔

(النحل: ۱۲۰)

بے شک ابراہیم کو لوگوں میں امامت کا درجہ حاصل تھا، وہ اللہ کے فرمان بردار بندے تھے جو توحید کے معاملے میں ایک طرف رہے اور مشرکوں میں نہ تھے۔

## لڑکیوں سے تنفر:

عوائد و رسوم کا باب نامکمل اور تشنہ رہے گا اگر اس میں ان کے اس تنفر کا ذکر نہ کیا جائے جو ان کو لڑکیوں سے تھا۔ اور اس بے رحمی اور شقاوت کی وضاحت نہ کی جائے کہ یہ لوگ افلاس

کے اندیشے سے لڑکیوں کو زندہ گاڑ آتے تھے‘ گلا گھونٹ دیتے تھے اور جان سے مار ڈالتے تھے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ (تکویر: ۸‘ ۹)

اور اس کی لڑکی سے جو زندہ دفن کر دی گئی ہو‘ پوچھا جائے گا کہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کر دی گئی۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِیْمٌ ○ یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَابُشِّرَ بِهٖ اَیُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَایَحْكُمُوْنَ (نحل: ۵۹)

حالاں کہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے‘ تو اس کا منہ غم کے سبب کالا پڑ جاتا ہے اور اس کے دل کو دیکھو تو وہ اندوہناک ہو جاتا ہے اور اس خبر بد سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے۔ دیکھو! ان کا فیصلہ بہت برا ہے۔

معلوم ہوتا ہے لڑکیوں کے بارے میں یہ ظالمانہ طرز عمل اول اول ان کی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ابھرا اور غیرت و حمیت کے جاہلانہ تصورات اس کے بعد اس فعل شنیع کو حق بجانب ٹھہرانے کی غرض سے پیدا کر لیے گئے۔

ان کی اقتصادی بدحالی کا تفصیلی نقشہ کیا تھا؟ اور کون کون قبائل خصوصیت سے افلاس و محرومی کا شکار تھے؟ قرآن نے ان تفصیلات کو بیان نہیں کیا۔ لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے کچھ چیدہ چیدہ اشخاص تو کاروبار کی فراوانیوں سے ضرور مالامال تھے‘ لیکن عام قبائل کی یہ حالت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ آخر ایسی وادی غیر ذی زرع‘ جس میں دریا نہ ہوں‘ نہریں نہ ہوں اور جو ابر و سحاب کی کرم فرمائیوں تک سے محروم ہو‘ زندگی کی مادی آسائشوں کو مہیا کرے‘ تو کس طرح؟ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اکثر قبائل ہمیشہ سخت قسم کی بدحالی کا شکار رہتے۔

ظاہر ہے ایسے معاشرے میں جہاں زندگی کی مادی آسائشیں عام نہ ہوں‘ بلکہ افلاس و بے اطمینانی کا دور دورہ ہو‘ عورتوں کے لیے عزت و توقیر کے جذبات نہیں پائے جا سکتے۔ کیوں کہ یہ

چیزیں تہذیب و تمدن کے ایک خاص دور کی متقاضی ہیں، جسے اسلام اور صرف اسلام کی تعلیمات ہی پیدا کر سکتی تھیں۔

لڑکیوں اور عورتوں سے تنفر و حقارت کے اس عقیدے میں ایک عجیب اور دلچسپ تناقض یہ تھا کہ یہ لوگ جہاں اپنے لیے اس انتساب کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے کہ انھیں کسی بد قسمت لڑکی کا باپ قرار دیا جائے، وہاں اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس منطق کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔۔ یعنی اس کے لیے بیٹیوں کے انتساب میں کوئی جھجک اور تضاد محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ برملا کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کے اس تناقض کو کھول کر بیان کیا ہے اور پوچھا ہے کہ اپنے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں، انصاف و عدل کے کس قاعدے کی رو سے درست ہے؟

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهٗ وَلَهٗ مَايَشْتَهُوْنَ ○ (النحل: ۵۷)

اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ان سے پاک ہے اور اپنے لیے بیٹے جو مرغوب و دلپسند ہیں۔

اَفَاَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ اِنَاثًا ط اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ○ (بنی اسرائیل: ۴۰)

کیا تمہارے پروردگار نے تم کو لڑکے دیے اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا۔ کچھ شک نہیں، تم بڑی نامعقول بات کہتے ہو۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ○ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۵۱، ۱۵۳)

دیکھو یہ اپنی جھوٹ بنائی ہوئی بات کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ کچھ شک نہیں یہ جھوٹے ہیں، کیا اس نے بیٹوں کی نسبت کو پسند کیا ہے۔

## ان کے تعصبات:

رہے ان کے تعصبات۔۔۔۔ یعنی مشرکین مکہ کن کن افکار و خیالات کے معاملے میں کٹر تھے اور کن کن امور میں علم و حیات کی جدید اقدار کے لیے اپنے سینے اور قلب و ذہن میں کوئی

گنجائش اور وسعت نہیں رکھتے تھے۔ ان امور و اقدار کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ تمام مشرک قوموں کی طرح انھیں بھی اپنے اصنام، اپنے آلہہ، اپنے خود ساختہ خدا پسند تھے، اسی طرح تمام بت پرست اقوام کی طرح انھیں بھی اپنے عوائد و رسوم پر غلو کی حد تک ناز تھا اور اپنے آباؤ اجداد پر پورا پورا بھروسا تھا۔ اس بارے میں کسی سمجھوتے اور تغیر کے یہ خواہاں نہیں تھے۔

چنانچہ قرآن جب بھی انھیں توحید کی صاف ستھری تعلیم کی طرف بلاتا اور ان کے آلہہ اور بتوں کی بیچارگی و بے بسی پر روشنی ڈالتا تو یہ پکار اٹھتے:

بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (بقرہ: ۱۷۰)

"ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔"

حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (مائدہ: ۱۰۴)

جس طریق پر ہم نے اپنے باپ داد کو پایا وہی ہمیں کافی ہے۔

اور ان کو یہی جواب دینا بھی چاہیے تھا اور باپ دادا کی تقلید اور پیروی پر اسی انداز سے اصرار کرنا ہی چاہیے تھا جس طرح اللہ کی توحید صرف ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ قلب و ذہن اور فہم و فکر کی ایسی کیفیت سے تعبیر ہے کہ جس سے حق اور سچائی کے لیے بے قراری بڑھے اور طلب و جستجو کی نئی نئی راہیں کھلیں اور کوئی تعصب یا پاس داری قبول صدق سے نہ روک سکے، ٹھیک اسی طرح شرک کا خاصہ اور طبیعت یہ ہے کہ اس سے قدامت پسندی، اندھی تقلید اور تنگ نگہی کے لوازم ابھرتے ہیں اور قلب و ذہن کے کواڑ اس سختی سے بند ہو جاتے ہیں کہ حق کی پذیرائی اور نفوذ کے لیے اس میں گنجائش ہی نہیں رہتی۔

نبوت کے بارے میں بھی ان کی رائے متعصبانہ تھی، ان کے نزدیک یہ منصب جلیل ایک طرح کا اعزاز تھا جس کے سزاوار صرف مکہ و طائف کے بڑے بڑے سردار ہی ہو سکتے تھے، آنحضرت نہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ○

(زخرف: ۳۰)

اور کہنے لگے کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں

نازل نہ کیا گیا۔

یہ بے وقوف کیا جانیں کہ ان دو بستیوں کا تو کیا مذکور اور ان کے بڑے بڑوں کی کیا بساط' پوری کائنات انسانی میں کوئی شخص ایسا نہ پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ پیدا ہو گا جو آنحضرت کی عظمت و شرف اور بزرگی و برتری کا حریف ہو سکے۔ نبوت وہ مقام ہے جہاں تکمیل بشریت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں' جہاں روح کی پرواز آخری منزلوں تک پہنچتی ہے اور قلب و ذہن کے آفاق انوار و تجلیات کی ان کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں جو صرف نبی ﷺ کا حصہ ہے۔ یہ ذات گرامی اگر عظیم نہیں تو پھر یہ وہ لفظ ہے جو ہرگز کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو گا۔

## صنمیات:

یوں تو ان کے صنمیات اور دیو مالا کا سلسلہ خاصا دراز ہے' جس سے سینکڑوں چھوٹے بڑے خداؤں کا سراغ ملتا ہے' جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے اور سیر و ادب کی دوسری کتابوں میں مذکور ہے' تاہم ان میں زیادہ اہم اور قابل ذکر اصنام صرف تین ہیں۔ لات' مناۃ اور عزیٰ۔

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی ○ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی ○ (نجم:۱۹'۲۰)

بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا اور تیسرے مناۃ کو۔ یہ بت کہیں خدا ہو سکتے ہیں۔

**لات:** ایک سفید اور منقش پتھر تھا جو طائف کے ایک مندر میں نصب تھا اور بنو ثقیف اسے اپنا خدا سمجھتے تھے۔

**عزیٰ:** مکہ و طائف کے درمیان ایک درخت کا نام ہے۔ قریش اور بنو کنانہ اس کی پرستش کرتے تھے اور مشکلات میں اسی سے مدد و نصرت کے خواہاں ہوتے تھے' چنانچہ غزوہ احد میں۔ جناب ابو سفیان نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے' ازراہ فخر و ناز کہا تھا:

لنا العزّٰی ولا عزّٰی لکم۔

ہمارا مددگار تو عزیٰ ہے' مگر تم عزیٰ کی اعانت سے محروم ہو۔

جناب حضرت خالد کے بازوئے بت شکن نے اسے گرایا اور اس کی خدائی و تقدس کے قلعے کو مسمار کیا۔

**مناۃ:** مکہ اور مدینہ کے درمیان قدید کے قریب ایک بت تھا۔ بنو خزاعہ، اوس اور خزرج کے قبائل اسے خدا سمجھتے اور اس پر طرح طرح کے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اس کے طلسم خداوندی کو حضرت علی نے توڑا۔

یہ سب بت مونث تھے، قرآن حکیم نے اس پر بڑے مزے کی چٹکی لی ہے:

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى۔ (نجم: ۲۱)

کیا تمھارے لیے بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اس تضاد فکر و عمل کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنے لیے تو یہ اولاد نرینہ پسند کریں اور لڑکیوں سے اس درجہ متنفر ہوں کہ انھیں زندہ زمین میں گاڑ دینے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں۔ لیکن خدا کے لیے بیٹیاں پسند کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ تقسیم و انتخاب کا یہ انداز غیر منصفانہ ہے۔

تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (نجم: ۲۲)

یہ تقسیم تو بے انصافی کی تقسیم ہے۔

اس مرحلے پر ایک بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ بت پرستی کے باوجود مشرکین مکہ ایک ایسے خدا کے قائل تھے جو ان سب پر فائق تھا اور جس کے اختیارات کا دائرہ ان چھوٹے چھوٹے آلہہ سے کہیں وسیع تر تھا، جس کے بارے میں ان کا یقین تھا کہ زندگی کی پیچیدگیوں میں وہی دست گیری کرنے والا ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً لَئِنْ اَنْجَانَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ (الانعام: ۶۳)

کہو بھلا تم کو جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں سے کون مخلصی دیتا ہے جب کہ تم اسے عاجزی اور تضرع سے پکارتے ہو اور کہتے ہو، اگر خدا ہم کو اس تنگی سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار ہوں۔

## (۱۱)

# آفتاب نبوت

### صبح سعادت:

افکار و رجحانات کی بوقلمونی اور ضلالت و گمراہی کی رنگا رنگی کا یہ تھا وہ تاریخی پس منظر جس میں آفتاب نبوت طلوع ہوا اور سیرت و عمل کی یہ تھیں وہ تاریکیاں جن کو اجالوں سے بدلنے کے لیے آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے۔

> هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (جمعہ: ۲)
>
> وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں پیغمبر بھیجا' جو خود بھی انسانی تعلیم کی منت پذیریوں سے آزاد ہے۔ اور جو ان کے سامنے آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں' اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اس تاریخی پس منظر کو ہم نے عمداً ذرا پھیلا کے پیش کیا ہے' اس لیے کہ اس کے بغیر آنحضرت کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا' خیالات کی کج روی اور گمراہی کی اس داستان پر ایک سرسری نظر پھر ڈال لیجیے۔ اور یہ دیکھیے کہ یہودیوں نے تغیر و تحریف کی کن کن بدعات کو رواج دیا' انبیاے سابقین کے پیش کردہ دین کی اصلی روح کو کیوں کر مسخ کیا اور کس طرح فقہ و

قانو کی جکڑ بندیوں کو دعوت دی۔

عیسائیت اور بالخصوص اس عیسائیت نے جس کو حضرت مسیح کی پیاری اور متصوفانہ تعلیمات کے ترجمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ کیوں کر تعسفی عیسائیت کا روپ دھارا' اور عقل و خرد اور منطق کی کھلے بندوں خلاف ورزی کی' کس طرح دنیا کو حقیر جانا' رہبانیت کی بنیاد ڈالی اور تہذیب و ثقافت کے حسین و دل آویز تقاضوں کا گلا گھونٹا۔

صابئین نے کس طرح کواکب پرستی کی تلقین کی اور اس دور کی قوموں میں کن پر اسرار طریقوں سے باطنیت کے فتنوں کو پھیلایا۔ اسی طرح مشرکین عرب کی نفسیات بھی ایک مستقل فرصت مطالعہ کی مقتضی ہیں۔ ان کے عقائد کی بوالعجبی' ان کی آزاد روی' ان کی مشرکانہ رسوم اور باپ داد کی تقلید و اتباع کے مطالعہ میں متعصبانہ روش' یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنھیں ایک ایک کرکے نظر و بصر کے گوشہ ہائے عبرت کے سامنے لانا چاہیے اور فیصلہ کرنا چاہیے کہ فتنوں اور گمراہیوں کے اس ہجوم اور بھیڑ سے۔ عہدہ برآ ہونے کے لیے کس پایہ کے پیغمبر کو منتخب کرنا چاہیے تھا' یا کس درجہ و عظمت کے انسان کو زینت آرائے مسند نبوت ہونا چاہیے تھا۔

زیادہ وضاحت سے یوں کہیے کہ لائق غور صرف یہ نکتہ ہے کہ: جب یہودی' عیسائی اور اس دور کی تمام اہم اور بڑی بڑی قومیں گمراہی کی اس منزل میں ہوں کہ ان کے سامنے کوئی منزل نہ ہو' کوئی واضح رہنمائی اور روشنی نہ ہو' جب اخلاق انسانیت کی ایک ایک قدر کو پامال اور مسخ کر دیا گیا ہو' جب عقل و شائستگی کے ایک ایک تقاضے سے روگردانی اختیار کرلی گئی ہو' جب فرد کا مقدر مشتبہ ہو' جب معاشرے کے ارتقا کی راہیں مسدود ہوں' مزید برآں جب شرک و بت پرستی کی بدولت شرف انسانیت معرض خطر میں ہو اور مقام آدمیت داغ دار ہو' تو ان غیر معمولی حالات میں اور تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے میں کس قسم کے پیغمبر کو مبعوث ہونا چاہیے تھا۔ ایسے پیغمبر کو جو اس ساری صورت حالات کا مقابلہ کرسکے اور اپنی دل آویز و محبوب شخصیت سے انسانیت کے لیے عملی طور پر مشعل راہ ہو سکے؟

یا ایک ایسے پیغمبر کو جو متن کتاب کے سوا حجیت و استناد کی اور کسی نعمت سے بہرہ مند نہیں؟

اس سوال پر زیادہ تفصیلی بحثیں تو آگے چل کر آئیں گی' یہاں ہم صرف اس حقیقت کا اظہار

کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ تاریخ و حالات کے جس پیچیدہ مرحلے میں مبعوث ہوئے‘ اس کا کھلا ہوا اور مبین تقاضا یہ تھا کہ:

آپ کی ذات اقدس اجتہاد و عمل اور فکر و سیرت کی تمام خوبیوں اور بلندیوں سے متصف ہوتی اور آپ کا منصب محض ایک ترجمان اور صرف ایک مبلغ کتاب کا نہ ہوتا‘ بلکہ آپ کی حیثیت اس سے کہیں اونچی اور ارفع ہوتی‘ علیہ الصلوۃ والسلام۔

## ابتدائی حالات:

آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ابتدائی حالات کیا ہیں؟ آپ نے کب منصۂ وجود پر جلوہ گری فرمائی اور کس خاندان کو اپنے شرف ولادت سے نوازا‘ طفولیت کا معصوم دور کیوں کر گزرا‘ جوانی اور شباب کے پاکیزہ مشغلوں نے کیا صورت اختیار کی اور پھر آپ کو عمر کی کس منزل میں عہدۂ نبوت پر سرفراز کیا گیا؟

اس کا کچھ ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ تفصیلات بلاشبہ اہم ہیں اور اس درجہ اہم ہیں کہ ان کے بغیر کوئی شخصیت‘ تاریخی شخصیت ہی قرار نہیں پاتی۔ مگر قرآن کے نقطہ نظر سے واقعات کی یہ تفصیل ضروری نہیں‘ اس لیے کہ قرآن شخصیتوں سے زیادہ ان حقائق سے تعرض کرتا ہے جس سے محض شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہدایت و ضلالت کے مابین فرق کی نوعیت کیا ہے؟ کون تصورات و نظریات صحیح ہیں اور کون صحیح نہیں؟ عملی زندگی کا نقشہ کیا ہے؟ خیر کسے کہتے ہیں اور شر پر قابو پانے کے کیا ذرائع اور وسائل ہیں جنھیں آزمانا اور بروئے کار لانا ضروری ہے؟

آپ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں قرآن حکیم کی تصریحات سے صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ:

> "آپؐ یتیمی کے عالم میں پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی سازگاریوں نے نہ صرف احساس کی ان تلخیوں سے محفوظ رکھا‘ بلکہ آپ کے لیے ہر طرح کی آسانیاں بھی مہیا کر دیں۔"

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (الضحیٰ:۶)

بھلا اس نے تمھیں یتیم پاکر جگہ نہ دی۔

آپ ؐ کا اسم گرامی کیا تھا، قرآن نے اس کی وضاحت فرمائی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط (الفتح: ۲۶)

محمد ؐ اللہ کے رسول ہیں۔

يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (صف: ۶)

میرے بعد آئیں گے، جن کا نام احمد ہو گا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک عرصے تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ (بلد: ۱-۲)

ہمیں اس شہر کی قسم، اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔

مکہ مکرمہ میں آپ کی زندگی کس ڈھپ سے گزری، کون لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہوئے اور کن کی جرأت و عمل نے اہل مکہ کے دلوں میں خوف و ہراس کے جذبات کو ابھارنے میں مدد دی۔؟

قرآن اس موضوع پر بھی براہ راست روشنی نہیں ڈالتا اور نہ تاریخ کے اس التزام کو ضروری ہی قرار دیتا ہے۔ مکی سورتوں کے مطالعہ سے البتہ کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے، اور کم از کم اتنا تو پتا چلتا ہے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ اس عرصے میں کن اصولی مضامین تک محدود رہا۔

معلوم نہیں مکی و مدنی سورتوں میں اس مسلمہ تفریق کی وہ حضرات کیا توجیہہ بیان کرتے ہیں جو استدلال و استنباط کو صرف قرآن کے الفاظ و حروف کی حد تک سمٹا ہوا سمجھتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کتاب تاریخ و واقعات سے بالکل الگ تھلگ غیر متاثر حقیقت سے تعبیر ہے۔

ہمارے نزدیک تو مکی سورتوں کے مضامین بول بول اور پکار پکار کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ:

> وحی الٰہی، اسلام اور قرآن ایک مخصوص نوع کی تاریخی ترتیب کے متقاضی ہیں اور ایک متعین تدریج کے خواہاں۔!

یہ بات ہم اس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ:

> اسلام اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اس حقیقت کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر قرآن میں مکی اور مدنی مضامین کی تفریق اور تنوع کی کوئی منطقی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔

## (۱۲)

# آنحضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی اور مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ

### ازواج مطہرات:

قرآن حکیم میں چوں کہ دنیوی و جسمانی زندگی کی اہمیتوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس ضمن میں انسانی فرائض و واجبات کا کیا نقشہ ہے، اس لیے یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت و رسالت کی گراں باریوں کے باوجود شادی کی اور ایک سے زائد بیویوں کو شرف زوجیت سے مفتخر ہونے کا موقع بخشا۔

یہ بیبیاں جنھوں نے کاشانۂ نبوت کو رونق بخشی، معمولی عورتیں نہیں تھیں۔ یہ ایسی خواتین تھیں، جن کی دینی و اخلاقی ذمہ داریاں عام عورتوں سے کہیں زیادہ تھیں۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (احزاب: ۳۲)

"اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔"

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ

تَطْهِيرًا۔ (احزاب: ۳۳)

اے پیغمبر کے گھر کی بیویو! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کا میل کچیل دور کر دے۔

ان کے لیے ضروری تھا کہ اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کے ساتھ عام بات چیت تک میں محتاط رہیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کا تعلق اس ذات گرامی سے ہے، جو عفاف و طہارت کے اعلیٰ ترین فرازوں پر فائز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دے رکھا تھا:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (احزاب: ۳۲)

بات چیت اور گفتگو میں عام نسوانی لوچ کا اظہار نہ ہونے پائے۔

ان کے لیے زینت و آرائش کی پابندیاں بھی دوسروں سے زیادہ تھیں۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى۔ (الاحزاب: ۳۳)

اور جس طرح پہلے اظہار تجمل کرتی تھیں، اس طرح زینت نہ دکھاؤ۔

یہ بھی ہدایت تھی کہ اپنی تگ و تاز کو صرف حریم نبوت ہی تک محدود رکھیں۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔ (احزاب: ۳۳)

اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔

سوال یہ ہے کہ کیوں۔؟ اس لیے کہ حریم نبوت میں رہنے کے معنی کسی چار دیواری میں محبوس ہو کر رہ جانے کے نہیں، بلکہ اس مرکز ہدایت میں رہ کر استفادہ کرنے کے ہیں، جہاں صبح و شام جبریل نازل ہوتا ہے، جہاں رات دن کتاب اللہ کی تلاوت ہوتی ہے، اور ہر آن اسوۂ رسول کی حکمت، قلب و ذہن کی جلا اور آسودگی کا باعث ثابت ہوتی ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (احزاب: ۳۴)

اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو، بے شک اللہ تعالیٰ باریک بین اور باخبر ہے۔

## ازواج مطہرات سے تعلق و رشتے کی نوعیت:

قرآن حکیم نے اس بات کو واضح نہیں کیا کہ آنحضرتؐ کی ازدواجی زندگی کے لطائف کیا تھے' تاہم اتنا قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ:

> اس کی بنیاد اور اساس' اشاعت و دین کے مرکزی نقطے پر رکھی گئی تھی۔

یہی وجہ ہے قرآن حکیم میں واضح تر انداز میں ازواج مطہرات سے کہہ دیا گیا تھا۔

> يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (احزاب: ۲۸' ۲۹)

> "اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواست گار ہو' تو آؤ! میں تمھیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح رخصت کر دوں' اور اگر تم اللہ اور اس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر کی طلب گار ہو' تو تم میں جو نیکو کاری کرنے والی ہیں' ان کے لیے اللہ نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

سوارہ احزاب کی یہ آیت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آنحضرتؐ اور ازواج مطہرات کے سامنے ازدواجی زندگی کا جو مقصد تھا وہ یہ تھا کہ:

> مل جل کر اللہ کے دین کو پھیلائیں اور اپنے عمل و کردار سے اس حقیقت کا ثبوت مہیا کریں کہ ہماری خواہشات کا اصل مرکز دنیا نہیں' آخرت اور اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

قرآن سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ازواج مطہرات کے بطن سے کیا کیا اولادیں ہوئیں اور ان میں سے کس کس کو خاندان نبوت کو بڑھانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ہاں اس حقیقت کی البتہ پردہ کشائی ہوئی ہے کہ آپ کی اولاد نرینہ میں کوئی بھی زندہ نہیں رہا۔

> مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيّٖنَ ط (احزاب: ۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے پیغمبر اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔ (ﷺ)

## تعدد ازدواج اور مستشرقین کی شوخیاں:

آپؐ کی حیات طیبہ کے اور کون کون سے پہلو لائق توجہ ہیں اور آپ کی سیرت و کردار کے کن کن گوشوں پر قرآن نے روشنی ڈالی ہے؟ اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ہمیں اجازت دیجیے کہ آپؐ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں مستشرقین نے جن شوخیوں اور خیرہ چشمیوں کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا اظہار چند الفاظ میں کر دیں اور بتا دیں کہ ان کے مقابلے میں اسلام کا کیا موقف ہے۔!

یہ عجیب بات ہے کہ جہاں تک آنحضرت کی اخلاقی بلندیوں کا تعلق ہے، اس کے بغیر کسی استثنا کے سب معترف ہیں، یا کم از کم آپ کے انداز زیست کے دوسرے گوشے، ایسے حسین، ایسے متوازن اور روشن ہیں کہ باوجود تلاش و تفحص اور تعصب کے بھی مستشرقین کو موقع نہیں ملتا کہ ان پر زبان طعن دراز کر سکیں۔ لیکن جوں ہی یہ تعدد ازدواج کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں، ان کی شوخیوں کی کوئی حد نہیں رہتی۔ اس وقت فلسفہ ازدواج، عورت کی نفسیات، سوسائٹی میں اس کا درجہ و رتبہ، جذبہ جنس اور اس کی کار فرمائیاں، کیا کیا مضامین ان کے ذہن میں نہیں آتے، اور لطف یہ ہے کہ زہر چکانی کی اس دوڑ میں ان میں سے کوئی بھی پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ ولیم مور، ور منگھم، واشنگٹن، لامنس کس کس کا نام لیجیے۔ سبھی نے تو داد تحقیق دی ہے، ان کے اعتراضات کا ماحصل مندرجہ ذیل تین نکات ہیں:

۱۔ آنحضرتؐ نے کیوں تعدد ازدواج کے فلسفے کو اپنایا؟

۲۔ قرآن میں دوسروں کے لیے جب یہ ضروری ہے کہ صرف چار ہی بیویوں پر اکتفا کریں تو آپؐ نے زیادہ بیویوں کو بہ یک وقت کیوں اپنے حرم میں رکھا؟

۳۔ کثرت لذدواج کے معنی معاذ اللہ جذبہ جنس کی فراوانی کے ہیں۔ لہٰذا جس کے حبالہ عقد میں اتنی عورتیں ہوں وہ روحانیت کے اونچے مقام پر ہرگز متمکن نہیں رہ سکتا۔

## کیا تعدد ازدواج اخلاقی مسئلہ ہے؟

آیئے! آنحضرت کی ازدواجی زندگی کے بارے میں علی الترتیب ہم مستشرقین کے ان اعتراضات کا جائزہ لیں۔

ان لوگوں کا پہلا اعتراض اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ:

تعدد ازدواج (Polygamy) کا مسئلہ اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔

حالاں کہ اس کا تعلق اخلاقیات سے نہیں، تاریخ سے ہے، کسی قوم کی اجتماعی سطح سے ہے، ذاتی و انفرادی مصالح اور سازگاریوں سے ہے، کون نہیں جانتا کہ دنیا کی بہت سی قومیں تاریخ کے اس دور سے گزری ہیں اور بڑی بڑی شخصیتوں نے اس پر عمل کیا ہے۔ یہی نہیں، تاریخ کے اس مرحلے میں اس کو شرافت و عظمت کی خاص علامت قرار دیا گیا ہے۔ عیسائی مستشرقین جب آنحضرت سے متعلق زبان طعن دراز کرتے ہیں تو اس حقیقت پر کیوں غور نہیں کرتے کہ خود بائیبل میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے حرم کا ذکر موجود ہے اور ان کی سینکڑوں بیویوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عمل غیر اخلاقی (Immoral) تھا؟ یہ لوگ آخر اعتراض کرتے وقت اجتماعیات (Sociology) کے اس مسلمہ اصول کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک فرد غلطی کر سکتا ہے اور ایک شخص اخلاق و عوائد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو سکتا ہے، مگر ایک معاشرہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اس کے رسوم و عوائد، اس کے مذہبی و اجتماعی تصورات اور اس کے اقدار حیات کو بجائے خود حجت و دلیل کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے یہ قطعی نامناسب اور غیر علمی حرکت ہے کہ آج کے بعض تمدنی رجحانات کو ماضی کی تہذیبی روایت کے لیے بطور معیار اور کسوٹی کے پیش کیا جائے، اور اس کی بنیاد پر اس کو غلط یا غیر اخلاقی ٹھہرایا جائے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آنحضرت تاریخ کے جس دور میں تشریف لائے اور بالخصوص دنیا کی جس قوم کو آپ نے اصلاح و ہدایت کے لیے چنا، وہ تہذیب و تمدن کی کس سطح پر فائز تھی اور خود اس کے ہاں اس مسئلے کی کیا اہمیت تھی۔ یہ قوم وحدت ازدواج کی قائل تھی یا تعدد ازدواج کی حامی؟ زیادہ واضح پیرایۂ بیان میں یوں سمجھیے کہ باوجود شدید دشمنی اور عداوت کے جب ان کے ہاں یہ مسئلہ نہ صرف یہ کہ قابل اعتراض نہیں تھا، بلکہ شرف و مجد کی مخصوص علامت تھا، تو ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ اس پر اعتراض کریں، اور اس کو طعن و تشنیع کا ہدف بنائیں۔ مقصد یہ ہے کہ آنحضرت کا یہ

عمل خدانخواستہ اگر کسی درجہ بھی قابل اعتراض ہوتا' اس پر حرف گیری اور تنقید کی ذرا بھی گنجائش پائی جاتی تو سب سے پہلے اس کا اظہار خود ان لوگوں کی طرف سے ہونا چاہیے تھا' جن میں کہ آپ ﷺ مبعوث ہوئے۔

## کیا وحدت ازدواج مقصود اصلی ہے:

ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بھی تامل ہے کہ وحدت ازدواج مقصود اصلی ہے۔ مقصود اصلی مہمل اصطلاح (Vegue Term) ہے' کیوں کہ ہر ہر معاشرے کا مقصود و معیار خود اس چیز سے متعین ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ کن اقوام سے تعبیر ہے' کس دور کی پیداوار ہے اور اس کی تمدنی و تہذیبی ضروریات کا تقاضا کیا ہے؟ اس سے نہیں کہ حالات و کوائف کی بو قلمونی کو نظر انداز کر کے کوئی شخص اپنی تائید میں کوئی اصول گھڑ لے یا وضع کر لے۔ اگر اس اصول کی روشنی میں دیکھیے گا تو معلوم ہو گا کہ تعدد یا وحدت ازدواج کا تعلق کسی اخلاقی و اصولی نصب العین کے بجائے' حالات' تاریخ اور شخصی سازگاریوں سے ہے' اور پھر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ نصب العین یا مقصود اصلی کچھ بھی ہو' موجودہ تمدنی رجحان بہرحال وحدت ازدواج کی طرف مائل ہے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

اس صورت میں ہمارا موقف یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے وحدت ازدواج کے لطائف کو بھی آزمایا ہے۔ چنانچہ یہ جانی بوجھی حقیقت ہے کہ حضرت خدیجہؓ قریب قریب اٹھائیس برس تک بلاشرکت غیرے شرف زوجیت سے بہرہ مند رہیں' اور اس طویل عرصے میں کبھی بھی آنحضرت نے دوسری شادی کے بارے میں غور نہیں فرمایا۔ دوسری شادیاں جتنی بھی ہوئیں' حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد ہوئیں۔ کیوں ہوئیں؟ اس کا جواب ہم اعتراض نمبر۲ کے ضمن میں عرض کریں گے۔ سردست جو کہنا ہے وہ یہ ہے کہ تعدد اور وحدت دونوں اصول ہیں اور دونوں انسانی فطرت کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ لہٰذا دونوں صحیح ہیں' اور دونوں کا تعلق تاریخ کی مصلحتوں اور کروٹوں سے ہے' اور آنحضرتؐ نے ان دونوں رجحانات پر الگ الگ عمل کیا ہے اور دونوں میں عدل و مساوات کے بہترین اور زریں نمونے قائم کیے ہیں۔

## تضاد فکر و عمل:

اہل مغرب سے بالعموم اور مستشرقین سے بالخصوص یہ پوچھنا چاہیے کہ اگر فی الواقع موجودہ رجحان وحدت ازدواج کی طرف ہے اور انسان کا حساس و احتیاطی ضمیر اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ تہذیب و شائستگی کے اس دور میں کوئی شخص اپنی محبت کو مختلف عورتوں میں منقسم ہونے دے' یا کسی شریف خاتون کے نفسی اطمینان پر حملہ آور ہو' تو پھر زندگی کا یہ تضاد یا روگ کیوں آپ کی سوسائٹی کا طرۂ امتیاز ہے کہ بیوی تو بلاشبہ ایک ہی ہے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو متعدد داشتائیں بھی ہیں اور کئی کئی آشنا اور دوست عورتیں بھی ہیں۔ اگر وحدت ازدواج کا نظریہ صحیح ہے تو اس عمل کی کیا توجیہہ کی جائے گی۔۔۔۔۔۔۔اور اگر عمل تنوع اور تعدد کا مظہر ہے تو وحدت ازدواج کو بطور اصول کس منطق کی رو سے درست سمجھا جائے گا۔

دراصل مغرب کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی متعین ضابطہ حیات ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ عیسائیت کے راہبانہ پس منظر کی روشنی میں مسئلہ ازدواج پر غور کرتے ہیں تو اس وقت زیادہ سے زیادہ جو چیز ان کی نظروں میں جچتی ہے' وہ وحدت ازدواج ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس لیے کہ ان کے نقطہ نظر سے تو نکاح و شادی کے تعلقات ہی سرے سے معصیت پر مبنی ہیں۔ لیکن جب نفس کی شورشیں مجبور کرتی ہیں' جب ذہنوں پر شہوات کا غلبہ و استیلا ہوتا ہے اور فطرت انسانی بغاوت پر مجبور ہو جاتی ہے تو پھر یہ بجائے اس کے کہ کوئی درمیانی راہ تلاش کریں' ایسے ایسے فلسفے تراشتے ہیں جن میں بے راہ روی پھیلتی ہے اور جنسی انارکی بڑھتی ہے۔

قرآن حکیم کی یہ خوبی یہ ہے کہ اس نے فطرت انسانی کے ان دوگونہ تقاضوں کا خیال رکھا ہے' اور آنحضرت نے اپنی زندگی میں ان دونوں کو بہترین طور سے آزما کر دکھایا ہے یعنی اٹھائیس برس تک ایک ہی بیوی پر اکتفا کرکے آپ نے بتایا کہ وحدت ازدواج کی برکات سے کیوں کر استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد تعدد ازدواج کی صورت میں' اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ: تاریخ' حالات اور شخصی و نفسی مصلحتوں کے پیش نظر تعدد ازدواج کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

بلکہ بعض حالات میں تعدد ازدواج پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں' اس پر زیادہ سے زیادہ تعلیمی و تمدنی فوائد مترتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اصولی خلط مبحث سے

ہمیشہ بچنا چاہیے۔

ایک یہ مسئلہ ہے کہ موجودہ حالات میں کسی خاص ملک یا قوم کا اجتماعی ماحول کس صورت حال کا متقاضی ہے' وحدت ازدواج کا یا تعدد ازدواج کا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آنحضرت جن اقوام میں تشریف لائے اور تاریخ کے جس مرحلے (Phase) میں مبعوث ہوئے' اس وقت کی روایات کیا تھیں۔ آیا اس وقت وحدت ازدواج کو بہتر سمجھا جاتا تھا یا کثرت ازدواج کو سیادت و شرف کی علامت مانا جاتا تھا۔ یہ دو الگ الگ مسئلے ہیں اور دونوں پر الگ الگ غور ہونا چاہیے۔

## اعتراض نمبر۲ کا جواب:

اعتراض نمبر۲ کا ماحصل یہ ہے کہ مانا تعدد ازدواج کا مسئلہ اصولاً صحیح ہے اور یہ بھی تسلیم کہ شخصی و اجتماعی حالات اس بات کے متقضی ہو سکتے ہیں کہ ایک سے زائد بیویوں سے عقد کیا جائے' مگر اس کی آخری حد بھی تو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہے اور بتا دیا ہے کہ اگر عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ سکو تو بس چار تک کی اجازت ہے' اس سے زیادہ نہیں۔ چار سے زیادہ بیویوں کا حرم نبوت میں ہونا کس اصول یا اجازت پر مبنی ہے۔؟

جواب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ اس سوال کا منشا کیا ہے؟ اور مستشرقین اس ضمن میں کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا ان کا یہ مطلب ہے کہ پیغمبر اسلام نے قرآنی احکام کی پیروی میں اس اخلاص و جوش کا ثبوت نہیں دیا' جس کی توقع وہ عام مسلمانوں سے رکھتے ہیں یا ان کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں دو عملی پائی جاتی ہے۔ یعنی کچھ احکام و مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق صرف آنحضرت کی ذات کے ساتھ ہے' اور کچھ احکام ایسے ہیں کہ بشمول نبوت تمام مسلمانوں میں ان کا ماننا ضروری ہے۔

سوئے ظن کی یہ دونوں صورتیں صحیح نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے پیغمبر مجبور ہے کہ منشائے الٰہی کی حرف بحرف پیروی کرے:

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (انعام:۵۰)

میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں' جو مجھے اللہ کی طرف سے موصول ہوا ہے۔

یہی نہیں، اس کی پوری زندگی پر ایک طرح کا احتساب قائم کر دیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ جس شخص کو دوسروں کے لیے اسوہ اور نمونہ ثابت ہونا ہے، خود اس کا کوئی عمل غیر موزوں تو نہیں، غیر اولیٰ اور غیر انسب تو نہیں؟ اور اگر تقاضائے بشری سے اس سے کوئی لغزش سرزد ہو ہی جاتی ہے تو اس پو فوراً تنبیہہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس ذرا سی بے توجہی پر جس کا اظہار آپؐ نے عبداللہ بن ام مکتوم کے بارے میں کیا اور جس میں نیت بہرحال نیک تھی، حضورؐ کو اس سرزنش سے دوچار ہونا پڑا:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (عبس: ۱، ۲)

ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس درجہ کڑی نگرانی کی جا رہی ہو کہ وہ کہیں ترک اولیٰ اور ترک انسب کا مرتکب تو نہیں ہوتا، وہ اگر کسی حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرے گا تو کیا قرآن اس کو معاف کر دے گا

ازدواج مطہرات ہی سے متعلق یہ واقعہ سیر و تفاسیر کی کتابوں میں مرقوم ہے، اور مستشرقین اس سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ

> آپ نے ایک مرتبہ جب حضرت زینب کے ہاں کا شہد اس بنا پر استعمال نہ کرنے کا عہد کیا کہ اس کے استعمال سے آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آنے لگتی ہے، جیسا کہ آپ کو بتایا گیا تھا تو اس پر قرآن نے آنحضرت کو ٹوکا:
>
> يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (تحریم: ۱)
>
> اے پیغمبر! جو چیز اللہ نے تمہارے لیے جائز کی ہے، تم اس سے کنارہ کشی کیوں کرتے ہو، کیا اس سے تم اپنی بیویوں کی خوش نودی چاہتے ہو؟ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مزید برآں جب نبوت کا تصور وہ نہ ہو جو بائبل کا ہے، تو اس میں احکام الٰہی کی مخالفت کا امکان ہی کہاں رہتا ہے۔ بائبل انبیا تو معاذ اللہ، شراب پی سکتے ہیں، عریاں رقص کر سکتے ہیں، اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے دوسروں کو دھوکا دے سکتے ہیں اور زنا تک کے ارتکاب پر آمادہ

ہو سکتے ہیں۔

مگر قرآن نبوت کا جو تصور پیش کرتا ہے' اس میں عصمت تو بالکل ابتدائی شرط ہے' اصل چیز کردار کی بلندی اور سیرت و اخلاق کے دائرے میں ممیز و ممتاز ہونا ہے۔ اس صورت میں قطعی ناممکن ہے کوئی شخص جو نبوت کا دعوے دار ہو' اللہ تعالیٰ کے حکموں سے روگردانی اختیار کر سکے۔ نبوت و رسالت کے متعلق اگر یہ تصور صحیح ہے تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت نے چار سے زیادہ بیویوں کو جو بہ یک وقت اپنے حرم میں رکھا' تو اس کی آپ کو اجازت تھی' اور قرآن کے نقطہ نظر سے آپ کا یہ فعل قطعی جائز اور درست تھا۔

جواب کی یہ صورت بلاشبہ اس وقت معقول ہو سکتی ہے' جب ہم آنحضرت ﷺ کو پیغمبر تسلیم کریں' اور اگر خدانخواستہ ہم آپ کو پیغمبر تسلیم نہ کریں تو پھر اصل مسئلہ یہ نہیں ہو گا کہ آپ نے کتنی خوش قسمت بیبیوں کو شرف زوجیت سے نوازا۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہو گا کہ آپؐ نے کیا تعلیم پیش کی؟ کس فلسفۂ حیات پر اسلام کی بنیاد رکھی اور اخلاق و مذہب کی دنیا میں کیا انقلاب آفریں قدم اٹھائے۔ اسی طرح مسئلہ یہ ہو گا کہ:

> آپ کی پوری زندگی اخلاق و انسانیت کی کن اقدار کی ترجمان تھی' اور آپ نے اپنے عمل اور جہاد سے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو کتنی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ' ایک معاشرے میں ممثل کر کے دکھایا۔

یہ ہیں وہ بنیادی سوال جن کی روشنی میں آپؐ کے منصب پر بحث ہونا چاہیے۔ مگر مستشرقین چوں کہ ان پہلوؤں میں آپؐ کی دعوت اور عمل کو ہر طریق سے مکمل اور ناقابل اعتراض سمجھتے ہیں' اس لیے اعتراض کے لیے ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل منتخب کرنے پر مجبور ہیں جن کو یہ بڑھا چڑھا کر پیش کر سکیں اور جن کی آڑ میں اپنی طبع کینہ جو کے مذموم تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

## انفرادیت کا فلسفہ:

ورنہ یہ اعتراض بھی کوئی اعتراض ہے کہ آپؐ نے ایک ایسے معاشرے میں اور تاریخ کے ایسے مرحلے میں کثرت ازدواج پر کیوں عمل کیا کہ جس میں کثرت ازدواج پر عمل پیرا ہونا نہ صرف یہ کہ کوئی جرم ہی نہیں تھا بلکہ قابل فخریات تھی' یا تعداد کے بارے میں خصوصیت و انفرادیت کا ثبوت کیوں دیا' جب کہ بعض امور میں بعض اشخاص کا منفرد ہونا بجائے تنقیص کے ان کی فضیلت

پر دلالت کناں ہوتا ہے۔ کیا آپ نابغہ (Genius) اور غیر نابغہ میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے؟ سمندر اور قطرے میں کوئی تفریق قائم نہیں کرتے؟ کیا ذرہ و آفتاب کو ایک ہی درجے میں رکھتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ پیغمبر نابغہ سے کہیں زیادہ مرتبے کا حامل ہوتا ہے اس کے اخلاق و سیرت کی گہرائیاں سمندر سے زیادہ وسیع ہیں اور اس کی تابش وضو کی سرحدیں آفتاب سے بمراحل آگے ہیں، اور یہ کہ اس کی حیثیت صرف یہ نہیں کہ یہ احکام و مسائل کی پابندی میں دوسروں سے ممیز و ممتاز ہوتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت بجائے خود ایک حکم کی ہے، ایک معیار کی ہے، ایک اصول اور پیمانے کی ہے۔

اس بنا پر دیکھنے کی یہ چیز نہیں کہ اس نے کتاب اللہ کی اطاعت و پیروی سے کہاں انحراف کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس کے ہر ہر عمل میں جو کتاب اللہ کی تفسیر و تعبیر کی ایک صورت ہے، انسانی مصلحت کے کیا کیا پہلو مضمر ہیں۔ ہم اعتراض نمبر ۳ کے جواب میں ان حقیقتوں کی پردہ کشائی کریں گے جو کثرت ازدواج کے باعث ہوئیں اور بتائیں گے کن حالات سے متاثر ہو کر آپؐ نے چار سے زائد بیویوں کو اپنے حرم میں رکھا۔

یہاں مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ رشتۂ ازدواج صرف جنسی تسکین کا نام نہیں، اس کا تعلق زندگی کی دوسری اقدار سے بھی ہے، شخصی تعلقات سے بھی ہے، معاشرے کی دور رس مصلحتوں سے بھی ہے، اور اس حقیقت سے بھی ہے کہ اللہ کے سب سے بڑے رسول کی پرائیویٹ زندگی کو زیادہ سے زیادہ مستند ذرائع سے منظر عام پر کیوں کر لانا ممکن ہے؟ نیز اس حقیقت کے اعلان سے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ جلیل القدر انسان جتنا اونچا معاشرے اور جلوت میں ہے، اتنا ہی رفیع الشان گھر کی چاردیواری اور خلوت میں بھی ہے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

## اعتراض نمبر ۳ کا جواب:

اعتراض نمبر ۳ کا تجزیہ کیجیے، تو اسے دو عظیم غلط فہمیوں پر مبنی قرار پائیں گے۔

۱۔ یہ کہ کثرت ازدواج جذبۂ جنس کی فراوانیوں پر دلالت کناں ہے۔

۲۔ اور یہ کہ جذبۂ جنس کی فراوانی اخلاق و روحانی زندگی کے ارتقا میں حارج ہے۔

اگر ہمارا یہ کہنا صحیح ہے کہ: شادی کا مسئلہ صرف جنسی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق زندگی کی دوسری اقدار سے بھی ہے تو زیر بحث مسئلہ بڑی حد تک صاف ہو جاتا ہے۔

آیئے! اس اصول کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آنحضرت کا بہ یک وقت کئی کئی ازواج مطہرات کو شرف رفاقت سے مفتخر کرنا کس حد تک مصالح پر مبنی تھا۔ مصالح کی نشان دہی سے پہلے، ان تاریخی حقائق پر بھی نظر رہنی چاہیے کہ: حضرت خدیجہ سے آپ نے تیئس برس کی عمر میں شادی کی۔

گرم ممالک میں تیئس برس کی عمر سن و سال کا وہ حصہ ہے، جسے شباب و رجولیت کی آخری سرحد سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حضور کا پہلا عقد اور ازدواجی زندگی کا پہلا تجربہ اس وقت شروع ہوا، جب آپ شباب اور بھرپور جوانی کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ خدیجہ کے انتقال کے وقت آپ کا قافلہ عمر، پچاس سے متجاوز ہو چکا تھا۔

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ: جو شخص جوانی کے نقطۂ زوال پر ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے اور اٹھائیس برس تک ایک ہی بیوی پر قانع رہتا ہے، آیا اس کی نفسیات میں یکایک کوئی ایسا انقلاب رونما ہو سکتا ہے، یا پچاس برس کے بعد ان میں ایسا جنسی تغیر آپ سے آپ ابھر سکتا ہے کہ معاذ اللہ اس کی برداشت و تحمل ہی دشوار ہو جائے اور جب تک اوپر تلے کئی کئی بیویوں سے عقد و ازدواج کے رشتے استوار نہ کر لیے جائیں اس کی تسکین ہی کا سامان نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس سوے، ظن کے لیے نفسیاتی طور پر کوئی وجہ جواز پائی نہیں جاتی۔ خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی جوانی بے لوث گزری ہو، جس کی پاکیزگیٔ سیرت پر اس کے شدید ترین مخالف بھی معترض نہ ہوں، یہی نہیں، جو اخلاق و عادت کے نقطۂ نگاہ سے عنداللہ اور عند الناس "امین" کے لقب سے ملقب ہو۔

## کثرت ازدواج کی مصلحتیں:

رہیں وہ مصلحتیں جو کئی کئی شادیوں کا باعث ہوئیں تو وہ بالکل واضح ہیں۔ خدیجہ کے بعد حضور نے جس خاتون کو شرف زوجیت سے نوازا، وہ سودا ہیں۔ سودا بنت زمعہ۔ سکران بن عمرو بن عبد شمس کی بیوہ۔ ان سے شادی کیوں ہوئی؟ کیا عربوں میں ان کے حسن و جمال کا شہرہ تھا؟ ان کی دولت و ثروت کا چرچا تھا؟ یا انھیں معاشرے اور قبیلوی زندگی میں کوئی خاص اہمیت حاصل تھی؟ نہیں، ان میں سے کسی چیز کا مورخین نے ذکر نہیں کیا ہے۔ ان سے عقد کا باعث صرف یہ

بات تھی کہ: انھوں نے اپنے خاوند کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا، ہجرت کی تھی اور ان تمام مصائب اور تکلیفوں کو برداشت کیا تھا، جن کو برداشت کرنا اچھے خاصے دل گردے کا کام تھا۔ انھوں نے جب خاوند کے انتقال کے بعد اسلامی معاشرے میں اپنے کو تنہا محسوس کیا تو آنحضرت نے دل جوئی کی خاطر ان سے عقد کر لیا۔

ظاہر ہے آنحضرت کا یہ عمل، یہ عزت افزائی، اعتراض کے بجائے تعریف و ستائش کے قابل ہے۔

اسی قسم کے حالات زینب بنت خزیمہ ام المساکین اور ام سلمہ کے تھے۔ ان کے خاوند بھی فوت ہو چکے تھے اور یہ بیوہ تھیں۔ ان سے بھی رشتۂ تزوج بربنائے لطف و ترحم تھا۔

مستشرقین نے اگرچہ ام سلمہ کے حسن و جمال کی من گھڑت داستانیں بیان کی ہیں، مگر یہ قطعی صحیح نہیں۔ تاریخ سے ان کی تصدیق نہیں ہو پائی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر حضور حسن و جمال کی بنا پر کسی عورت کو اس شرف سے مفتخر کرنا چاہتے تو مہاجرین و انصار میں ایسی دوشیزاؤں کیا کمی تھی؟ اور کون تھا جو اس شرف سے بہرہ مند نہ ہونا چاہتا؟

سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنے لیے اذیت رسید بیواؤں کو ہی کیوں پسند کیا؟ آپ کی ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہ ایسی خاتون ہیں جو بیوہ نہیں تھیں۔ مگر ان سے عقدہ کا محرک بھی جنسی جذبہ نہیں۔ کیوں کہ آپ سے جب عقد ہوا ہے، اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی اور ہرگز اس قابل نہیں تھی کہ جس سے اس نوع کے محرکات ابھر سکیں۔ ان کے بارے میں صحیح احادیث میں آتا ہے کہ: کاشانۂ نبوت کو انھوں نے جب رونق بخشی ہے اس وقت گڑیوں سے کھیلنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

بتایئے کیا اس صغر سنی میں جنسی کشش کسی عورت میں پیدا ہوتی ہے؟ اس شادی کا مقصد صرف اپنے دوست اور یار غار حضرت ابوبکر کی عزت افزائی تھی۔

شادی کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کی تائید حضرت حفصہ کے واقعہ نکاح سے ہوتی ہے، اس سے غرض بھی یہی تھی کہ حضرت عمر کو اس رشتے سے نوازا اور مفتخر کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمر نے اعتراف کیا ہے کہ حفصہ آنحضرت ﷺ کے جذبہ محبت و تودد کو کبھی بھی اکسا نہیں سکی ہیں، اور یہ محض حضور کا کرم ہے کہ آپؐ نے اس کے باوجود ان سے نبھانے کی کوشش کی

ہے۔

مستشرقین کے خبث باطن اور قیاس آرائیوں کا اصل مدار اور محور حضرت زینب بنت جحش کی شادی کے افسانے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آپ کے دل میں اگر ان کے حسن و جمال کا ادنیٰ تاثر بھی موجود ہوتا' تو آپ ان کو بجبر حضرت زید کے سپرد کیوں کرتے' دراں حالیکہ زینب اپنے درجے اور مرتبے کی بنا پر انھیں قطعاً پسند نہیں فرماتی تھیں۔ پھر بار بار ناراضی اور عدم پسند کے باوجود ان سے کیوں کہتے کہ

اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (احزاب: ۳۷)

"اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے۔"

طلاق کے بعد جب آپ نے ان سے عقد فرمایا تو اس کے دو ہی مقصد تھے۔

حضرت زینب کی دل جوئی۔---------- اور

رسم متبنّٰی کے لوازم کی نفی۔

ظاہر ہے یہ سراسر اصلاحی قدم تھا' جو آپ نے اٹھایا اور اس کے لیے تاریخ و معاشرے کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

تعدد ازدواج کے یہ تو خصوصی اسباب تھے۔ سب سے بڑا اور عموی سبب بقول غزالی کے یہ تھا کہ: آنحضرت کے جذبہ عدل و احسان کی وسعتیں ایک سے زائد بیویوں کی متقاضی تھیں۔

مگر اصولی سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ: رشتہ و تعلق کی ان بوقلمونیوں نے آیا آپ کے جذبۂ دین کو کسی درجے میں بھی کم کیا؟ آپ کی روحانیت کو گھٹایا؟ اور گھریلو الجھنوں اور ازدواجی تعلقات نے عبودیت و بندگی کے تقاضوں کو مجروح کیا؟ تنظیم ملت اور تعلیم و تربیت کے فرائض کو کسی معنی میں بھی گزند پہنچایا؟

اگر ان میں کوئی ذرہ سی بات بھی نہیں ہو پائی' بلکہ تاہلی زندگی کی گراں باریوں نے آپ کو اللہ کی چوکھٹ پر جھکایا اور شوق عبادت کو تیز کیا اور تعلقات کی اس نوعیت نے کردار و سیرت کی بلندیوں کو اور اچھالا اور اجاگر کیا تو یہ چیز بجائے خود آپ ہی کی عظمت پر دال ہے' چہ جائیکہ اعتراض و نکتہ چینی کی مستحق ہو۔

## کیا جنسی جذبے کی فراوانی روحانی زندگی کے ارتقا میں حارج ہے؟

انہی حقائق کی روشنی میں شق نمبر۲ پر غور کیجیے' کہ کیا جذبہ جنس کی فراوانی' روحانی زندگی کے ارتقامیں حارج ہے؟

زیر بحث مسئلے کو ذرا محدود کیجیے' اور بحث و نظر کی وسعتوں کو اس مخصوص نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کیجیے۔ کہ اگر ازدواجی زندگی کی بوقلمونیوں نے آنحضرت کے روحانی مشاغل میں رکاوٹ پیدا نہیں کی' بلکہ اس سے آپ کی روحانی زندگی کی بلند پروازیاں بدستور قائم رہیں' تو اس مفروضے کی حیثیت محض ایک تجرید

(Abstraction) کی رہ جاتی ہے' جس کی حقائق کی روشنی میں اس بات کی قطعی تائید نہیں ہوپاتی کہ جذبۂ جنس روحانی تقاضوں کے منافی ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے آنحضرت کو زیر بحث نہ لائیے۔ مستشرقین کے لیے قابل غور یہ بات ہے کہ کیا بائیبل کے نقطۂ نظر سے حضرت داؤد اور سلیمان کی عظمت روحانی ان کی سینکڑوں بیویوں کی وجہ سے کم ہوگئی تھی؟ اور اس کی پاداش میں ان کو فراز نبوت سے نیچے اترنا پڑا تھا؟

یا مسیحیت کے علم بردار یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسے انبیا تھے جو باوجود منصب رسالت پر متمکن ہونے کے مرتبۂ رسالت سے فروتر تھے؟

شکایات سے قطع نظر آیئے اس نقطۂ نظر کی تہہ میں اتر کر دیکھیں اور معلوم کریں کہ اس میں حق و صداقت کی مقدار کس درجے ہے اور وہم و گمان کی طرفہ طرازیوں کا دخل کتنا ہے۔؟

تحلیل و تجزیہ سے اس کے دو جز لائق غور معلوم ہوتے ہیں:

جنس (Sex) اور روحانیت (Spiritualium) سوال یہ ہے کہ طبی لحاظ سے جنس کا مقام کیا ہے؟ کیا یہ غیر فطری صلاحیت ہے؟ یا اس کی فراوانی صرف مخصوص نوع کے جذبات کو ابھارنے کا باعث ہوتی ہے؟ ظاہر ہے یہ غیر فطری ہرگز نہیں' بلکہ قدرت کا نہایت ہی عزیز ترین عطیہ ہے۔

مزید براں اس کا تعلق انسان کے پورے جسمانی ڈھانچے سے ہے' اعصاب و نخاع کے پورے نظام سے ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ:

ذہن و فکر کی مکمل استواریوں سے ہے۔

چنانچہ اس کے بغیر یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے جمال ظاہری میں کوئی نقص نہ پیدا ہو' یہ

بھی ممکن ہے کہ ایسا شخص فکری و عقلی اعتبار سے دوسروں سے کم نہ ہو' جیسا کہ جدید ترین تجربوں سے ثابت ہوتا ہے' مگر ایسے شخص میں جرأت (Courage) نشاط کار (Pleasantry) اور کسی بڑے کام اور منصوبے کے لیے وہ پہل اور صلاحیت آغاز (Initiative) نہیں ابھر سکتی' جس سے کہ کوئی شخص سیادت و رہنمائی کے قابل ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر اجازت دیجیے کہ ہم امام ماوردی کے اس نظریے کو سراسر غیر فطری اور نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے کلیتہً غلط قرار دے سکیں کہ جذبۂ جنس سے محروم انسان بھی خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے کہ یا یہ کہ قوت مردمی کا فقدان کوئی نفسیاتی و جسمانی عیب نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک خلیفہ کیلئے ضروری ہے کہ غور و فکر کے اعتدال کے ساتھ نفسیاتی توازن کا بھی حامل ہو۔

جذبۂ جنس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ کوئی معصیت ہے' نہ صرف غیر علمی (Un - Scientific) حقیقت ہے' بلکہ ایک طرح کا **تعسف** (Dogma) بھی ہے' جس کا تاریخی تعلق عیسائیت کے مشہور عقیدے فطری گناہ کے شجرہ خبیثہ کے شاخسانے سے ہے۔

## روحانیت کیا ہے؟

روحانیت کے بارے میں بہ کثرت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا اس کا تعلق خوارق و کرامات سے ہے؟ مگر خود یہ خوارق و کرامات کیا ہیں؟ یہ اصطلاح روحانیت سے بھی زیادہ اجمال لیے ہوئے ہے۔ اگر خوارق و کرامات کے معنی محسوسات میں ایسے تغیر و تبدل رونما کرنے کے ہیں جو حیران کن ہوں' تو پھر تمام سائنسٹوں کو روحانیت کا پیکر ماننا چاہیے۔ اور خصوصاً آڈیسن کو اپنے دور کا بہت بڑا صوفی قرار دینا چاہیے' جس نے ایسے تجربات کا ڈھیر لگا دیا۔ ممکن ہے کچھ لوگ سائنس کے اختراعات کو خوارق نہ مانیں اور یہ کہیں کہ انسان کے نفسیاتی اثرات سے جو تغیر و تبدل پیدا ہو' ہم اسے کرامت یا خارقہ نہیں کہتے چلئے یہی سہی۔ کیا ہزاروں ایسے لوگ پائے نہیں جاتے جو بغیر کسی عقیدہ و کردار کے عجیب و غریب شعبدہ طرازیوں پر قدرت رکھتے ہیں؟ یہ تو نفسیات انسانی کی ادنی کرشمہ سازی ہے جو محض عشق و ریاضت کی رہین منت ہے۔ اس کا کوئی تعلق انسان کی باطنی زندگی سے نہیں۔

کیا تواجد (Ecstasy) روحانیت کا خاص معیار ہے؟ یہ بھی نہیں!

موجودہ نفسیات کے ماہرین کا یہ دعویٰ ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ بعض دوائیں وجد و سکر اور

کشف و ادراک کی وہی کیفیتیں پیدا کر دے سکتی ہیں، جو زہد و ریاضت سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ تو روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ سلفے کا ایک کش لگانے والے بعض مرتبہ ایسی پتے کی باتیں کرتے ہیں کہ بڑے سے بڑا مرتاض بھی کیا کرے گا۔

کیا ترک دنیا اور ترک علائق روحانیت ہے؟ یہ بھی صحیح نہیں۔ اس لیے کہ یہ محض منفی (Negative) پہلو ہے اور روحانیت ایجابی حقیقت (Positive Reality) سے تعبیر ہے۔

یہ ساری چیزیں اگر روحانیت نہیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر روحانیت ہے کیا؟ دو لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے کہ: اس سے مراد ایسی زندگی ہے جس میں ایثار ہو جس میں اس نقطۂ نظر کو اہمیت حاصل ہو کہ ہمیں اپنے لیے، اپنی خواہشات کے لیے، اور عزیز و اقارب کے مفاد کے لیے زندہ نہیں رہنا ہے بلکہ ایک نصب العین کے لیے زندگی بسر کرنا ہے، اخلاق و اقدار کے لیے جینا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے لیے تگ و دو کرنا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

○ (انعام: ۱۶۲)

کہہ دیجیے میری نماز، میری عبادت، میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

ہمارے نزدیک وہ شخص روحانی ممیزات کا حامل ہے جو دنیا میں رہتا ہے، خواہشات و جذبات کی معرکہ آرائیوں سے دوچار ہے، ترغیبات و لذائذ کی جاذبیتوں سے آگاہ ہے، مگر اس کے باوجود اپنے ذہن و فکر کے توازن کو قائم رکھتا ہے اور کوئی اقدام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کے نصب العین، اس کی اقدار اور عقیدے کو نقصان پہنچے۔ یہی نہیں، سچی روحانیت ہمارے نزدیک بھرپور زندگی کی طالب ہے اور وہ شخص روحانیت سے متصف ہے جو عزیز و اقارب رکھتا ہے، کاروبار انجام دیتا ہے، اور وہ سب کام کرتا ہے جو دنیا میں رہ کر کرنا ضروری ہیں۔ مگر فرائض کی اس بھیڑ اور ہجوم میں اپنے نصب العین اور اقدار کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرتا، بہ نسبت اس شخص کے جو ذمہ داریوں سے بھاگتا اور جی چراتا ہے۔

جنس اور روحانیت کے اس علمی (Scientific) تصور کو سامنے رکھیے، اور پھر دیکھیے آنحضرت کے مرتبے اور روحانیت کا کیا عالم ہے؟

## (۱۴)

# خلق عظیم

### اخلاق کے تین پیمانے:

اخلاق کے نقطۂ نظر سے آنحضرت ﷺ کی زندگی کن کن عظمتوں اور جامعیتوں کو گھیرے ہوئے ہے؟ اس کا صحیح صحیح جواب تو وہ محدثین کرام اور سیرت نگار حضرات ہی دے سکتے ہیں جنھوں نے چہرۂ رسالت کی ضوافشانیوں سے قرطاس و قلم کو تابانیاں بخشی ہیں۔ قرآن میں تو صرف اصول کی حد تک اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

موضوع کی بے چارگی ملاحظہ ہو کہ دنیا بھر کے قائدین اور مصلحین میں صرف آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ہی ایسی ہے جس نے تاریخ کو صحیح معنوں میں تاریخ کا رتبہ عطا کیا ہے، اور جس کی بدولت تاریخ کا تصور نکھرا اور متعین ہوا ہے، جس کی ایک ایک ادا، ایک ایک حکم اور عادت کو حدیث و سیر کی کتابوں میں قلم بند کیا گیا ہے، فکر و عمل کی ایک ایک جنبش سے لذت حکایت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ یعنی جس کی زندگی اس تفصیل اور اس استیعاب کے ساتھ مذکور ہے کہ کوئی گوشہ بھی تو چاہنے والوں کی نظر شوق سے اوجھل نہیں رہا۔ مگر ہم ہیں کہ آپ ؐ کی اخلاقی بلندیوں اور نکتوں کا جائزہ صرف قرآن ہی کی حد تک لینے پر مجبور ہیں۔

قرآن کی ان دو آیتوں سے کون آگاہ نہیں ہے جن میں آپ ؐ کے مرتبۂ اخلاق کی اس طرح

نشان دہی کی گئی ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ (القلم: ۴)

تمھیں خلق عظیم سے بہرہ مند کیا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ۲۱)

تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین اسوہ ہے۔

مگر یہ "خلق عظیم" کیا ہے اور اسوۂ حسنہ اخلاق و عادات کی کن کن نوعیتوں کا غماز ہے؟ اس تفصیل کو جاننے کے لیے ہم تین زاویہ ہائے نظر پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہی تین کسوٹیاں ہیں، جن سے کسی شخص کی عظمت کردار کا حقیقتاً اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ آپؐ کا اپنے اعزہ اور گھر والوں سے برتاؤ کیسا تھا؟
۲۔ اپنے عقیدت مندوں سے تعلق و معاملہ کی بنیاد کس اصول پر تھی؟
۳۔ مخالفین سے کس شائستگی سے پیش آتے تھے؟

## پہلا پیمانہ:

آیئے قرآن کی روشنی میں ان تینوں سوالوں کا جواب تلاش کریں۔

اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ آنحضرت ﷺ نہایت درجہ شفقت و محبت کا معاملہ روا رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ آپؐ نے جب اسلام کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور بالخصوص اپنے اعزہ اور برادری کے لوگوں کو مخاطب ٹھہرایا تو انھیں تعلقات کا واسطہ دیا:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ: ۲۳)

کہہ دو میں تم سے صلے کا طالب نہیں، مگر قرابت کی محبت تو چاہیے۔

یعنی جب عام دنیوی سلوک میں میں نے ہمیشہ قرابت داری کا خیال رکھا ہے اور تعلق و رشتے کی نزاکتوں کو نباہا ہے، تو دین کے معاملے میں دشمنی اور عداوت کیسے ممکن ہے۔

## دوسرا پیمانہ:

انسانی تعلقات کا سب سے چھوٹا اور مختصر ترین دائرہ اگرچہ انسان کی ازدواجی زندگی کا دائرہ ہی

ہے، مگر اخلاقی اعتبار سے اسی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ زندگی کا یہی وہ گوشہ ہے جس میں انسان کے حقیقی اخلاق کا مظاہرہ ہوتا ہے، اور جہاں کوئی ملمع، بناوٹ او تصنع حقائق پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔

اس دائرے میں آپؐ کس درجہ کامیاب و کامران تھے؟ یا ازواج مطہرات کے حقوق و فرائض کی نگہداشت کا آپ کو کتنا خیال رہتا تھا؟ اس کی پوری پوری وضاحت تو کتب حدیث میں ملے گی، جن میں بتایا گیا ہے کہ آپؐ کی شخصیت اور محبوبیت نے، ازواج مطہرات کے دل میں، احترام و ادب کے کن کن داعیوں کو بیدار کر رکھا تھا، مگر ایک اجمالی سا اشارہ اس آیت میں بھی موجود ہے:

تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (تحریم: ۱)

اپنی بیبیوں کی خوش نودی چاہتے ہو۔

ہم جانتے ہیں۔ یہ آیت محل زجر میں ہے۔ تاہم اس میں اس حقیقت کا اظہار بہرحال پایا جاتا ہے کہ آنحضرت باوجود، مقام نبوت کی بلندیوں کے ازدواج مطہرات سے وہی برتاؤ روا رکھتے تھے جو ایک معقول شوہر اپنی محبوب بیبیوں سے روا رکھ سکتا ہے۔

## تیسرا پیمانہ:

آپؐ کے اخلاق عالیہ کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ اپنے پیرووں اور حلقہ بگوشوں سے رشتہ و تعلق کو جس بنیاد پر استوار کرتے ہیں، وہ برابری اور اخوت و رفاقت کی انسانی بنیاد ہے، حالاں کہ اگر آپ چاہتے تو اس سے کہیں زیادہ عقیدت و نیازمندی کے جذبات کو اکسا سکتے تھے، مگر اس میں اس پندار اور کبریائی کا شائبہ تک پایا نہیں جاتا جو عام طور پر ان لوگوں میں پیدا ہو جاتا ہے، جو سیادت و ارشاد کی اونچی مسندوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات: ۱۰)

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

یہی نہیں، آپؐ کی شفقت و محبت اور تعلق خاطر کے پیمانے اس سے بھی سوا ہیں۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (آل عمران: ۱۵۹)

(اللہ کی خاص مہربانی سے تمھاری افتاد و مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئی ہے۔)

قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ: ۱۲)

(تمھارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔)

"تمھاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے' تمھاری فلاح و بہبود کے بہت آرزو مند ہیں' اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔"

یعنی اپنی امت سے اس درجہ ہمدردی و الفت ہے کہ ان کی ادنیٰ تکلیف بھی مزاج گرامی پر گراں ہے۔

کہیے۔ مرید اور مرشد میں تعلق و رشتے کی یہ نوعیت' دل سوزی اور احساس کہیں اور بھی آپ نے دیکھا؟ اپنوں سے برتاؤ اور سلوک کا یہ انداز بہت اونچا سہی' مگر بہرحال ممکن ہے۔

## تیسرا پیمانہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ مخالفین سے راہ و رسم کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟ اور ان سے جب بات چیت ہوتی ہے تو کیا اصول مد نظر رہتا ہے؟ قرآن نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (مومنون: ۹۶)

(بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔)

دشمن سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا کتنا مشکل کام ہے۔

قرآن نے اس کا اعتراف فرمایا ہے:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○

(حم السجدہ: ۳۵)

(اور یہ بات انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور انھی کو نصیب ہوتی ہے' جنھیں اخلاق سے بہرہ وافر ملا ہے۔)

## (۱۴)

# مقام نبوت اور اس کی خصوصیات

## نبوت کا نقطہ آغاز اور کومٹ:

آنحضرت کی سیرت کے سلسلے میں جس مضمون کو قرآن نے زیادہ وضاحت اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ آپ کے مرتبہ و مقام کی تشریح ہے، اور یہی ہماری گزارشات کا موضوع بھی ہے کہ نبوت اور متعلقات نبوت کے بارے میں جو شکوک ایک خاصے حلقے نے پھیلا رکھے ہیں، قرآن کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے اور بتایا جائے کہ فہم نبوت میں اس گروہ نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے دعووں کے ثبوت و اظہار میں فکر و استدلال کی کن کن شعبدہ طرازیوں اور اعجوبہ زائیوں کا انھوں نے مظاہرہ کیا ہے۔”

نبوت کا کب آغاز ہوا؟ اور انسان نے کب پہلے پہل ادراک و معرفت کی اس متعین صورت سے آشنائی حاصل کی؟ فلسفۂ مذہب کا یہ ایک اہم اور متنازعہ فیہ سوال ہے۔!

کومٹ اور اس کے متبعین کا خیال ہے کہ پہلے مظاہر پرستی نے انسانی ذہن و فکر پر قابو پایا۔ پھر بت پرستی اور مابعد مابعد الطبیعاتی فلسفہ ابھرا، اور اس کے بعد وہ لوگ منصۂ تاریخ پر ہویدا ہوئے، جنھوں نے انسانی دنیا کو توحید و نبوت کا مژدہ جاں فزا سنایا۔ گویا انبیا کا زمانہ بہ ہر حال بت پرستی کا بعد کا ہے۔۔ فیورباخ اور دوسرے مادہ پرست مفکرین کا انداز فکر بھی کچھ اسی ڈھب کا ہے، اور اب تو یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ جب انسانی عقائد کے ارتقا کی تاریخ بیان کی جائے تو اس جانی

بوجھی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔

اس کے برعکس قرآن نے جو دعویٰ (Thesis) پیش کیا ہے' وہ یہ ہے کہ پہلا انسان' پہلا نبی تھا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط

(البقرہ: ۳۰)

(اور جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا' میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اول روز سے جب انسانی شعور نے کروٹ بدلی' اور اس میں برائی اور بھلائی کا احساس پیدا ہوا' اللہ تعالیٰ کی عنایت در بوبیت نے اس کا ساتھ دیا اور ان تمام ضروری ہدایات و تعلیمات سے اس کو نوازا اور بہرہ مند کیا جو صبح و شام کی زندگی میں اس کے لیے کار آمد ہو سکتی تھیں:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (البقرہ: ۳۰)

(اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔)

گمراہی' شرک اور عمل و فکر کی دوسری بدعنوانیاں اس واضح ہدایت کے بعد ابھریں۔

قرآن نے جو دعویٰ پیش کیا ہے اس کی تائید بائیبل سے بھی ہوتی ہے' پرانے نوشتوں سے اس کا پتا چلتا ہے' نیز قدیم ترین انسانی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ معاشرے کے ہر ہر دور میں توحید' ہدایت اور رہنمائی کا واضح سراغ ملتا ہے' اور اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ نبوت کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اہتمام ربوبیت سے ہے' انسانی تاریخ سے نہیں' تو پھر اس حقیقت کے' مان لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ نبوت کا آغاز' ٹھیک اسی وقت ہوا ہے جب آدمیت نے معاشرے سے روشناسی حاصل کی ہے' جب انفرادی و اجتماعی شعور میں بیداری کی پہلی کرن پھوٹی ہے یا یوں کہیے کہ جب آدمیت کو مسائل خیر و شر کا پہلی دفعہ سامنا کرنا پڑا ہے۔

## کیا تاریخ بھی مادے کی طرح جبر و اضطرار کا نتیجہ ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہم انسانی تاریخ سے قطع نظر کر لیں' الہامی کتابوں اور نوشتوں

کو درخور اعتنا نہ سمجھیں اور اس کے بعد تاریخ کے لیے کوئی منطقی ترتیب قائم کرنا چاہیں، تو اس وقت ترتیب اشیا کا تقاضا یہی ہو گا کہ پہلے مظاہر پرستی کا چلن ہو، پھر بت پرستی اور خاص خاص نظریات انسانی ذہن و فکر پر تسلط جمائیں، اور اس کے بعد کہیں جا کر انسانی ذہن توحید و وحدانیت کے صاف ستھرے تصور کی طرف منتقل ہو، مگر تاریخ کی چال ان پابندیوں کی کب متحمل ہے اور اس میں تدریج و ارتقا کی یہ منزلیں کب ضروری ہیں۔

کومٹ اور فیورباخ کے خیال میں ساری گمراہی دراصل نظریۂ ارتقا کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جہاں تک عالم طبعی کا تعلق ہے، اس پر قوانین و احکام فطرت کا سختی سے اطلاق ہوتا ہے، اور ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ عالم ایکاایکی معرض ظہور میں نہیں آیا ہے بلکہ اس کا وجود ایک خاص ترتیب ارتقا کا رہین منت ہے۔ مگر کیا تاریخ بھی اس ارتقا سے متاثر ہوئی ہے؟ اور یہ بھی فطرت کا ایسا مظہر ہے، جس پر کہ طبعی قوانین کا اسی طرح بغیر کسی روک ٹوک کے اطلاق ہوتا ہے؟ اس کو ماننے میں ہمیں تامل ہی نہیں، انکار ہے۔ ہم تاریخ میں اس طرح کی جبریت کے ہرگز قائل نہیں۔

ہمارے نزدیک مادیات اور انسان کی تاریخ میں وہی فرق ہے جو خود مادے اور انسان میں ہے۔ مادے میں جبر و اضطرار ہے اور قوانین کی مطلق فرمانروائی ہے، کیوں کہ اس کی زندگی اور وجود اسی جبر و اضطرار کی وجہ سے قائم اور استوار ہے۔ اس کے برعکس انسان آزاد ہے، خود مختار ہے اور اس کی اخلاقی و معاشرتی زندگی اس کے اسی اختیار و ارادے کی آزادانہ تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اس کی تاریخ لازماً جبر و اضطرار کی تاریخ نہیں ہو سکتی۔

اگر ہمارا یہ تجزیہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں اس طرح کی ترتیب عقائد ماننا قطعی ضروری نہیں۔ یہی نہیں، اس میں سرے سے کوئی ایسی ترتیب عقائد فرض کرنا ہی غیر منطقی حرکت ہے۔

ان لوگوں کی غلط فہمیوں کا ایک اور سبب بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہ تاریخ انسانی کا عقائد و افکار کی رو سے جائزہ لیتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کے بعض گوشے اور بعض کڑیاں ایسی بھی ہیں، جہاں بڑے بڑے بت اور آلہہ نظر آتے ہیں، مگر خدائے واحد کا تصور دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے یہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ توحید کسی طرح بھی ابتدائی اور پہلی تعلیم نہیں ہو سکتی،

بلکہ یہ اسی بت پرستی ہی کی ایک اصلاح شدہ اور تجریدی صورت ہے جو صدیوں تک انسانی معاشرے میں رائج و مقبول رہی۔

اس طرز استدلال میں منطقی خامی یہ پائی جاتی ہے کہ تاریخ انسانی پر بجائے اس کے کہ بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے' اس کے بعض اجزا ہی تک مطالعہ و مشاہدے کی وسعتوں کو محدود رکھا گیا ہے' اور پھر ان اجزا کی حیثیت بھی صرف عدم ذکر کی ہے' عدم ثبوت کی نہیں۔ یعنی اس حقیقت کو بھلا دیا گیا ہے کہ سامی انبیا کی تاریخ تقریباً پوری انسانیت کی تاریخ ہے' اور یہ کہ اس میں توحید کے نقوش اگرچہ کہیں کہیں زیادہ روشن نہیں ہیں' تاہم کسی نہ کسی شکل میں پائے ضرور جاتے ہیں۔ رہی وہ قومیں جن کی تاریخ میں توحید کے نقوش مطلق نہیں ملتے' تو اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان تک توحید کی دعوت سرے سے پہنچی ہی نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہنچی ہو اور انھوں نے شرک کے مقابلے میں اسے اہم نہ سمجھا ہو۔ مزید برآں اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اگر یہ ان لوگوں میں سے بعض توحید کے قائل ہوں' مگر ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اس کو محفوظ نہ رکھ سکے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ اس عدم ذکر کی کئی توجیہیں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے لازماً یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ جو چیز مذکور نہیں ہے' وہ موجود بھی نہیں ہے۔

## نبوت کا عقلی امکان اور اس کے بارے میں دو رائیں:

متعلقات نبوت کے سلسلے میں ایک اہم سوال اس کے عقلی امکان کا بھی ہے۔ مغرب کے اہل فکر کا ایک طبقہ یہ نہیں مانتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اقدار کا سرچشمہ ہے یا یہ کہ وہ ان اقدار کو وحی کے ذریعے انبیا کے سینوں میں منتقل کر دینے پر بھی قادر ہے۔ ان کے نزدیک یا تو یہ کارخانہ صرف قوانین فطرت کے بل بوتے پر چل رہا ہے' اور یا اگر خدا کا فی الواقع کوئی وجود ہے بھی تو وہ صرف ایک تخلیقی قوت سے تعبیر ہے' اس سے زیادہ نہیں۔ اقدار' اخلاق اور معاشرے کی اصلاح و تربیت کے معاملے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔

نبوت کے بارے میں اس گروہ کی دو رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ ایک قسم کی نفسیاتی و ذہنی بیماری سے دوچار ہوتا ہے اور جو شخص بھی اس نوع کی بیماری سے دوچار ہوتا ہے' اس سے عجائب و غرائب کا صدور نہ صرف یہ کہ غیر متوقع نہیں' بلکہ یہ اس بیماری کا خاصہ ہے۔ ایسا مریض

عجب عجب بولیاں بولتا ہے، حیران کن معلومات کا اظہار کرتا ہے اور بسا اوقات تو ایسے ایسے حقائق کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ بڑے بڑے دانش ور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

دوسری رائے اس سے نسبتاً زیادہ معقول اور زیادہ متوازن ہے، اگرچہ صحیح یہ بھی نہیں، کہ نبوت دراصل ایک موضوعی (Subjective) حقیقت کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ زیادہ حساس لوگ، زیادہ ذہین افراد، اور زیادہ انقلابی طبائع کے مالک اشخاص جب معاشرے کی برائیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو ان میں ان کے خلاف ایک شدید رد عمل پیدا ہوتا ہے۔ یہ ان برائیوں کے استیصال کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور اس جوش اور اخلاص کے ساتھ یہ کام سرانجام دیتے ہیں کہ گویا ان کا یہ اولین مشن ہے اور خدا نے انھیں اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے، اور پھر جب لوگ مخالفت کرتے ہیں اور ان کے اخلاص کا جواب دشمنی اور عداوت کے اظہار سے دیتے ہیں تو ان کے اخلاص اور جوش میں اور اضافہ ہوتا ہے اور یہ سچ مچ اپنے کو مامور من اللہ تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس میں کسی بناوٹ یا تصنع کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات ازراہ ایمان داری شدت جوش اور فراوانی اخلاص سے اپنے کو خدا کا پیغمبر یا فرستادہ باور کرنے لگتے ہیں۔ اور جب کچھ لوگ ذہنی و نفسیاتی لحاظ سے اصلاح و رہنمائی کے اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں تو ان پر خود بخود عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہونا شروع ہو جاتا ہے، جسے وہ وحی و الہام سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں جن چیزوں کو وہ وحی سے تعبیر کرتے ہیں، فی الواقع وہ وحی ہی ہوتی ہے، مگر اس کا تعلق آسمانوں کی وحی سے نہیں ہوتا، بلکہ یہ قلب و ذہن ہی کی ایک اونچی سطح کا پیغام ہوتا ہے، جسے قلب و ذہن ہی کی دوسری سطح جو نسبتاً کم بلند ہوتی ہے قبول کرتی ہے، اور ارسال و پذیرائی کی یہی نفسیاتی کیفیت ہے جو مل جل کر ان حضرات کے اس اذعان کی تقویت کا باعث ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھیجا ہے اور اصلاح و ہدایت کے خاص مشن پر مامور فرمایا ہے۔

## پہلی رائے کی غلطی:

پہلی رائے سرے سے ناشائستہ التفات ہے اور ٹھکرا دینے کے لائق ہے۔ اس لیے کہ ذہنی و نفسیاتی بیماری کا یہ نتیجہ تو بلاشبہ نکل سکتا ہے کہ ایسا مریض کبھی کبھی کوئی اونچی بات کہہ دے۔ یا کسی حیران کن حقیقت کے بارے میں اظہار خیال کر دے۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ یہ کسی فلسفہ

حیات کی بنیاد رکھ سکے؟ زندگی کی الجھنوں کو سلجھا سکے؟ اور کائنات کے اسرار سربستہ بیان کر سکے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی متوازی، بلند اور سلجھی ہوئی شخصیت (Personality) سے بہرہ مند ہو سکے؟

اگر جواب اثبات میں ہے، تو پھر سب کو اس بیماری کی آرزو کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر نفسیات کا یہ خلل سلیمان، ابراہیم، موسیٰ اور آنحضرتؐ ایسے جلیل القدر انسانوں کو پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر یہ خلل رشک کے قابل ہے اور اس لائق ہے کہ ہر سمجھ دار آدمی اس کی تمنا کرے۔

اس مرحلے پر ہمیں ولیم جیمز کا یہ لطیفہ بے اختیار یاد آجاتا ہے جو انھوں نے اپنی مشہور کتاب۔ "تجربات روحانی کا تنوع" میں ایسے لوگوں سے متعلق درج کیا ہے، جو نبوت کو مریضانہ ذہنیت کا کرشمہ قرار دیتے ہیں، کہ یہ لوگ عجب پاگل پن میں مبتلا ہیں۔ اگر کوئی سائنس دان کسی حیران کن ایجاد کا فخر حاصل کرتا ہے تو یہ لوگ اس پر کسی اچنبھے کا اظہار نہیں کرتے، اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اس کی نفسیاتی حالت کا تجزیہ کیا جائے۔

اسی طرح ایک ریاضی دان، ایک موسیقار، ایک مصور اور سنگ تراش کے نتائج فکر اور شاہ کاروں پر ان کی رگ استعجاب نہیں پھڑکتی اور ان کی تحسین کرنے اور فنی خوبیوں کو سراہنے سے پہلے یہ کبھی اس طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ ان کے دل و دماغ کا طبی معائنہ تو کرا لیا جائے۔

لیکن جوں ہی کوئی اللہ کا بندہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کے ثبوت میں وحی و الہام کے خوارق عقلی پیش کرتا ہے تو ان میں ایک طرح کی ہل چل مچ جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ ان خوارق پر غور کریں، ان کو سراہیں اور ان کی روشنی میں فکر و عمل کے قافلوں کو آگے بڑھائیں، یہ الٹا اس کو مریضانہ ذہنیت کا نتیجہ قرار دینے لگتے ہیں۔

ان لوگوں کی اصل مجبوری یہ ہے کہ مادیت نے ان کو فکر و نظر کی ان لطافتوں اور براقیوں سے محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سے وحی کی کیفیتیں سمجھ میں آسکتی ہیں اور زندگی کی بیرونی الجھنوں کی ہمہ ہمی نے انھیں اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ باطن میں غواصی کر سکیں اور قلب و فکر کے اندرونی جلووں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

## دوسری رائے کی غلطی:

دوسری رائے بھی قابل قبول نہیں، کیوں کہ نبوت کو موضوعی ماننے کی صورت میں اشکال یہ ہے کہ:

> اس صورت میں اللہ تعالیٰ کو اقدار (Value) کے معاملے میں ناطرف دار (indifferent) ماننا پڑے گا، جو صحیح نہیں۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ:

> اس طرح انبیا کے پیغام و دعوت میں جو ایک طرح کی یکسانی اور غرض و غایت کی وحدت پائی جاتی ہے، اس کی کوئی علمی توجیہہ نہیں بیان کی جا سکے گی۔

اللہ تعالیٰ ناطرف دار ہے۔ اس کی تردید خود نظام کائنات سے ہوتی ہے، چنانچہ ہر شخص جو اس دبستان ہست و بود پر نظر ڈالے گا ایک خاص طرح کی توجہ و کرم گستری کو محسوس کرے گا، اس کے ایک ایک مظہر میں نوع بنوع کے فیضان و تودد کو دیکھے گا اور اس کے ایک ایک گل بوٹے میں اس کی شفقت و رحمت کو جھلکتا ہوا پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے خدا کا انکار کیا اور یہ سمجھا کہ یہاں جو کچھ ہے، مادہ ہی کا کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے، وہ بھی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکے کہ یہ کائنات بہ ہر حال اپنا ایک متعین نظام رکھتی ہے اور اس کے سامنے ایک ذی شعور انسان کی طرح ترقی و تکمیل کی متعین منزلیں اور نصب العین ہیں، جن کی طرف یہ تیزی اور باقاعدگی سے رواں دواں ہے۔

کائنات کے بارے میں یہی وہ تازہ ترین نقطۂ نظر ہے، جس کی وجہ سے مادہ پرست حضرات بھی اس اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں کہ مادی ارتقا کے معنی صرف طبعی ارتقا ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اس میں اقدار، معاشرہ اور انسانی فکر و اجتہاد کی ترقی بھی شامل ہے۔ گویا ان میں اور خدا پرستوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جن اقدار کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ انھی اقدار کو مادی ارتقا کے ممکنات کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مادہ اقدار حیات کے معاملے میں ناطرف دار نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات اس کے مضمرات میں شامل ہے کہ طبعی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان اخلاقی و روحانی اقدار کے لحاظ سے بھی ترقی کرے۔

یہ حال اگر مادے کا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناظرف داری یا عدم تعلق کا خیال کس درجہ غلط ہو گا' اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجیے۔ مزید بر آں مذہب جب خدا کے تصور کو پیش کرتا ہے تو وہ بہ ہر حال ایسی ہستی سے تعبیر ہے' جس میں بے پناہ محبت ہے' بے اندازہ رحم و عفو ہے اور بے پایاں کرم و تفضل ہے۔ یہ ہستی ہماری روحانی ضروریات سے بے گانہ کیوں کر رہ سکتی ہے؟

## نبوت کے دو تصور:

متعلقات نبوت کی وسعتیں کن کن مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں' اس کی فہرست ذرا طویل ہے' اس میں یہ سوال بھی داخل ہے کہ عقل و خرد کی موجودہ فتوحات کے بعد اس کی ضرورت کن معنوں میں ہے۔ اسی طرح یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے کہ نبوت وہبی ہے یا کسبی؟

تیسرا اہم سوال جو ہمارے نزدیک سرفہرست اور فیصلہ کن حیثیت کا حامل ہے یہ ہے کہ اس کی نوعیت و مزاج کیا ہے؟ کیا یہ کسی مکانکی (Mechanical) حقیقت کا نام ہے؟ یا ایسی حقیقت سے تعبیر ہے جو مکانکی نہیں ہے' بلکہ تعلیم و تربیت اور مخصوص قسم کی نگرانی و حفاظت کی مقتضی ہے؟

پہلے دو نکات کی وضاحت و تشریح دقیق فلسفیانہ ذوق اور عمیق متصوفانہ بصیرت چاہتی ہے۔ اس لیے ہم سر سردست ان سے تعرض نہیں کرتے۔ یوں بھی ہمارے موضوع سے اس کا تعلق اتنا گہرا نہیں۔ تیسرا سوال البتہ توجہ طلب اور اہم ہے۔ یہی نہیں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارے مضمون کی اصلی روح (Theme) اور جان ہے۔

## مکانکی تصور کی تشریح:

مکانکی تصور نبوت اور غیر مکانکی تصور نبوت میں کیا فرق؟ پہلے ہی قدم پر اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ کیوں کہ اسی کے فہم و ادراک پر آئندہ مباحث کا انحصار ہے۔ اگر اس فرق کو پوری طرح سمجھ لیا گیا' تو پھر ذہن صاف ہے اور کج بحثی کی کوئی کوشش کامیاب ہونے والی نہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس فرق کے ممیزات واضح نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قلب و ذہن کو گمراہی سے بچانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

جب ہم نبوت کو مکانکی عملیہ (Mechanical Process) کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کچھ اس قسم کی چیز ہے جیسے واٹر بکس کا پانی‘ کہ جس مقدار میں چھوڑا جائے گا‘ اتنا ہی نل میں سے برآمد ہو گا‘ اور جب نہیں چھوڑا جائے گا تو ایک بوند اور نمی کی کم سے کم مقدار بھی ٹونٹی سے خارج نہیں ہو گی۔

اسی مثال کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ وہ پانی جو اس نل سے نکلتا ہے‘ اگرچہ دنیا جہاں کو سیراب کرتا ہے اور ایک ایک شے کو زندگی اور تازگی بخشتا ہے‘ تاہم لوہے کی وہ نالی جس میں سے کہ یہ پانی گزرتا اور بہتا ہے‘ اس کی جاں بخشیوں سے قطعی متاثر نہیں ہو پاتی‘ بلکہ اس کی صلاحیت اور سختی جوں کی توں بغیر کسی تاثر پذیری کے اسی طرح قائم رہتی ہے‘ اور پانی کی فطرت و تاثیر کبھی بھی اس لائق نہیں ہو پاتی کہ اتصال پیہم کے باوجود اس کے مزاج آہنی کو بدل سکے‘ یا شب و روز کی دوستی اور رفاقت کے باوصف اس کی صلابت و سختی میں رخنہ انداز ہو سکے۔

مثال نامکمل رہے گی اگر اس کے اس پہلو پر بھی غور نہ کر لیا جائے کہ لوہے کی اس نالی کے لیے جس میں سے پانی گزرتا ہے‘ ضروری نہیں کہ اس کا اس طرح انتخاب کیا جائے کہ اور کوئی لوہا اس میں اس کا حریف نہ ہو سکے‘ اور جس سے یہ نالی بنتی ہے‘ اور دوسری کوئی چیز اس سے نہ بنائی جا سکے۔ بلکہ اس سلسلے میں صرف اتنی ہی احتیاط برتی جاتی ہے کہ لوہا بہ ہر حال مضبوط ہو اور اس مقصد کو پورا کرتا ہو‘ اس سے اور کتنی چیزیں تیار ہو سکتی ہیں؟ اس سے کچھ غرض نہیں۔

مثال کے ان تینوں پہلوؤں کو اب اگر آپ اس تصور نبوت پر چسپاں کر کے دیکھیں گے جسے ہم مکانکی نبوت سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کے لازمی معنی یہ ہوں گے کہ:

۱۔ پیغمبر صرف اس بات کا مکلف ہے کہ وحی الٰہی کو جوں کا توں انسانوں تک پہنچا دے۔ اپنی طرف سے تشریح‘ تعبیر اور تفصیلات کا نہ صرف یہ کہ مکلف نہیں ہے بلکہ مجاز بھی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ:

۲۔ نبوت کے اس فیضان سے اس کا قلب و ذہن متاثر نہیں ہوتا اور نہ اس کی روشنی سے اس کی اجتہادی صلاحیتوں میں تنور ہی پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری نہیں کہ وحی کی کیفیتیں اس کے مزاہ و کردار کو بدل کر رکھ دیں اور اس کے عمل و سیرت کے مختلف النوع گوشوں کو اس طرح چمکا دیں کہ اس کی زندگی بہ حیثیت مجموعی

دوسروں کے لیے اسوہ و نمونہ قرار پا سکے۔

۳۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کی شخصیت منتخب اور چیدہ ہو' اور کوئی دوسرا شخص اس کا سہیم و شریک نہ ہو سکے۔ بلکہ اس انداز کی وحی کے لیے وہ انسان موزوں ہو سکتا ہے' جس میں اتنی صلاحیت ہو کہ اس وحی کو یاد رکھ سکے' اور بغیر کسی کمی بیشی کے اس کو پیش کر سکے۔

## غیر مکانکی تصور کی وضاحت:

یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ غیر مکانکی نبوت کے خدوخال کی وضاحت کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نبوت مکانکی نہیں ہے تو اس سے کن لوازم اور تقاضوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل نکات درخور اعتنا ہیں:

۱۔ پیغمبر اپنے منصب و عہدہ کے اعتبار سے صرف اسی بات کا مکلف نہیں ہے کہ وحی الٰہی کے الفاظ و حروف کو من و عن لوگوں تک پہنچا دے۔ بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس وحی کے اجمالات کی تشریح کرے' اس کی فکری و عملی گتھیوں کو سلجھائے اور لوگوں کے سامنے اس کو بطور ایک قابل فہم نظام حیات کے پیش کرے۔

۲۔ نبوت کا فیضان ایسا نہیں ہے کہ ذہن و فکر کی صلاحیتیں اس سے متاثر نہ ہوں یا یہ کہ پیغمبر کا قلب و دماغ اس سے کوئی روشنی اور بصیرت و گہرائی حاصل نہ کرے' بلکہ اس کے برعکس وحی کے یہ معنی ہیں کہ یہ اتنی فعال' ایسی موثر' اور انقلاب آفریں طاقت ہے جو پیغمبر کے پورے نظام فکر کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ نبیؑ اس سے نہ صرف یہ کہ متاثر ہوتا ہے' اسی کے مطابق سوچتا اور غوروفکر کرتا ہے بلکہ اسی کی روشنی میں' سیرت و کردار کے بچے تلے قدم بھی اٹھاتا ہے۔

۳۔ اس مشن کی اہمیتوں اور ذمہ داریوں کے پیش نظر منصب نبوت پر صرف اسی شخص کو فائز کیا جاتا ہے جو اس کا پورا پورا اہل ہو' جس کی ذہنی و عملی صلاحیتیں درجہ کمال تک پہنچی ہوں' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا انسان ان خوبیوں میں اس کا ساجھی اور شریک نہیں ہو پاتا۔ یعنی یہ اپنی ذہنی و طبعی استعداد کے لحاظ سے' اپنے

دور و عہد کے تمام لوگوں سے کہیں بڑھ کر اونچا اور بلند ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم غیر مکانکی تصور نبوت کے لوازم پر، قرآن کی تصریحات اور اس کے انداز بیان کی روشنی میں گفتگو کریں اور غور و فکر کے مختلف پیمانوں سے اس کے حق و صواب ہونے پر دلائل قائم کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مکانکی تصور نبوت کا تاریخی پس منظر بیان کر دیں۔

یہ تصور دراصل یہودی نژاد (Hebres. Sinvention) ہے، جس کو از راہ جدت طرازی کچھ مسلمانوں نے بھی اپنا لیا ہے۔ نہ جانا بھی کتنے مزے کی بات ہے۔ یہ سادہ لوح اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اس تصور کو اپنانے سے مذہب و دین کی اصلی روح ہی ختم ہو جاتی ہے اور منصب نبوت ہی سرے سے اس لائق نہیں رہتا کہ اس کی پیش کردہ تعلیمات کو شائستہ التفات سمجھا جائے۔

یہودی، انبیا کے بارے میں یہ خیال رکھتے تھے کہ وہ صرف صحیفوں اور کتابوں کو پہنچا دینے کے مکلف ہیں، فکر و کردار میں ان کی تعلیمات کو سمونا ان کے فرائض میں داخل نہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے بائبل میں ہر طرح کے گناہوں کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس کی ذات اور منصب نبوت کے منافی نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ یہاں آپ دیکھیں گے کہ حضرت لوط اپنی بیٹیوں کو زنا کے لیے پیش کرتے ہیں، نوح شراب کی بدمستی میں ننگا ہو کر ناچتے ہیں اور حضرت سلیمان اپنی مشرک بیویوں کی خوش نودی حاصل کرنے کی خاطر شرک اور بت پرستی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ معاذ اللہ! نظریہ اور تصور کی گمراہیاں انسان کو حق و صداقت سے کس قدر دور ہٹا دیتی ہیں۔

## دلائل پر بحیثیت مجموعی غور کرنا چاہیے:

آیئے اب ہم غیر مکانکی تصور نبوت کے لوازم پر قرآن کی تصریحات کی روشنی میں غور کریں۔ مگر اس سے پہلے ایک اصول ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے اور وہ یہ کہ جب ہم کسی مسئلے کو بحث و تمحیص کا ہدف ٹھہرائیں تو اس کے بارے میں ان تمام دلائل اور پہلوؤں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنا چاہیے، جن سے کہ زیر بحث مسئلے کی تعیین و تشریح میں مدد ملتی ہو۔

ایک ایک دلیل اور ایک ایک پہلو پر منفرداً بحث، غلط فہمیوں کا موجب بن سکتی ہے، مثلاً اگر کسی مسئلے کی حیثیت یہ ہے کہ دلائل کا ایک انبار اور مویدات و شواہد کی ایک بھیڑ اس کی تائید میں ہے تو پہلے سوچنے کی چیز یہ نہیں کہ فرداً فرداً ان دلائل و شواہد کی اس کثرت کے معنی کیا ہیں؟

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ منطقی طور پر کبھی کبھی ایک ہی دلیل ایسی استوار، ایسی جچی تلی اور

جامع ہو سکتی ہے کہ اثبات دعویٰ کے لیے اس پر اکتفا کیا جا سکے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ تمام متعلقہ دلائل کا تجزیہ ہونا چاہیے اور ایک ایک دلیل کو عقل و خرد کے معیاروں پر اچھی طرح جانچنا چاہیے۔ ہم عمل تحلیل و تجزیہ کی قدر و قیمت گھٹانے کے حامی نہیں۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اگر صورت حال یہ ہو کہ ایک دعوے کی تائید فکر و نظر کے مختلف النوع بیانوں سے ہوتی ہو اور متعدد دلائل سے اس کے مختلف متعلقات کی استواری و صحت کا ثبوت مہیا ہوتا ہو، تو قطع نظر اس کے کہ تجزیہ و تحلیل سے اس دعوے پر کہاں تک روشنی پڑتی ہے، ایک زبردست دلیل اس دعوے کے قابل لحاظ ہونے کی یہ بھی ہے کہ اگر یہ نظریہ بجائے خود صحیح نہیں ہے تو اتنے سارے دلائل کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ محض بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی ہے، یا نفس مسئلے کی سچائی اور حقانیت ہے کہ جس نے شواہد و بینات کے اتنے بڑے لشکر کو محاذ پر لا کھڑا کیا ہے۔

دلائل میں بحیثیت مجموعی کس قدر قوت ہوتی ہے اور تجزیہ و تحلیل سے ان کو پھیلا دینے اور منتشر کر دینے سے اس میں کس درجہ کمی آجاتی ہے، اس کو اس مثال کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ کہ اگر بجلی کے دس قمقمے ایک ہی کمرے میں ضیا گستر ہوں تو بحیثیت مجموعی کمرے میں انوار کا کیا عالم ہو گا؟ اور اگر ان کو دس الگ الگ کمروں میں تقسیم کر دیا جائے تو روشنی کی مقدار کس درجہ گھٹ جائے گی۔

## پیغمبر معلم و مزکی ہوتا ہے:

اس مختصر تمہید کے بعد غیر مکانکی تصور نبوت کے لوازم کو ترتیب وار مگر ایک ساتھ قرآن کے آئینے میں دیکھیے۔ ہم نے ابھی عرض کیا کہ پیغمبر اپنے عہدہ و منصب کے اعتبار سے صرف اسی بات کا مکلف نہیں ہے کہ وحی الٰہی کے الفاظ و حروف کو من و عن لوگوں تک پہنچا دے۔ بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس وحی کے اجمالات کی تشریح کرے، اس کی فکری و عملی گتھیوں کو سلجھائے اور لوگوں کے سامنے اس کو بطور ایک قابل فہم نظام حیات کے پیش کرے۔

آسانی بحث کے خاطر اس بیان کو دو حصوں میں تقسیم کر لیجیے۔ اس کے لوازم کی تشریح اور خود اس بیان کا اثبات۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ پیغمبر صرف کتاب اللہ کو پیش کر دینے والا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا شارح اور ترجمان بھی ہوتا ہے۔

اگر بیان و دعوے کی یہ نوعیت ہی بجائے خود محل نظر ہو تو اس کے لوازم بطریق اولیٰ محل نظر

ہوں گے۔ اس مناسبت سے پہلے اس بیان و دعویٰ ہی کی حقانیت کو قرآن کی تصریحات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کیجیے۔

قرآن حکیم نے پیغمبر کے منصب کو ایک معلم و مزکی کا منصب قرار دیا ہے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ (بقرہ: ۱۵۱)

(جس طرح من جملہ اور نعمتوں کے ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں، جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے، تمہارا تزکیہ کرتے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (آل عمران: ۱۶۴)

(خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے، جب کہ ان میں ایک رسول بھیجا، جو انہی میں سے ہے، یہ ان کو اللہ کا پیغام سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک اس سے پہلے یہ واضح گمراہی میں تھے۔)

## تعلیم و تزکیہ کے تقاضے:

غرض یہ کہ یہ ذات گرامی جس قوم میں مبعوث ہوئی، وہ نہ صرف یہ کہ طرح طرح کی گمراہیوں اور ضلالتوں میں گرفتار تھی بلکہ زیور تعلیم سے بھی محروم تھی اور نہیں جانتی تھی کہ نبوت کا تصور کیا ہے؟ دین کسے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو وقتاً فوقتاً انبیا بھیجے ہیں ان کا طریقہ اور اسلوب رہنمائی کیا تھا؟ وہ کس نظریات و افکار کے حامل تھے؟ کن اخلاقی و دینی قدروں کے مبلغ تھے اور کس نوع کے معاشرے کو دنیا میں قائم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے؟

ایسے ماحول میں جہاں علم مفقود ہو، دین کے ابتدائی تصورات تک کا قحط ہو اور اخلاق و کردار کی کمزوریوں کا یہ عالم ہو کہ کوئی گناہ اور لغزش ایسی نہ ہو، جس سے ان کا دامن عمل آلودہ نہ ہو،

کس نوع کا پیغمبر مبعوث ہونا چاہیے اور کس انداز کی اصلاحی کوششیں بروئے کار آنا چاہئیں۔ یہ بالکل ظاہر ہے۔

اگر ان میں ایسا پیغمبر آتا ہے، جو اللہ کی کتاب ہی کو ان تک پہنچا دیتا ہے اور اس گری ہوئی اور پس ماندہ قوم کی تربیت میں دلچسپی نہیں لیتا اور ایک معلم و مزکی کی حیثیت سے ان کے ذہن کو اونچا نہیں کرتا، ان کی سیرت کو پاکیزہ نہیں بناتا اور کتاب و حکمت کے ایک ایک نقطے کی تشریح نہیں کرتا، یا انسانی ذہن و فکر کی پیچیدگیوں سے تعرض نہیں کرتا، تو اس کا آنا بے کار ہے؟

معلم و مزکی کا لفظ یہاں خصوصیات سے غور طلب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ:

اس کا تعلق اپنے طلبہ سے سرسری قسم کا نہیں ہے کہ کورس اور نصاب کی مجوزہ کتابیں ان کے ہاتھ میں دے دے اور بے فکر ہو کر بیٹھ جائے، بلکہ اس پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کتاب ہدیٰ کی جملہ تفصیلات کو ان کے ذہن نشین کرے، ان کے دلوں میں ابھرنے والے سوالات کا تسلی بخش جواب دے، ان کے اعتراضات کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تعلیم و زندگی میں ربط و تعلق کی جو کیفیت ہے اس کو واضح کرے، اور اپنے قول و عمل سے ان کو یقین دلائے کہ جو معیار اور نمونے دوران تعلیم میں اس نے بیان کیے ہیں، وہ خود بھی ان پر عمل پیرا ہے۔

## پیغمبر کی شاہدانہ حیثیت:

معلم و مزکی کے علاوہ پیغمبر کو امت و معاشرے کا شاہد یا نگران بھی کہا گیا ہے، جسے تزکیہ ہی کا تکملہ کہنا چاہیے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ (مزمل: ۱۵)

(ہم نے تمہارے پاس رسول بھیجا، جو تم پر نگران یا شاہد ہے۔)

اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول، صرف یہی نہیں کہ کتاب اللہ کو پہنچا دینے کا مکلف ہے یا اس کا ذمہ دار ہے کہ اس کی پیش آمدہ مشکلوں کو حل کر دے، بلکہ وہ اسلامی معاشرے کا نگہبان اور نگران بھی ہے۔ اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ معاشرے کی نقل و حرکت اور ارتقا پر کڑی نظر رکھے اور یہ دیکھے کہ ان میں کوئی بدعت تو رواج نہیں پا رہی ہے؟ کوئی غلط فہمی تو نہیں پھیل رہی ہے اور اس کا رخ، غلط سمت یا تنزل کی طرف تو نہیں مڑ گیا ہے؟ اس کے فرائض میں

بحیثیت اللہ کے رسول کے یہ بھی شامل ہے کہ یہ اس معاشرے کو عملی اور معیاری بنانے کی کوشش کرے، اس کی لغزشوں کی اصلاح کرے، اس کی تنظیم کرے اور اس کو اس قابل بنائے کہ یہ مادی و روحانی مسرتوں سے ہم کنار ہو سکے اور ارتقاو تکمیل کی تمام منزلیں طے کر سکے۔ گویا تصور نبوت کے ساتھ وابستہ ایک بہت بڑی ذمہ داری، تفہیم و وضاحت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اسے ہمہ وقت امت و معاشرے کی تمام فکری و عملی اصلاحات میں مصروف رہنا چاہیے۔ ظاہر ہے، مکانکی تصور نبوت کے فرائض اس کے مقابلے میں کہیں کم اور سمٹے ہوئے ہیں۔

## لوازم نبوت:

تصور نبوت کے اس مختصر تجزیے کے بعد آیئے ہم غیر مکانکی تصور نبوت کے لوازم کو بحث و نظر کا موضوع ٹھہرائیں۔ ہمارے نزدیک اگر یہ بات صحیح ہے کہ فرائض نبوت میں نظریہ و فکر کے اجمالات کی تشریح بھی شامل ہے اور منصب نبوت کے معنی ایک ایسے روحانی فیضان سے بہرہ مندی کے ہیں کہ اس سے کردار و سیرت کے لطائف تک ہر ہر شے متاثر ہو۔ نیز اگر پیغمبر سے مراد ایسی بے عدیل شخصیت کے ہیں جو اپنے دور میں فکر و عمل کے لحاظ سے سب سے اونچی سطح پر متمکن ہو تو اس کے منطقی لوازم یہ ہوں گے کہ

۱۔ کتاب اللہ کے بارے میں اس کی تعبیر و ترجمانی کا انداز وہ نہ ہو جو ایک دنیاوی سربراہ کا ہوتا ہے، اور مسائل کی تشریح و توضیح میں استدلال و استنباط کے ان طریقوں کو استعمال نہ کرتا ہو جنھیں ایک عام مجتہد، یا عالم کام میں لاتا ہے، بلکہ اس کا انداز ایک پیغمبر کا انداز ہونا چاہیے کہ جس کے ذہن و فکر کی نشوونما اور حفاظت و صیانت کی ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا ہو۔

۲۔ اس کے اجتہادات کی حیثیت ایسے مجتہد یا حاکم وقت کی نہ ہو کہ جس سے اختلاف رائے کی شرعاً اجازت ہے، بلکہ اس کی حیثیت بجائے خود ایک سند کی ہونا چاہیے اور صحت و استناد کے ایسے قطعی پیمانے اور کسوٹی کی ہونا چاہیے کہ جس کو نہ ماننا کفر و نفاق کے مترادف ہو اور ماننا شرط ایمان!

## فقیہہ اور پیغمبر کے طریق میں فرق:

اس مرحلے میں سب سے پہلے یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ مجتہد اور پیغمبر کے طریق اجتہاد میں کیا فرق ہے؟ اور پیغمبر کی بیان کردہ تشریحات کن معنوں میں مجتہد کی بیان کردہ تفصیلات سے مختلف ہوتی ہیں؟ حاکم یا سربراہ کی حیثیت بھی چوں کہ مجتہد ہی کے تابع ہوتی ہے‘ اس لیے اس نکتے پر جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں۔

جن لوگوں نے اصول فقہ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ استدلال و استنباط مسائل میں ائمہ مجتہدین کن طریقوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ یوں سمجھ لیجیے‘ کہ تفریع مسائل کے دو جانے بوجھے انداز ہیں۔ یا تو مجتہدین کے سامنے کچھ عام اصول اور پیمانے ہوتے ہیں جنھیں وہ فروع و جزئیات پر منطبق کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ جزئیات و فروع ان کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور یا پھر آیت و حدیث کے الفاظ سے کچھ معانی مستنبط کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لغت و ادب‘ یا قواعد و فن کے نقطۂ نظر سے اس استنباط کی تائید ہو پاتی ہے یا نہیں‘ یعنی ان کا طریق استدلال بالواسطہ یا بلا واسطہ‘ بہرحال لسانیاتی (Linguistic) اور فنی ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ استدلال و قیاس کے کچھ اور نہج بھی ہیں‘ جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ:

> پیغمبر جب تشریح و ترجمانی کے فرائض انجام دیتا ہے تو آیا اس کے سامنے کسی ایک مجتہد کی طرح کچھ اصول ہوتے ہیں‘ جنھیں یہ مطلوبہ جزئیات پر پھیلا دیتا ہے اور آیا یہ بھی ایک فقیہہ اور اصولی کی طرح ادب و بیان کے فنی ضابطوں کی روشنی میں وضاحت و تفصیل کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔

ہمیں اصولاً اس موقف کے مان لینے میں کوئی تامل نہیں۔ اس لیے کہ اگر پیغمبر کسی مافوق طریق استدلال سے کام نہیں لیتا اور اس کی تشریح و تعبیر وحی یا ذوق نبوت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ نہیں تو منطقی طور پر اس کا طریق فہم و استدلال وہی ہونا چاہیے جو ایک مجتہد اور فقیہہ کا طریق فہم و استدلال ہے‘ اور کوئی تیسری صورت ذہن و فکر کی گرفت میں آنے والی نہیں!

بات بالکل واضح ہے۔ پیغمبر یا تو اپنی پوری فکری و عملی زندگی میں پیغمبر ہے‘ اور یا پھر زندگی کے

بعض گوشوں میں پیغمبر نہیں ہے' بلکہ اسی عام سطح پر فائز ہے جس پر کہ ایک غیر پیغمبر شخص فائز ہو سکتا ہے' اور فرض کیجیے کہ یہ گوشہ کلام الٰہی کے ذوق و فہم کا گوشہ ہے۔ اس گوشے میں اگر پیغمبر پیغمبر نہیں ہے (حالاں کہ اسی ایک گوشے میں اسے پیغمبر ہونا چاہیے) تو اس کا ذوق و فہم ایک مجتہد کے ذوق و فہم سے قطعی مختلف نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

> پیغمبر اپنے وقت کا سب سے اونچا' اور سب سے بہتر فقیہہ ہوتا ہے۔

ہم اسے سہولت بحث کی خاطر تسلیم کر لیتے ہیں' اگرچہ نبوت کو مکانکی ماننے کے بعد اس حسن ظن کے لیے مشکل ہی سے کوئی وجہ جواز سمجھ میں آتی ہے' اس لیے کہ جب پیغمبر صرف کلام الٰہی کے ابلاغ کی حد تک پیغمبر ہے' اس کی تشریح و توضیح کی حد تک نہیں' تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ اس گوشے میں وہ ایک عام انسان ہے جو ذہنی و فکری اعتبار سے بہت اونچا بھی ہو سکتا ہے اور نسبتاً کم درجے کا بھی۔ مکانکی تصور نبوت بہرحال کسی نوع کی ذہنی برتری و فضیلت کا ضامن نہیں!

## آسان طریق فیصلہ:

جب یہ طے ہے کہ پیغمبر کا طریق استدلال و فہم' جانا بوجھا' فقہی اور فنی طریق استدلال و فہم ہے' جو ہرگز فوق الفطرت نہیں' وحی نہیں' تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ:

> شریعت اسلامی کے جس قدر تفصیلی مسائل ہیں ان سب کو کلام الٰہی سے بطریق فن مستنبط ہونا چاہیے۔

اگر یہ صحیح ہے تو کیا قرآن کی طرف دعوت دینے والوں میں سے کوئی صاحب نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور معاملات کی وہ جملہ تفصیلات قرآن سے بطریق فن مستنبط کر کے دکھا سکتے ہیں' جن کا کم از کم وقتی شریعت ہونا خود ان کے ہاں بھی مسلم ہے۔

اس معاملے میں ہم یہاں تک جانے کو تیار ہیں کہ تفصیلات اور مسائل کی عملی صورتوں کو ہم متعین نہیں کرتے' بلکہ ان لوگوں کو کھلی اجازت دیتے ہیں کہ نماز کا کوئی سا نقشہ مرتب کر کے دکھائیں' روزے کے بارے میں جزئیات کا کوئی سا ڈھانچا بنائیں' اسی طرح حج' زکوٰۃ کے مسائل و فروع کو کسی ڈھنگ سے ترتیب دیں اور سجائیں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارا مطالبہ نہایت اختصار اور دردمندی کے ساتھ صرف یہ ہے کہ جس نقشے کو لیں' آپ قرآن کی تفصیل قرار دیں' اور یہ کہیں کہ رسول نے ایسی تفصیل ہم تک پہنچائی ہے' اس کو بطریق فن قرآن سے مستنبط

کر کے دکھا دیجیے‘ اس سے زیادہ کے ہم خواہاں نہیں اور خواہاں ہوں تو مجرم!

اس میں بھی شاید کچھ دشواریاں ہوں‘ ہم فیصلے کا اس سے بھی آسان تر طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قرآن میں کوئی سا ایسا مسئلہ چن لیجیے جس کی جزئیات ہوں اور جس کے فروع کا ایک متعین نقشہ ہو۔ آپ بس اتنا ہی کر کے دکھا دیجیے۔ کہ بطریق فن ان جزئیات کا قرآن سے ثابت ہونا متحقق ہو جائے۔۔۔ اور اگر صورت معاملے یہ نہیں ہے‘ یعنی مسائل اور شریعت کا یہ انداز کسی طرح بھی قرآن سے مستنبط نہیں ہے تو پھر نہایت سمجھ داری سے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ پیغمبر کا طریق فہم و استدلال‘ عام مجتہد و فقیہہ کے طریق فہم و استدلال سے کہیں مختلف ہے۔

ہم نہیں چاہتے کہ قرآن سے ہٹ کر کوئی بات بھی محض فلسفہ آرائی کے جوش میں کہیں۔ لوازم نبوت کے بارے میں ہمارے اس تجزیے کی تائید قرآن سے ہوتی ہے کہ:

> پیغمبر کے انداز تشریح کو غیر معمول طریق کار کا حامل ہونا چاہیے اور دین کے بارے میں اس کے قول و عمل کو سند اور حجت ماننا چاہیے۔

کیوں کہ اگر کتاب اللہ کی روشنی میں پیغمبر ایسی ذات گرامی سے تعبیر ہے جس کی عصمت فکر و عمل کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے‘ اگر نبی کے معنی نصوص قرآن کے ماتحت یہ ہیں کہ

> اللہ تعالیٰ نے اس کو تبیین کے ذمہ داریوں سے نوازا ہے‘ اس کی اطاعت و فرماں برداری کو فرض ٹھہرایا ہے اور اس سے اختلاف و شقاق کو کفر و نفاق کے مترادف قرار دیا ہے تو
>
> منطقی طور پر اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ:
>
> اس کی حیثیت ایک سربراہ‘ ایک معمولی شارح اور وقتی قائد کی نہ ہو‘ بلکہ ایک دائمی سرچشمۂ ہدایت کی ہو!

ہم چاہتے ہیں کہ بحث و نظر کے اس مرحلے پر بغیر کسی مزید تشریح اور تاخیر کے آنحضرت کے بارے میں ان آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیں جو ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کرتی ہیں اور جن سے بادنیٰ تامل معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت کے مقام بلند کی عظمتیں کس نوع کے

تعلق و ربط کی متقاضی ہیں۔

## پیغمبر کی عصمت فکر و عمل:

کیا پیغمبر فکر و عمل کے اعتبار سے معصوم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی صحت فکر و عمل کی شہادت دی ہے؟ پہلے اس نکتے پر غور کیجیے!

> قرآن حکیم میں اس نوع کی بکثرت آیات ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ جب کسی شخص کو منصب نبوت سے بہرہ مند کیا جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ بغیر کسی مناسبت کے کسی ایک کو اس غرض کے لیے مکلف ٹھہرا دیا، بلکہ مختلف اعتبارات سے اس کو جانچا پرکھا اور منتخب کیا جاتا ہے۔

ارشاد ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ط (انعام: ۱۲۴)

(اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کا کون سا محل ہے اور اس عظیم منصب کے لیے کس کو چنتا یا منتخب کرنا چاہیے۔)

حضرت ابراہیم سے متعلق وضاحت ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیا: ۵۱)

(اور ہم نے ابراہیم کو نبوت سے پہلے ہی رشد و ہدایت سے بہرہ مند کر رکھا تھا، اور ہم ان کے حال سے واقف تھے۔)

حضرت نوح نے جب کشتی بنانا چاہی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (ھود: ۳۷)

(اور کشتی ہمارے روبرو، ہماری ہدایت کے مطابق بناؤ۔)

ظاہر ہے کہ کشتی بنانا مستقل وحی یا اس کلام الٰہی کا کوئی حصہ نہیں ہے کہ جسے حضرت نوح پر نازل کیا گیا بلکہ یہ تو تکمیل وحی کا ایک عملیہ (Process) ہے، جس کا تعلق متن کتاب سے بہرحال نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں بسر ہوتی ہے۔

عام انبیا کے بارے میں اجتبا کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مَنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران: ۱۷۹)

(البتہ خدا اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہتا ہے انتخاب کر لیتا ہے۔)

حضرت موسیٰ کو نبوت عطا کی تو ارشاد فرمایا:

يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ

(الاعراف: ۱۴۴)

"اے موسیٰ! میں نے تمھیں لوگوں میں سے اپنے کلام کے لیے اور عہدۂ نبوت کی ذمہ داریوں کے لیے چن لیا ہے۔"

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ "کلام" اور "رسالت" دو مختلف چیزیں ہیں۔ "کلام" کا تعلق تو صرف توراۃ سے ہے اور "رسالات" کی وسعتیں پوری زندگی کی تگ و دو کو شامل ہیں۔

انتخاب و اصطفا کے اسی ہمہ گیر قانون کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا اور بتایا کہ انسانوں میں تو یہ ہوتا ہی ہے، فرشتے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ان میں بھی سب کو اس کا اہل نہیں قرار دیا جاتا کہ اللہ کے پیغام کو اس کے منتخب بندوں تک پہنچائیں۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط (الحج: ۷۵)

"خدا فرشتوں اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو چن لیتا ہے۔"

## (۱۵)

# وضاحت و تبیین کی ذمہ داریاں اور اطاعت رسول

کیا وضاحت و تبیین کی ذمہ داریاں پیغمبر پر عائد ہوتی ہیں؟ اس نکتے پر بھی قرآن ہی کی روشنی میں غور کیجیے۔

قرآن نے اس سلسلے میں ایک نہایت پر معنی اور فیصلہ کن اصول بیان فرمایا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط (ابراھیم : ۴)

"اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا' جو دوسروں کی زبان بولتا ہو۔ ہر ہر پیغمبر کو اس کی اپنی زبان میں مخاطب کیا تاکہ وہ انھیں احکام الٰہی کھول کول کر بتائے۔"

ارشاد فرمایا:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

(نحل : ۶۴)

"اور ہم نے جو تمھاری طرف کتاب نازل کی ہے تو اس لیے کہ جن جن باتوں میں ان کے ہاں اختلاف رونما ہے' تم پوری وضاحت سے ان کو بیان کر دو۔"

اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بھی ظاہر فرمایا:

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ (قیامہ: ۱۹)

"پھر کتاب اللہ کی وضاحت و تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔"

کیا آنحضرت کی تشریحات حجت و سند کی حیثیت رکھتی ہیں اور آپ کو مطاع بنا کر بھیجا گیا ہے؟ قرآن ہی کی روشنی میں اس مسئلے کی وضاحت ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے بارے میں قرآن ایک اصول بیان کرتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (نساء: ۶۴)

"اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ بحکم خدا اس کا فرمان مانا جائے۔"

خصوصیت سے حضور ﷺ مطاع و مستند ہیں، اس پر شواہد و دلائل کی گوناگونی دیکھیے۔

قرآن میں ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ

(الاعراف: ۱۵۷)

"وہ جو محمد رسول اللہ کی جو نبی امی ہیں، پیروی کرتے ہیں، جس کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انھیں نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور برے کام سے روکتے ہیں، اور پاک چیزوں کو ان پر حلال کرتے ہیں، اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں، اور ان بوجھ اور طوق کو جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں۔"

بہت سی آیات ہیں جو براہ راست آنحضرت کی رسالت پر دلالت کناں ہیں۔ اس آیت کا انتخاب ہم نے اس بنا پر کیا ہے کہ اس میں علاوہ حضور کی پیروی و اطاعت کے یہ بھی مذکور ہے کہ آپ کو مسائل میں تحلیل و تحریم کی تبیین کا بھی حق ہے۔ یعنی آپ کی حیثیت صرف پیغام رساں

کی نہیں، آپ شریعت اسلامی کی وضاحت کرنے والے ہیں اور اشیا کی حلت و حرمت کا آخری فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان آیات کو جس مضمون پر ختم کیا ہے، وہ یہ ہے:

وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (اعراف: ۱۵۸)

”اور ان کی اطاعت کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔“

فرمایا:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (نور: ۵۴)

”کہہ دو خدا کی فرمانبرداری کرو اور رسول خدا کے حکم پر چلو۔“

فن معانی کے نقطۂ نظر سے یہ بات قابل غور ہے کہ اطاعت کا لفظ اس آیت میں دو مرتبہ آیا ہے، جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے رسول اللہ کی اطاعت بالذات اور بالاستقلال مقصود ہے، بالعرض نہیں، سورہ آل عمران میں، اس استقلال و خصوصیت کو زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔ (آل عمران: ۵۰)

”تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“

## اطاعت رسول کی تاکید کے اسباب: انبیا اور حکما میں فرق

اطاعت رسول کا حکم قرآن میں اس درجہ واضح، اس درجہ موکد اور تکرار لیے ہوئے ہے کہ اس کی کوئی تاویل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس معاملے میں لطیفے کا پہلو یہ ہے کہ آپ جن جن آیات سے اور جن جن طریقوں سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ثابت کریں گے بعینہ انہی آیات سے اور اسی اسلوب و نہج سے اطاعت رسول کا اصول نکھرتا چلا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اطاعت رسول کے مسئلے پر اس کثرت اور تنوع کے ساتھ قرآن نے روشنی ڈالنا کیوں ضروری سمجھا ہے؟ بہ ظاہر اس کی تین وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔

اول: اس لیے کہ دین مجرد (Abstract) نظریات کا نام نہیں بلکہ ایسے حقائق سے تعبیر ہے جو کسی شخص کی عملی زندگی میں جلوہ گر ہوں اور یہی وہ مقام ہے جہاں انبیا اور عام مفکرین کے مابین امتیازی خطوط زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ مفکرین اور حکما کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کائنات کے اسرار سربستہ کو معلوم کریں اور ان کو لوگوں تک پہنچا دیں، اقدار حیات کو بحث و نظر کا موضوع

ٹھہرائیں اور ان کو منظر عام پر لے آئیں' یا عقائد و ایمانیات کا از سر نو جائزہ لیں کہ ان میں صحت و صواب کی مقدار کتنی ہے اور غلطی اور لغزش کے عناصر کس درجہ ہیں۔ یہ حضرات جب اپنے افکار کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کر دیں اور اپنے نتائج تحقیق کو قلم و قرطاس کی زینت قرار دے لیں تو اپنے فرائض منصبی سے پورے طرح سبک دوش ہو جاتے ہیں' عمل و کردار کی ذمہ داریاں ان پر عائد نہیں ہوتیں' یہی نہیں ان سے اگر عملی لغزشیں سرزد بھی ہوں تو لوگ بد ظن ہونے کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان معمولی بشری کمزوریوں سے ان کے مرتبۂ بلند میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

چناں چہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا بیکن (Bacon) کی رشوت خوری نے' اس کے درجۂ فکر کی بلندیوں اور نقد و احتساب کی نزاکتوں کو کوئی نقصان پہنچایا' اور کردار و سیرت کی اس پستی سے اس کے ان احسانات علمی کو مغرب ایک لمحہ کے لیے بھی فراموش کر سکا؟

اسی طرح جوڈ (Joad) جو حال ہی کا ایک فلسفی ہے' اس نے سفر میں چند پیسے بچانے کے لیے رسوائی کی جس نوعت کو مول لیا' اس سے علمی حلقوں میں اس کی وقعت کم ہوئی اور فلسفے کی تشریح و ترجمانی میں اس نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں' ان سے انکار کیا گیا؟

جواب یہ ہے کہ نہیں۔ اس لیے کہ لوگ اس سے زیادہ کے ان سے متوقع ہی نہیں۔ ان کا یہی بہت احسان ہے کہ انھوں نے فکر و تصور کی زلف گرہ گیر کو سلجھانے اور سنوارنے میں مدد دی۔

انبیا علیہم السلام کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ یہ حضرات فکر و ذہن کی استواریوں کے ساتھ' عمل و سیرت کی رفعتوں سے بھی بہرہ مند ہوتے ہیں اور ان کے تقاضائے منصب میں یہ بات بھی داخل ہوتی ہے کہ یہ جن افکار و تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں' انھیں برت کر بھی دکھائیں' اور اس طرح تصور و فکر میں جو پہلو مجمل رہ گئے ہیں' اپنے روز مرہ کے عمل سے ان کی تفصیلات بھی فراہم کریں۔ یعنی ان کے فرائض میں صرف یہی بات شامل نہیں ہوتی کہ کسی نظریۂ حیات کو کھول کر بیان کر دیں بلکہ یہ اس بات کے بھی مکلف ہیں کہ لوگوں کے سامنے زندگی کا صاف ستھرا نمونہ بھی پیش کریں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا

اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (احزاب: ۲۱)

"تمھارے جذبۂ اطاعت کے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے' بشرطیکہ روز قیامت کی امید ہو' اور خدا کا کثرت سے ذکر کرنا مرغوب و محبوب ہو۔"

آیت کی ترتیب پر غور کیجیے' کس درجہ واضح لفظوں میں اس حقیقت کو بیان کردیا گیا ہے کہ اسوۂ رسول سے بے نیازی اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی شخص آخرت کو نہ مانتا ہو اور اس کا دل اللہ کی محبت سے تہی ہو' یا اطاعت رسول کی لذتوں سے وہی شخص محروم ہو سکتا ہے جو عقبیٰ کے انعامات پر ایمان نہ رکھتا ہو اور ذکر الٰہی کی بہرہ مندیوں سے جس کا دل بیگانہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے جو لوگ اطاعت و رسول کی اہمیتوں کو کم کرتے ہیں یا مصطفیٰ برساں کو دین کا اساسی نقطہ تسلیم نہیں کرتے وہ دراصل دہریہ ہیں۔

انبیا۔کے بارے میں اگر یہ رائے درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں حکما و مفکرین کے لیے گناہ و معصیت کا مسئلہ قطعی غیر ضروری ہے وہاں انبیا کے لیے نہایت درجہ ضروری ہے۔ ان نفوس قدسیہ کی زندگی کو اس درجہ پاکیزہ' اس درجہ مکمل' اور اس درجہ محبوب و دل نواز ہونا چاہیے کہ یہ دواعی عمل کو بیدار کر سکے اور اطاعت و فرماں برداری کے لطیف جذبات کو ابھار سکے' ورنہ کوئی شخص بھی پیغام و دعوت کی خوبیوں پر کان نہیں دھرے گا۔ یہ مسئلہ تشنہ رہے گا اگر اس مسئلے پر ایک نہایت ہی ناخوش گوار بحث کو ہم طے نہ کرلیں۔

## عصمت انبیا:

آج سے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے پاک و ہند میں مشنری مبلغین عیسائیت نے حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کو ثابت کرنے کے لیے یہ مہم شروع کی تھی کہ گناہ و معصیت کا ارتکاب انبیا سے نہ صرف عقلاً ممکن ہے بلکہ یہ مسلمہ تاریخی واقعہ بھی ہے کہ جس قدر انبیا آئے ہیں' ان سب سے گناہ سرزد ہوئے ہیں اور ان سب نے زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹھکرایا ہے۔

اس مہم کا آغاز حضرت آدم کی لغزش سے ہوا۔ پھر بائیبل سے چن چن کر ایسے مقدمات کی

نشان دہی کی گئی جن سے ان حضرات کا گنہگار ہونا ثابت ہوتا تھا' اور اس کے بعد تدریجاً قلم و تحریر کی گستاخیاں اس ذات اقدس تک پہنچیں جس نے نہ صرف یہ کہ خود نہایت ہی پاکیزہ زندگی بسر کی ہے بلکہ گزشتہ انبیا کی عصمت فکر و عمل کو بھی ثابت کیا ہے۔

ان کی ان تحریروں سے ہمارے ہاں بھی بحث و مناظرے کے حلقوں میں یہ نہایت ہی غیر موزوں بحث چل نکلی کہ انبیا معصوم ہوتے ہیں یا نہیں؟

عیسائی مشنریوں میں جو لوگ انبیا کو معصوم نہیں جانتے ان کا موقف بالکل واضح ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ نبوت چوں کہ وحی الہام کا ایک ناقص ظہور تھا' اس لیے منطقی طور پر ایک کامل ظہور کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ حضرت مسیح کی بہ صورت الوہیت جلوہ گری ہے۔ لیکن جو لوگ نبوت کو فطرت کا کامل اور ناقابل بدل ظہور قرار دیتے ہیں' وہ اس موضوع کو کیوں کر متنازعہ فیہ قرار دے سکتے ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

اس مسئلے کی وضاحت کے لیے لائق غور نکتہ دراصل یہ ہے کہ انبیا کے اشکال (Problems) پر بحث کی جائے۔ یعنی یہ بتایا جائے کہ انبیا کے سامنے فکر و عمل کی کون منزلیں ہوتی ہیں' جن تک یہ رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے' ان کی منزل ایک عام آدمی اور ایک مرتاض صوفی سے ہر حالت میں مختلف ہے۔ کیوں کہ ایک عام آدمی تو بس اتنا ہی چاہتا ہے کہ گناہ و معصیت کی موٹی موٹی صورتوں سے دامن بچائے اور بڑی بڑی اور بنیادی نیکیوں سے بہرہ مند ہو۔

صوفی کی تگ و تاز کا مرحلہ اس سے آگے کا ہے۔ وہ اس مقام پر فائز ہونا چاہتا ہے' جہاں برائیوں کا مطلق گزر نہ ہو' بلکہ نیکیوں اور حسنات کا سامنا ہو۔ گویا جسے آپ لوگ عصمت کہتے ہیں' وہ تو ایک صوفی کی منزل ہے۔

انبیا کا اشکال عصمت سے سوا ہے' اور ان کا مقام تو اس سے کہیں اونچا اور بلند ہے' وہ یہ چاہتے ہیں کہ:

> کردار و فکر کی عصمتوں کو' معاشرے میں منتقل کرکے دکھائیں' خود معصوم ہونا تو ان کے لیے ایک ادنیٰ منزل ہے۔
>
> ان کے منصب کا تقاضا تو یہ ہے کہ:
>
> پورے معاشرے میں پاکیزگی کی لہر دوڑا دیں۔

وَيُزَكِّيكُمْ (بقرہ: ۱۵۱)

"اور وہ تم میں پاکیزگی کو ابھارتا ہے۔"

## قوموں کی نفسیات دینی کا تقاضہ:

دوم: اطاعت رسول کے مسئلے کو قرآن نے اس اہمیت، زور اور تاکید کے ساتھ اس لیے بھی بیان کیا ہے کہ قوموں کی نفسیات دینی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لوگ صرف اصولوں کو نہیں دیکھتے اور محض نظریات و تصورات کی گہرائیوں پر غور نہیں کرتے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص دعوائے نبوت سے سرفراز ہے، اس کا عمل کیسا ہے؟ اس کے کردار و سیرت کی بلندیوں کا کیا حال ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن اقدار حیات کا یہ علم بردار ہے، اس کو خود اپنی روزمرہ کی زندگی میں کس حد تک سمو سکتے۔ پر قادر ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ کسی دین میں اولین حیثیت اس کے عقائد و افکار کی منطقی استواریوں کو ہی حاصل ہے اور جہاں تک عقلا کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ اسی حقیقت کو فکر و نظر کا ہدف ٹھہراتے ہیں کہ جس پیغام کو پیش کیا گیا ہے اس میں کیا ندرت ہے؟ یا سابقہ مذاہب کے اعتبار سے اس میں کس درجہ ارتقا ظہور پذیر ہوا ہے؟ مزید براں عقلا اس پیغام کے انداز و فطرت کو بھی غور و فکر کا مدار و محور ٹھہراتے ہیں، اور ظاہر نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس میں کہیں تناقض تو نہیں؟ خلاف عقل باتیں تو پائی نہیں جاتیں؟ اور ایسے عناصر کو تو دخل نہیں جو مقتضیات زمانہ کا ساتھ نہ دے سکیں؟

یہ سب باتیں ایک صحیح، قابل عمل اور ترقی پذیر مذہب کے لیے ضروری ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انبیا سے لوگوں کی توقعات اس سے مختلف ہوتی ہیں، ان کے معاملے میں یہ صرف فکر د نظر اور نظریہ و تصور کے نکھار ہی پر نگاہ نہیں رکھتے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ منطق کی استواریاں، عمل و کردار کے فلسفے میں بھی ہم آہنگ ہیں یا نہیں؟

تعلیمات کے مقابلے میں عمل و کردار اور اسوہ و نمونے کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ خود آنحضرت سے کہا گیا ہے:

فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام: ۹۰)

"اور تم انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔"

سوال یہ ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جن کی پیروی کی تلقین اس ذات گرامی کو کی جا رہی ہے، جو قرآن ایسی شمع فروزاں کا حامل ہے؟ انبیاے سابقین، ابراہیم، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ ہارون اور یحییٰ، عیسیٰ وغیرہ علیہم السلام انہی کے بارے میں فرمان ہے:

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (انعام: ۹۰)

"یہ ہیں وہ لوگ جنھیں اللہ نے ہدایت سے بہرہ مند کیا تھا۔"

اس مضمون کو زیادہ وضاحت کے ساتھ دوسری جگہ بیان کیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ

(ممتحنہ: ۴)

"تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے رفقا کا اندازِ زیست بہترین نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔"

بتانا یہ مقصود ہے کہ شریعت و نظام دینی صرف نظریہ و تصور کی وضاحتوں سے تعبیر نہیں ہے، بلکہ اس کا گہرا تعلق عمل و کردار کی استقامت سے ہے۔ یعنی جہاں قول صحیح ایک سند ہے اور لائق اطاعت ہے، وہاں عمل صحیح بھی ایک پیمانہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

انبیا کی اطاعت و پیروی کا جذبہ قوموں کی نفسیات دینی کا ضروری تقاضا ہے۔ اس کا چمکتا ہوا ثبوت خود تاریخ نے مہیا کیا ہے۔ چناں چہ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے مشمولات پر غور کیجیے، یہ اس کے سوا کیا ہے کہ ان میں انبیاے بنی اسرائیل کی تاریخ مذکور ہے۔ امم گزشتہ کے احوال درج ہیں اور وہ حقائق مرقوم ہیں، جن کا تعلق سراسر سوانح نگاروں سے ہے۔

وہ تورات جو حضرت موسیٰ کو دی گئی اس کا کہیں مذکور ہے؟

یا وہ انجیل جو حضرت مسیح کو عطا کی گئی، اس کی دس آیتیں بھی کہیں محفوظ صورت میں پائی جاتی ہیں؟

دور کیوں جائیے۔ قرآن کا انداز بیان کیا ہے؟ کیا اس میں تورات کی آیات کو نقل کیا جاتا

ہے؟ انجیل کے حوالے دیے جاتے ہیں؟ اور انبیاے سابقین پر نازل شدہ کتابوں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں؟ یا یہ بتایا جاتا ہے کہ گزشتہ قوموں نے انبیا کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔ کن کن حقائق کو جھٹلایا اور تکذیب و انکار کی کن کن صورتوں کو آزمایا اور پھر اس کی پاداش میں کس طرح اللہ کی سنت جوش میں آئی' یعنی غور طلب یہ نکتہ ہے کہ:

> اگر کتابوں کے سوا کوئی چیز حجت نہیں' اور اقوال و نصوص کے علاوہ کوئی شے اطاعت و پیروی کے لائق نہیں' تو قرآن جو قوموں کی تاریخ دہراتا ہے اور انبیا کے احوال کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے' اس کی دین کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے۔

## انکار حدیث کا خدشہ:

سوم: اطاعت و پیروی کو اس درجہ موکد اور اس درجہ ضروری ٹھہرانے کی آخری حکمت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ مبادا لوگ دین کی اس اساس کا انکار نہ کر دیں' جس پر کہ اس کی پوری عمارت استوار ہے' اور اس حقیقت کو نہ جھٹلا دیں جس کے ساتھ دین کے لطف و ذوق کی تمام کیفیتیں وابستہ ہیں۔۔۔۔ اور انسان کی محرومی دیکھیے کہ اس نے اسی نعمت خداداد سے محرومی اختیار کرلی ہے' جسے پانے اور حاصل کرنے کی اس درجہ تاکید کی گئی تھی اور اسی دولت کو ٹھکرا دیا ہے' جس سے بہرہ مندی کے بغیر دین کا کوئی اعلیٰ اور لطیف تصور قلب و ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔

خدا را وہ لوگ جنھوں نے قرآن کو عشق و محبت رسول سے بے نیاز ہو کر فہم و عمل کا ذریعہ ٹھہرانے کا دعوے کیا ہے' چند منٹ کے لیے اپنے طرز عمل پر غور کریں اور سوچیں کہ انھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ یعنی عمل و کردار کی کن کن خوبیوں سے ہاتھ دھوئے ہیں اور فکر و تعبیر کی کن کن منفی صورتوں کو اپنایا ہے۔ غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ مولوی چراغ علی سے لے کر اس وقت پون صدی سے زیادہ عرصہ اس تحریک پر گزر چکا ہے؟ اس عرصے میں اس کے نتائج کیا ہیں؟ اس نے فکر و فہم کے نقطہ نگاہ سے کتنے اونچے لوگ پیدا کیے ہیں؟ کن پیچیدہ مسائل کو سلجھایا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کن لوگوں کی زندگیوں کو سنوارا ہے؟

جو شخص بھی منصفانہ طور پر اس تحریک کا جائزہ لے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ:

یہ ایک منفی قسم کی تحریک ہے، جس کے پاس کوئی ایجابی لائحہ عمل نہیں، اس کی بنیاد ذہنی انتشار، فکری کم مائیگی اور علمی افلاس پر استوار ہے، اس لیے اس کو قبول کرنے والوں کا مزاج بھی قدرتا اسی نہج کا ہے، چناں چہ ان سے بات چیت کر کے دیکھیے، چند ہی لمحوں میں یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ آپ کا مخاطب، عقل و خرد کے کس درجے پر فائز ہے۔

* * *

## (۱۶)

# نظریہ انکار حدیث کا منطقی تجزیہ

## اطاعت رسولؐ سے انحراف کی تین صورتیں:

جو شخص بھی بغیر کسی تعصب کے ان حقائق پر غور کرے گا کہ قرآن حکیم کے نقطۂ نظر سے نبوت کا ایک خاص مفہوم ہے اور اس کے متعین لوازم ہیں۔ اور جو شخص پیغمبر کے مقام رفیع کو اطاعت و فرماں برداری کا غیر مشروط مدار و محور ٹھہرائے گا' وہ کسی طرح بھی احادیث و سنت سے عراض اعتراض نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو ان متعدد تصریحات پر نظر ڈالے گا جن میں آنحضرت کو کہیں شاہد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے' کہیں تبیین و تعلیم کے فرائض کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور کہیں مطاع و اسوہ قرار دیا گیا ہے' وہ آنحضرت کی اقتدا و پیروی کی برکتوں سے محروم ہونا ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ پھر اطاعت رسول کے مضمون کو قرآن نے جس تکرار' جس تاکید اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے' وہ بجائے خود اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ کوئی تاویل' کوئی منطق اور موشگافی بھی اس کو گہنا دینے پر قادر نہیں۔ یعنی ہر شخص جو قرآن کا بے لاگ مطالعہ کرے گا' ناممکن ہے کہ عشق رسول کی دولت گراں مایہ سے اپنے دامن طلب کو تہی رکھ سکے۔ مگر انسان کو چوں کہ ہر انداز کی گم راہیوں کو آزمانا ہے اور فکر و تاویل کی ہر کج روی کو اختیار کرنا ہے اس لیے اس حقیقت کو بھی جھٹلانے کا سامان پیدا کر لیا گیا۔ کہا گیا کہ

۱۔ چوں کہ قرآن مفصل ہے اور اس نے دینیات کی تمام گتھیوں کو از خود سلجھانے کی ذمہ داریوں کو قبول فرمالیا ہے، اس لیے حجیت احادیث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ تشریح قرآن کے سلسلے میں اگرچہ احادیث کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مگر ان میں چوں کہ اختلاف و تناقض پایا جاتا ہے اور عجمی فکر اور دوسرے عوامل کی تحریف نے چوں کہ اس کی صحت و استواری کو مشکوک کر دیا ہے لہٰذا دین کے معاملے میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں اجمالات پائے جاتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ آنحضرت نے ان اجمالات کی تشریح فرمائی ہے مگر یہ تشریحات آپؐ کی زندگی ہی کی حد تک حجت ہیں۔ آپؐ کے انتقال کے بعد آپؐ کی حجیت و استناد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور وضاحت کا یہ حق قرآنی معاشرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

پھر اطاعت و فرماں برداری کا مدار و محور پیغمبر کی ذات اور پیغمبر کا عمل نہیں رہتا، بلکہ وہ شخص قرار پاتا ہے جو قرآنی معاشرے کا سربراہ ہو۔

انکار حدیث کی یہی وہ تین صورتیں ہیں، جو اہل قرآن کے جملہ مدارس فکر کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ آیئے ان تینوں پر الگ الگ بحث کریں۔

## قرآن کن معنوں میں مفصل ہے:

اس بحث سے نمٹنے کے لیے پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ قرآن کن معنوں میں مفصل ہے؟ کیا اس کی تفصیل کے یہ معنی ہیں کہ جہاں تک دین کی اساسی اور بنیادی قدروں کا اور ان کے ادلہ کا تعلق ہے، وہ اس میں بہ تفصیل مذکور ہیں؟ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ جزئیات دین کا وہ جامع ڈھانچا جس سے کسی نظام فکر کی تشکیل ہوتی ہے، اس میں بہ وضاحت مذکور ہے؟

ہم پہلے ہی قدم پر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم اول لذکر اصول کے قائل ہیں، اور جو شخص بھی قرآن سے شغف رکھتا ہے یا اس میں غور و فکر کا عادی ہے، یہی کہے گا کہ:

قرآن میں صرف اساسی قدروں کی وضاحت و تفصیل ہی مذکور ہے، جزئیات دین کی نہیں۔

اساسی قدروں سے ہماری مراد صرف چار چیزیں ہیں

○ توحید

○ تصور نبوت

○ تصور آخرت۔

اور ملل و اقوام کا عروج و زوال۔

باقی جو کچھ ہے، بالتبع ہے، ضمناً ہے اور غیر مفصل ہے۔

ان چار مضامین کو قرآن کا عطر اور موضوع قرار دیا جا سکتا ہے، چناں چہ اس نے کھول کھول کر توحید کے اسرار بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ مسجود ملائک انسان کا رتبہ کائنات میں کتنا اونچا ہے۔ شرک کس درجہ پستی سے تعبیر ہے اور اس کا ارتکاب شرف انسانی پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس نے نبوت کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس کا مزاج، لوازم، اور تقاضے کیا ہیں اور اس سلسلے میں سابقہ ادیان نے کب کب غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ تصور آخرت بھی قرآن کا خاص مضمون ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی وسعتوں کا جائزہ لیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ عناصر کے ظہور و ترتیب کا نام نہیں کہ جہاں یہ شیرازہ بکھرا یہ ختم ہو گئی۔ بلکہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی شے ہے۔ اس کی وسعتیں، اس کی فعالیت اور تقاضے، مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ انسان فکر و عمل کا جو نقشہ بھی تجویز کرے، اس حقیقت کو سامنے رکھ کر تجویز کرے کہ اس کے اثرات، مابعد الموت کی زندگی پر مترتب ہونے والے ہیں، اسی طرح قرآن نے پوری اہمیت کے ساتھ اقوام و ملل کے عروج و زوال کا مسئلہ بھی بیان کیا ہے اور بتایا ہے، کہ قومیں صرف اپنی مادی تیاریوں کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہتیں، بلکہ زندگی کے لیے ایک خاص نوع کے اخلاق، نظریات اور عمل کی ضرورت ہے اور جب تک قومیں اخلاق و ایمان کے ان پیمانوں پر عمل پیرا رہتی ہیں، کامیابی و کامرانی سے ہم کنار رہتی ہیں اور جب عمل و سیرت کے ان جانے بوجھے پیمانوں کو چھوڑ دیتی ہیں، صفحۂ ہستی سے بغیر کسی رو رعایت کے مٹا دی جاتی ہیں۔

یہ ہیں وہ اقدار جن کی قرآن حکیم میں پوری پوری تفصیل و وضاحت ہے، اور یہ ہیں وہ حقائق جن کے متعلق قرآن نے پورا پورا تعرض کیا ہے۔

اقدار کا لفظ یہاں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے دین کے بنیادی مسائل اور فرائض کا نام عمداً نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے قرآن نے نماز کا ذکر کیا ہے، مگر اس کا تفصیلی نقشہ بیان نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ حج، زکوٰۃ سے تعرض کیا ہے مگر اس کی متعلقہ جزئیات کی وضاحت

نہیں فرمائی۔ حالاں کہ حج فرائض میں داخل ہے۔ اسی طرح روزہ اور نکاح کے بعض گوشوں کو نکھارا ہے جو ہماری روحانی اور معاشرتی زندگی کے اہم پہلو ہیں مگر کتنی ہی ضروری جزئیات ہیں، جن کا ذکر تک قرآن کی آیات میں نہیں ملتا، کیوں نہیں ملتا اور جزئیات کی یہ تفصیلات آخر کیوں قرآن میں مذکور نہیں؟ جب کہ ان کا تعلق فرائض و احکام کے ضروری اور اہم نقشے سے ہے۔ کیا یہ نقص ہے؟ نہیں۔!

## قرآن میں جزئیات کے عدم ذکر کی دو وجہیں:

اس کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ قرآن میں دین کا تصور یہ نہیں کہ اس کی جملہ جزئیات صرف قرآن ہی کے صفحات میں مذکور ہیں، بلکہ اس کے نقطۂ نظر سے رسول اور اس کی تشریح و تبیین کو بھی دین کا جزو ترکیبی سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا جو چیز قرآن میں مذکور نہیں، اس کو آنحضرت کے عمل، تشریح اور ترجمانی میں ہمیں تلاش کرنا چاہیے۔

۲۔ قرآن کی اپنی مخصوص تاریخی ترتیب بیان ہے، جسے وہ مسائل کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بسا اوقات وضو کی تفصیلات تو اس میں بیان کی جاتی ہیں، حالاں کہ وہ نماز کے مقابلے میں کہیں کم اہم ہیں، مگر نماز کی تفصیلات مذکور نہیں ہوتیں، جو دراصل نماز کا ڈھانچا متعین کرتی ہیں۔

ہم اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ قرآن میں صرف اقدار پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے جزئیات سے نہیں صرف دو چیزیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دیانت دارانہ مطالعہ، اور دوسرے ان آیات کے سیاق و سباق کی تشریح کہ جن میں قرآن کے مفصل ہونے کا ذکر ہے۔ یہ دونوں کسوٹیاں بہت سادہ اور منطقی ہیں۔

اگر آپ کسی اہل حدیث سے پوچھیں کہ آپ جو نماز پڑھتے ہیں، جس طرح زکوٰۃ دیتے ہیں اور صحیح اسلام کے سلسلے میں جن جزئیات پر عمل پیرا ہیں، ان کا کوئی ثبوت آپ کے پاس موجود ہے؟ تو وہ بغیر کسی سفسطہ آرائیوں کے کھٹ سے احادیث کے وہ مقامات آپ کو دکھا دے گا، جن میں یہ تمام مسائل مذکور ہیں۔

یہی سوال اگر آپ ایک حنفی، ایک شافعی اور ایک مالکی و حنبلی سے دریافت کریں گے تو اسے

بھی جواب میں کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔ وہ بھی بغیر کسی دقت کے فقہ کے ان صفحات کو آپ کے سامنے رکھ دے گا جن میں یہ تمام مسائل بہ وضاحت مذکور ہیں پوچھنا یہ ہے کہ کیا بعینہ یہی پوزیشن کسی اہل قرآن کی بھی ہے؟ کیا وہ بھی اپنے مجوزہ نظام عبادت کو اسی تفصیل' اسی وضاحت اور آسانی کے ساتھ قرآن میں دکھا سکتا ہے؟

ہم اپنے ان دوستوں کو اس سلسلے میں استدلال و استنباط کی بھی اجازت دیتے ہیں اور ان کے اس عذر کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب' کتب حدیث و فقہ کی ترتیب سے مختلف ہے۔ مگر یہ استدلال و استنباط وہی ہونا چاہیے' جسے ہم منطق و فن کی روشنی میں استدلال و استنباط سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس عجیب و غریب طرز اثبات کو ہم استدلال نہیں کہیں گے جس کو اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے بھان متی کا کنبہ کہنا زیادہ صحیح ہو۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن نے جس تاکید' جس زور اور اہمیت کے ساتھ اطاعت رسولؐ کا ذکر کیا ہے' اس سے انحراف کی کوئی منطقی وجہ نظر نہیں آتی' بجز اس کے کہ کوئی شخص آنحضرتؐ کے اصل منصب ہی کا انکار کر دے اور یہ کہے کہ آپؐ کی اطاعت و فرماں برداری نبوت کی حیثیت سے نہیں بلکہ وقتی سربراہ کی حیثیت سے تھی۔ یا اس ذخیرۂ احادیث کو مشکوک ٹھہرا دے جس پر کہ آپؐ کی محبت و اطاعت کا قصر دل کشا تعمیر ہوا ہے اور یا پھر یہ موقف اختیار کرے کہ چوں کہ قرآن بجائے خود مفصل ہے' اس لیے احادیث کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔۔ ہم ان تینوں نکات پر الگ الگ بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ قرآن کن معنوں میں مفصل ہے اور اس کے لیے جو تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کا لفظ آیا ہے' سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کا کیا مطلب ہے؟

ان مختصر اشارات کے بعد آیئے ہم ان مقامات کا استقصا کریں جن میں قرآن حکیم کے مفصل ہونے کا بیان ہے اور دیکھیں کہ یہاں تفصیل سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا رخ جزئیات فقہ کی طرف ہے یا تشریحات دین کی جانب ہے۔ یا پھر اس سے مقصود اسلام کی بنیادی اقدار اور ان کے دلائل کی چھان بین اور تشریح ہے؟

اس سلسلے میں تحقیق طلب یہ مسئلہ ہے کہ سیاق و سباق کی رو سے آیا بعید ترین احتمال بھی اس نوع کا پایا جاتا ہے کہ قرآن کسی طرح اور کسی درجے میں بھی حجیت رسولؐ کی نفی کرنا چاہتا

ہے؟ یا کردار رسول اور اسوۂ رسولؐ کی اہمیتوں کو گھٹانا چاہتا ہے یا ان معنوں میں اپنے مفصل ہونے کا تذکرہ کرتا ہے کہ جس سے پیغمبرؐ یا رسولؐ کی تشریحات کی ضرورت باقی نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں کیا خدا اور رسول میں منافات اور تناقض پایا جاتا ہے، جسے قرآن حکیم ختم کرنا چاہتا ہے؟

اس نکتۂ روشن تر کی صحیح معنوں میں اسی وقت وضاحت ہو سکے گی جب ہم ان مقامات کا جائزہ لیں گے جن میں اس مفہوم کی آیات کا استعمال ہوا ہے۔

زیادہ مناسب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ان آیات کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے جن میں لفظ تفصیل "بجنسہ" آیا ہے۔ اس کے بعد ان آیتوں سے تعرض کیا جائے جن میں قرآن کو مفصل کتاب ٹھہرایا گیا ہے اور آخر میں ان مقامات پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈال لی جائے جہاں تشریح و تفصیل کی ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

سب سے پہلے یہ لفظ ہمیں سورۃ الانعام میں ملتا ہے، چناں چہ ارشاد ہے:

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۵۴)

"پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تھی تاکہ ان لوگوں پر جو نیک ہیں نعمت پوری کر دیں، اور اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔"

مگر یہاں مقصود قرآن نہیں، تورات ہے اور لطف یہ ہے کہ جس سیاق میں اس تفصیل کا تذکرہ ہے اس کا منشا بھی یہ ہرگز نہیں کہ تنہا تورات یہودیوں کے تمام دینی تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے، بلکہ اس تفصیل سے مراد صرف یہ ہے کہ قرآن نے آخرت کے جس عقیدے کو عمل کی اساس ٹھہرایا ہے اس کی وضاحت تورات میں پائی جاتی ہے۔ اس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ یہ آیت جن الفاظ پر ختم ہوئی ہے، یہ ہیں:

لَعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ○

"تفصیل و ہدایت کے یہ مواقع ان کو اس لیے دیے گئے، تاکہ یہ خدا کے روبرو حاضر ہونے کا یقین کریں۔"

اس سے آگے چل کر سورہ اعراف میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور وہ بھی تورات ہی کے بارے میں!

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۴۵)

"اور ہم نے تورات کی تختیوں میں، ان کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔"

اس کے بعد تورات ہی کے مرتبہ تشریح و وضاحت کے متعلق سورہ یونس میں یوں ارشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ (یونس: ۳۷)

"اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ یہ خدا کا کلام ہے، جو کتابیں اس سے پہلے کی ہیں، ان کی تصدیق کرتا ہے اور انہی کتابوں کی اس میں تفصیل ہے۔"

سورۂ بنی اسرائیل میں ایک جگہ قرآن کے لیے تفصیل کا لفظ بلاشبہ استعمال ہوا ہے، اگرچہ ان معنوں میں نہیں کہ جن معنوں میں یار لوگ سمجھتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۲)

"اور ہم نے دن اور رات کو دو نشانیاں بنایا ہے۔ رات کی نشانی کو تاریک بنایا اور دن کی نشانی کو روشن، تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل یعنی روزی تلاش کر سکو اور برسوں کا شمار اور حساب بھی کر سکو اور ہم نے ہر چیز کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔"

اس سے مراد آیات قرآنی کی تشریح نہیں بلکہ آیات کی تفسیر و وضاحت ہے۔

سورۂ یوسف کے آخر میں ہے:

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ

كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (سورۂ یوسف: ۱۱۱)

"قرآن ایسی بات نہیں جو اپنے دل سے بنا لی گئی ہو بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں' ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور ہر چیز کو بیان کرنے والا اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا باعث ہے۔"

یہ آیت کس سیاق میں آئی ہے اور تفصیل سے یہاں کس قسم کی تفصیل مراد ہے' بقدر دو ہی آیات کے پیچھے پلٹ کر دیکھیے تو آپ کو صاف معلوم ہو گا کہ زیر بحث شے یہاں آخرت ہے اور تفصیل سے مراد آمور آخرت کی تشریح و وضاحت ہے' دین کے جزئیات یا آنحضرت کے ارشادات و عمل کی عدم حجیت نہیں۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (یوسف: ۱۰۹)

"اور پاک بازوں کے لیے آخرت کا گھر بہترین گھر ہے' کیا تم نہیں سمجھتے۔"

ہماری یہ درخواست ہے کہ قارئین کرام ان مقامات کو بچشم خود قرآن میں ملاحظہ فرمائیں اور ان کے پیچھے کی دو دو چار چار آیات کا مطالعہ کریں اور پھر دیانت داری سے بتائیں کہ ان کا ذاتی تاثر کیا ہے؟ کیا ان آیات کی تلاوت سے ان کے دل میں کسی طرح بھی یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا و رسول میں باہم لڑائی ہے یا کتاب اللہ اور اسوۂ رسولؐ دو مختلف اشیا سے تعبیر ہیں' یا ان میں انہی حقائق کی تفصیل کا تذکرہ ہے جن کی ہم نے نشان دہی کی ہے؟

نامناسب نہ ہو گا' اس مرحلے پر اگر ہم لفظ "کل" کی تشریح کر دیں:

عربی ادبیات میں اس سے مقصود ہرگز وہ منطقی استغراق نہیں ہوتا کہ جس میں ہر ہر شے داخل ہو بلکہ اس کا اطلاق عموماً اکثر کے معنوں پر ہوتا ہے۔ چناں چہ ملکہ سبا کے بارے میں قرآن میں ہے:

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (نمل: ۲۳)

"اور ہر چیز اسے میسر ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس سے مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کائنات کی ہر ہر چیز پر اس کو قبضہ و اقتدار حاصل ہے' بلکہ یہ ہے ایک ملکہ کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب اسے حاصل ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں جو تفصیل مذکور ہے اس کا تعلق بھی استغراق جزئیات سے

نہیں، بلکہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ایک اصولی کتاب میں جن جن تفصیلات کا ہونا ضروری ہے، وہ سب اس میں موجود ہیں۔

## لفظ "کل" اور امکان نظیر کی پرانی بحث:

قرآن حکیم میں لفظ "کل" کا استعمال ادبی اسلوب بیان کی خصوصیات لیے ہوئے ہے یا اس سے مراد منطقی استغراق ہے۔؟

اس نکتے کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہمارے ہاں، وہ مشہور مسئلہ استخوان نزاع بنا رہا، جسے امکان نظیر و امکان کذب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ عشق الٰہی کی سرشاری میں کہیں یہ کہہ بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، آنحضرت کی طرح کے ہزاروں انبیا پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ مخالف گروہ نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اب براہ راست اللہ تعالیٰ کی صفات زیر بحث آنے لگیں اور اس قسم کے سوالات بحث و تمحیص کا مدار و محور بننے لگے کہ آیا اللہ تعالیٰ معائب و نقائص پر بھی قادر ہے، اور اس کی قدرت کاملہ کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ معائب سے متعرض ہو۔

دیوبند کے اکابر نے جو اسی توحید سے متاثر تھے، جس نے مولانا شہید کو بے خود کر رکھا تھا، یہ موقف اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کذب ایسے معائب پر قادر تو بے شک ہے، مگر ان کا صدور کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان کا استدلال ان آیات سے تھا، جن میں اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ایسی تصریحات آئی ہیں اور جن میں اس کی قدرت کا علی الاطلاق ذکر ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس درجے حادی اور ہمہ گیر نہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدرت ناقص ہے، کامل نہیں، حالاں کہ قرآن میں اس کی قدرت کو ہر ہر شے تک وسعت پذیر قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے گروہ کا یہ موقف تھا کہ اس کی جلالت قدر، معائب سے ہرگز متعرض نہیں ہوتی اور یہی اس کا کمال بھی ہے، اس لیے معائب سے متعرض ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قدرت جمال و کمال کے لوازم سے متصف نہیں۔

آج اس بحث کا تذکرہ بھی صحت مند ذوق دینی پر گراں گزرتا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس وقت اس نزاع نے ذہن و فکر کی بہت سی توانائیوں کو ضائع کیا ہے، اور نفرت و حقارت اور اختلافات و تشتت کے بہت سے فتنوں کو ہوا دی ہے۔

دونوں طرف ایک طوفان تھا' دلائل و براہین کا جو اُمڈ آیا' اور ایک سیلاب تھا طعن و تشنیع کا' جس نے وقت کے نہایت ضروری مسائل کو پس پشت ڈال دیا۔

یہ بحث جس کا محرک جذبۂ توحید تھا' خطرناک اور دقیق کلامی مباحث میں داخل ہو گئی۔ اس ضمن میں دونوں طرف سے جن جن موشگافیوں کو پیش کیا گیا اور جو جو باریک اور نازک سوالات زیر بحث لائے گئے' ان کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ ہم آج اس پوزیشن میں ہرگز نہیں ہیں کہ ان مباحث کے بارے میں کوئی تحقیقی رائے پیش کریں' ہمارے نزدیک دونوں گروہوں کے رہنما نیک نیت تھے۔

دیوبند کے اکابر تو یہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے دائرے اتنے وسیع ہوں کہ کوئی شے بھی اس کی دست رس سے باہر نہ رہ جائے۔

اور ان کے مخالفین کے سامنے اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات تھیں جو اتنی ہی اہم ہیں جتنی کہ اس کی قدرت ـــ ان کا خیال تھا کہ اس کے جمال جہاں آرا کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ذات گرامی معائب میں کسی طرح بھی متعرض نہ ہو' اور اسی طرح اس کا کمال ذات یہ چاہتا ہے کہ وہ پیکر تنزیہہ' کذب ایسی برائیوں سے یکسر پاک ہو' اور امکان کی حد تک بھی اس میں نقائص پائے نہ جائیں۔

امکان و وجود میں کس حد تک لزوم ہے۔ یہ ایک باریک فلسفیانہ بحث ہے اور جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو ان کو تہافہ اور تہافتہ التہافتہ میں ان مباحث پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔ غزالی اور ابن رشد نے ایک دوسرے سیاق میں ان پر تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ ابن رشد امکان اور وجود کو مترادف قرار دیتے ہیں' اور غزالی مصر ہیں کہ ان میں قوت و فعل کا جو منطقی فرق ہے' اس کو بدستور باقی رہنا چاہیے۔

## بحث کا فلسفیانہ پس منظر:

اس پوری بحث کا دراصل ایک فلسفیانہ پس منظر ہے۔ جو لوگ قدرت کے دائروں کو اتنا وسیع' اتنا ہمہ گیر اور وسعت پذیر سمجھتے ہیں کہ کسی شے کو بھی اس کے احاطہ وسعت سے باہر نہیں رہنا چاہیے وہ ارسطو کے تابع ہیں۔ کیوں کہ ارسطو ہی وہ پہلا شخص ہے' جس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو غیر محدود اور مطلق اور غیر مشروط پر وسیع جانا۔

دوسرا گروہ جو معائب و نقائص کو دائرہ قدرت سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے‘ افلاطون کا پیرو ہے اور اس کے عقائد و تصورات پر افلاطون کے اس نظریے کی چھاپ دکھائی دیتی ہے کہ خدا باوجود اپنی قدرت کی وسعتوں کے عقلی شرائط کو قبول کرتا ہے‘ اور ان حد بندیوں کو تسلیم کرتا ہے‘ جنھیں عقل عائد کرتی ہے‘ یا اس کی ذات کا اولین تقاضا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا تصور یہ ہے کہ یہ ایسا غیر محدود ہے جو بعض معقول حد بندیوں کو گوارا کرتا ہے۔

ارسطو کا مسلک ایسا ہے جو دینی ذہن کو زیادہ متاثر کرتا ہے‘ اگرچہ اس سے خیر و شر کی گتھی نہیں سلجھتی ـــ افلاطون کے نظریے کو وہ لوگ زیادہ لائق قبول سمجھتے ہیں‘ جن کے سامنے خیر و شر کا اشکال ایک بہت بڑا اشکال ہے اور اس اشکال کی روشنی میں وہ اللہ تعالٰی کی قدرتوں کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

## ہمارا مقصد:

فلسفہ و علم الکلام کے یہ مباحث ہمارے موجودہ موضوع سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے

اِن اللہ علی کل شیء قدیر یہ سمجھا ہے کہ اس میں ہر ہر شے داخل ہے‘ ان سے سہو ہوا‘ اس لیے کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے‘ اس میں کم از کم اس استغراق کی تائید نہیں ہو پاتی۔

آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ:

> ہر وہ شے اس کے دائرۂ اختیار میں داخل ہے جو اس کی شایانِ شان ہے۔

ٹھیک اسی طرح‘ جہاں جہاں قرآن کے بارے میں تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کی تصریح آئی ہے‘ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن ایک اصولی کتاب ہے‘ لہٰذا اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک اصولی کتاب میں موجود ہونا چاہیے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ:

> آنحضرت کو اس کی تشریح و وضاحت کا حق ہے یا نہیں‘ اور آپؐ کی تشریح و عمل ہمارے لیے حجت ہے یا نہیں؟ تو اس کا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔

اس مضمون کے لیے ہمیں ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے‘ جہاں آپؐ کی اطاعت کو ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور جہاں آپؐ کی اتباع کو محبت الٰہی کے لیے واحد شرط قرار دیا گیا ہے۔

## ان آیات کی تشریح جن میں تفصیل کی ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے خود قبول فرمایا ہے!:

اس کے بعد ان مقامات پر نظر ڈال لیجیے، جن میں تفصیل کی ذمہ داریوں کو خود اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا ہے یا تفصیل و وضاحت کو قرآن کی خوبی قرار دیا ہے اور پھر دیکھیے کہ منشاء الٰہی کیا ہے؟ کیا ان سے اسلامی اقدار اور بنیادی اصولوں کی تشریح مقصود ہے، یا یہ مراد ہے کہ قرآن نے چوں کہ اصولوں سے لے کر جزئیات تک ہر ہر شے کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، اس لیے اس کو نفس نبوت کی بھی احتیاج نہیں رہی۔

اسی طرح جب تفصیل کو قرآن کا وصف لازم ٹھہرایا ہے تو غرض یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے مطالب اور ادلہ کے اعتبار سے واضح، غیر پیچیدہ اور صاف ہے یا اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ اس درجے مستقل بالذات اور مستغنی ہے کہ تفسیر و تشریح کی منت پذیریوں کی اس کو قطعی ضرورت ہی نہیں۔ چاہے یہ منت پذیریاں ایک عام انسان سے متعلق ہوں، اور چاہے ان کا تعلق اس قلب اطہر سے ہو جو مہبط وحی اور محل انوار ہے۔ یا فکر و دانش کے اس معجزے سے ہو جو رازدار جبرئیل امین ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (بقرہ: ۹۷)

"کہہ دیجیے جو جبریل کا دشمن ہے وہ ہوا کرے۔ اسی نے تو اللہ کے حکم سے اس کتاب کو تیرے قلب کی گہرائیوں میں اتارا ہے۔"

کفایت و تفصیل قرآن کے روپ میں خدا اور رسول میں جو فرضی منافات اور لڑائی پیدا کی جا رہی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے ہمیں کسی تصنع یا کھینچا تانی کی حاجت نہیں بلکہ صرف ان آیات کو پیش کر دینا ہی کافی ہے، جن سے اس انداز کا استدلال کیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل و وضاحت کی ذمہ داریوں کو قبول فرما لیا ہے، اور اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہی یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ مفصل ہے، لہٰذا احادیث رسول یا سنت رسول کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے؟

اس سلسلے میں دیکھنا یہ ہے کہ آیا قرآن واقعی انہی معنوں میں مفصل ہے، جن معنوں میں یہ

لوگ کہتے ہیں، یا اس کے مفصل ہونے کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ان میں کہیں پیچیدگی نہیں، کہیں انحطاط نہیں اور اس کے دعاوی صاف ہیں اور انداز بیان واضح اور فہم و فکر کی گرفت میں آنے والا ہے۔ نیز اس میں وہ تمام اصول بیان کر دیے گئے ہیں، جن کا تعلق زندگی اور دین کی بنیادی قدروں سے ہے۔

تفصیل کی یہ نوعیت ایسی ہے جو قرآن کے سیاق و سباق کے مطابق ہے، پیغمبر کے درجہ و منصب کے صحیح شایان شان ہے اور منطق قرآن سے جس کی تائید ہوتی ہے۔ منطق قرآن کا یہ معنی ہے کہ قرآن نے حقائق دینیہ کو ایک خاص نہج اور ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں توحید کے اسرار ہیں، آخرت کا نقشہ ہے اور اعمال صالحہ کی تائید ہے، اور ان سب کے پہلو بہ پہلو نبوت و رسالت کے تقاضوں کی خصوصیت سے تشریح و وضاحت ہے۔ اس ترتیب اور نہج کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص تفصیل قرآن کے ایسے معنی مراد لے، جو انکار رسالت کے مترادف ہوں، اس انداز کا اسلوب فکر قرآنی منطق کے سراسر خلاف ہے۔

ہمارے اس دعوے میں کہاں تک صداقت کی جھلک ہے؟ اس کو ہمارے اس تجزیے میں دیکھنے کی کوشش کیجیے، جس میں ہم مع سیاق و سباق کے ان آیات کی نشان دہی کرنے والے ہیں، جن میں کہ لفظ تفصیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ سورہ یونس میں ہے:

كَذَالِكَ نُفَصِّلُ الْأٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۴)

”جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں ان کے لیے ہم اپنی آیات اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔“

اس آیت میں تفصیل آیات سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعیین کے لیے اس سے قبل کی آیت پر غور کیجیے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ (یونس: ۲۳)

"دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا، پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں، مل کر نکلا، یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہو گئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔ ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم آپہنچا، تو ہم نے اس کو کاٹ کر ایسا کر ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔"

اس میں کہیں مسائل کا ذکر ہے؟ تفصیلات و فروع کا تذکرہ ہے؟ یا ایسی کوئی وضاحت طلب شے ہے، جس کا ادنیٰ تعلق بھی دینی تشریحات سے ہو؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس سے قبل آخرت کی حقانیت پر زور دیا ہے اور ان آیات میں ایک بلیغ مثال کے پیرائے میں بتایا ہے، کہ جس دنیا کو تم اس درجہ پائیدار، اس درجہ مستحکم اور سدا بہار سمجھتے ہو، وہ کسی وقت بھی آفات و بلیات کا شکار ہو سکتی ہے۔

پھر آیات سے مراد یہاں قدرت کی نشانیاں ہیں جن پر کہ غور و فکر ہونا چاہیے۔ آیات قرآنی مراد نہیں۔ سورۂ روم میں ہے:

كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲۸)

"ہم عقل والوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔"

"کھول کھول کر" یہاں کس چیز کو بیان کیا گیا ہے؟ اور کس حقیقت کی پردہ کشائی فرمائی گئی ہے؟ اس کو اسی آیت کے پہلے حصے کی روشنی میں دیکھیے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ط هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (سورہ روم: ۲۸)

"وہ تمھارے لیے تمھارے ہی حال کی مثال بیان کرتا ہے کہ بھلا جن لونڈی غلاموں کے تم مالک ہو، وہ اس مال میں جو ہم نے تمھیں عطا کیا ہے، تمھارے شریک ہیں؟ اور کیا تم اس میں ان کو اپنے برابر مالک سمجھتے ہو؟"

سیاق و سباق بول بول کر کہہ رہا ہے کہ یہاں مقصود توحید کی وضاحت ہے، اور وہ بھی نہایت ہی عمدہ نفسیاتی مثال سے، اسلام کے فقہی ڈھانچے کے بارے میں اس میں اشارہ تک پایا نہیں جاتا۔ اس کو تمھاری آنکھیں آخر کیوں نہیں دیکھتیں؟ تم جب اپنے لیے یہ پسند نہیں کرتے کہ لونڈی، غلام تمھارے برابر ہوں تو خدا کے بندوں کو کیوں اس کا شریک ٹھہراتے ہو؟

سورہ اعراف میں ہے:

> كَذَالِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۷۴)
>
> "اور اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ رجوع کریں۔"

اس آیت کے سیاق و سباق میں بھی چوں کہ توحید و آخرت کے دوگونہ مسائل ہی کی تشریح کی گئی ہے، جیسا کہ اس سے ماسبق کی آیت میں ہے، اس لیے بغیر کسی حاشیہ آرائی کے ہم اسے درج کرتے ہیں۔

> وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ج شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ۔ ط (اعراف: ۱۷۲)
>
> "اور جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کو صلبی اولاد سے نوازا، اور ان سے اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ کہنے لگے کیوں نہیں! ہم گواہ ہیں۔ یہ اقرار اس لیے کرایا گیا تھا کہ قیامت کے دن کہیں یوں نہ کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبری ہی نہ تھی۔"

سورہ اعراف میں تفصیل کی تصریح اسی طرح مذکور ہے، مگر آخرت ہی کے سیاق میں، فقہ و تشریع کے ضمن میں نہیں۔ چناں چہ ارشاد ہے:

> قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ط
>
> (اعراف: ۳۲)
>
> "کہہ دیجیے، یہ نعمتیں دنیا کی زندگی میں تو ایمان داروں کے لیے مشترک ہیں،

قیامت کے روز خاص ہوں گی۔"

جن آیات میں قرآن کو مفصل کہا گیا ہے، ان میں مقصود پیرایۂ بیان کا وہ تنوع اور گوناگونی ہے جسے ہر ہر ذہن اور ہر ہر سطح فکر کے لوگوں کی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ کتاب ہدیٰ صرف عقلا یا صرف عوام ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر گروہ اور ہر طبقے کی نفسیات کا خیال رکھا گیا ہے۔ سورہ ہود کی اس ابتدائی آیت پر غور کیجیے۔

الٓرٰ۔ كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔ (ھود:۱)

"یہ وہ کتاب ہے، جس کی آیتیں استحکام لیے ہوئے ہیں اور خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔"

یہاں حکیم و خبیر کے الفاظ خصوصیت سے قابل غور ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کتاب ایسے خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہو، جو حکمت و خبر کے اوصاف سے متصف ہو، اس میں کس درجہ دانائی اور دانش کا اظہار ہو گا۔ اس کا اندازہ خود لگا لیجیے۔ سورۂ انعام میں قرآن کو براہ راست کتاب مفصل ہی ٹھہرایا گیا ہے، مگر کن معنوں میں؟ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں، کیوں کہ آیت میں زیر بحث مضمون اس کی اچھی طرح نشان دہی کر رہا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (انعام:۱۱۴)

"کیا میں خدا کے سوا اور منصف تلاش کروں، حالاں کہ اس نے تمھاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی ہے۔"

## کیا آنحضرت کی اطاعت وقتی سربراہ کی حیثیت سے ہے؟

آنحضرت کی اطاعت و اتباع پر قرآن نے جس قدر زور دیا ہے اور جس وفور و کثرت سے اس حرف شیریں کو دہرایا اور بیان کیا ہے، اس سے پہلو تہی اختیار کرنے کی اب دو ہی صورتیں اور باقی رہ جاتی ہیں، جن پر غور و فکر کے معیاروں کو حرکت میں آنا چاہیے، جیسا کہ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں۔

۱۔ یہ کہ چوں کہ احادیث میں تناقض و اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کی تدوین و ترتیب میں انسانی فکر و اندیشے کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے، اس لیے اس کا پایۂ استناد اس درجے کا نہیں کہ اس کو حجت شرعی قرار دیا جائے۔

۲۔ یہ کہ اصل استناد آنحضرت کو حاصل نہیں قرآن کو ہے اور آپؐ کی محبت و اطاعت کے دائرے صرف آپ کی زندگی ہی تک وسعت پذیر ہیں۔ آپؐ کے بعد یہ اختیارات خود بخود قرآنی معاشرے کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ آنحضرت کے انتقال کے بعد معاشرے کا فرض ہے کہ قرآن کی روشنی میں وقتی تقاضوں کی رعایت سے دین کی بقیہ تفصیلات طے کرے۔ یعنی آپؐ کی رہنمائی اور قیادت کے دائرے سراسر وقتی اور زمانی ہیں۔

ہماری رائے میں پہلے نمبر۲ کے بارے میں گفتگو کر لینا چاہیے، کیوں کہ اس کا تعلق دین کے ایک اہم اصول اور اساس سے ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آنحضرت کی اطاعت و محبت کا مسئلہ وقت و زمان کا مسئلے نہیں ہے تو پھر احادیث کی نوعیت و تاریخ پر آسانی سے بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر صورت حال یہ نہ ہو اور خدانخواستہ یہی مفروضہ صحیح نکلے کہ آنحضرت کی نبوت و رسالت کے تقاضے وقت و زمان کے تقاضوں کے ہم آہنگ ہیں، تو ظاہر ہے کہ احادیث کے درجۂ استناد پر بحث کرنا قطعی بے کار ہو جاتا ہے۔

عقائد کے باب میں، ہمارا ایک جچا تلا اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ:

سب سے پہلے اس کے لیے کوئی تاریخی وجہ جواز ہونی چاہیے۔

آپ نبوت کے پورے دور پر غور کیجیے اور اس کی تمام کڑیوں پر نظر ڈال جایے اور پھر دیانت داری سے بتایے کہ کسی قوم یا کسی گروہ میں نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اس کے اثرات کا دائرہ محدود ہے؟

آج تک یہودیوں میں کوئی فرقہ بھی ایسا پیدا ہوا ہے جس نے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ان کی حجیت و اطاعت سے انکار کیا ہو اور صرف صحائف تک اپنی وفاداریو کو استوار رکھا ہو؟

عیسائیت کا دو ہزار سالہ عہد پوری تفصیلات کے ساتھ آپ کے سامنے ہے۔ ان میں فکر و اندیشے کی کیا کیا گمراہیاں پیدا نہیں ہوئیں، اور کن کن مہمل اذعانات نے جنم نہیں لیا۔ لیکن کیا

ان کے فرقوں کی اس گوناگونی میں کہیں بھی ایمان و عقیدے کی اس نوعیت کی نشان دہی کر سکتے ہیں کہ کسی ایک شخص نے بھی مسیح کے منصب رسالت کو چیلنج کیا ہو؟ اور کہا ہو کہ جناب! اصل شے انجیل ہے' مسیح نہیں!

اسلامی تاریخ اس معاملے میں اور بھی واضح ہے۔ ہمارے ہاں کیا کیا اختلافات نہیں ابھرے اور تاویل و تعبیر کا وہ کون دروازہ ہے جس پر ہم نے دستک نہیں دی۔ یا فکر و اجتہاد کا وہ کون کون گوشہ ہے جن میں ہم نے طبع جدت طراز کی جولانیاں نہیں دکھائیں۔ ہماری تاریخ کا ایک ایک ورق گواہ ہے کہ سیاست سے لے کر فقہ و کلام کی تمام تفصیلات تک ہمارے ہاں زیر بحث آئی ہیں' اور ایک ایک نکتے پر ہم نے جی بھر کے اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن چودہ سو سال کی اس فکری تاریخ میں ہمیں ایک گروہ بھی ایسا نہیں ملتا جس نے آنحضرت کے فیوض نبوت سے انکار کیا ہو' اور یہ کہا ہو کہ

آپ کی قیادت و رہنمائی کے حدود صرف آپ کی زندگی تک وسیع تھے۔

یہاں خلط مبحث نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اس وقت احادیث کے درجۂ استناد پر بحث نہیں کر رہے ہیں' آنحضرت کے درجۂ استناد پر گفتگو ہے۔

سوال یہ ہے کہ مذہب و دین کی پوری تاریخ میں آپ کو کہیں ایسے عقل مند ملتے ہیں جنھوں نے اپنے پیغمبروں اور اپنے رہنماؤں سے کردار و سیرت کی جلوہ طرازیوں کو الگ کر لینے پر زور دیا ہو' اور امت کو دینی رہنماؤں کی ذاتی و شخصی عظمتوں سے الگ کر کے دیکھا ہو؟ نہیں! تاریخ کا فیصلہ اس کے بالکل برعکس ہے!

آج حضرت ابراہیم کے صحائف کا کہیں پتا نہیں۔ مگر ان کی دعوت توحید اور کردار قرآن کے صفحوں میں محفوظ ہے۔ موسیٰ کی کتاب تورات اپنی اصلی صورت میں کہیں پائی نہیں جاتی' مگر حالات اور تاریخ کی شکل میں عہد نامہ قدیم کے نام سے ضرور موجود ہے۔ اسی طرح وہ انجیل جس کے نزول کی خوش خبری قرآن حکیم سناتا ہے' صدیوں سے مفقود ہے' اور انجیل کے نام سے انجیل نگاروں کے وہ چار مجموعے البتہ پائے جاتے ہیں' جنھیں لوقا' مرقس' یوحنا اور متی کی انجیلیں کہا جاتا ہے۔

گویا تاریخ کا اٹل فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ کتابوں میں تحریف ہو سکتی ہے' متون بدلے جا سکتے

ہیں اور تشریح و تعبیر کے اختلافات ذہن و فکر کی تشویش کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مگر انبیاء و رسل کی ذات کے ساتھ کردار و عمل کی جو اہمیتیں وابستہ ہیں‘ ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارا مطالبہ بہت صاف اور سمجھ میں آنے والا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ آنحضرت کی نبوت و رسالت کے تقاضے آپؐ کے وصال کے بعد ختم ہو جاتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک بنیادی عقیدہ ہے جس کے بارے میں ادنیٰ غلط فہمی بھی انتہائی طور پر گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کو تمام بنیادی عقائد کی طرح ہماری تاریخ میں بحث و نظر کا موضوع و ہدف قرار پانا چاہیے تھا اور اسی طرح تشریح و توضیح کا حامل ہونا چاہیے تھا‘ جس طرح مثلاً توحید‘ آخرت‘ جنت‘ دوزخ‘ ملائکہ اور جبر و قدر ایسے مسائل حامل ہیں اور کم از کم اس پر اس درجے کی بحث تو ہونا ہی چاہیے تھی‘ جس درجے کی بحث ہمارے ہاں مسئلہ خلافت و امامت پر ہوئی‘ اور اگر تاریخ کی کسوٹی پر یہ عقیدہ کسی طرح بھی اور کسی درجے میں بھی پورا نہیں اترتا تو پہلے ہی قدم پر یہ اس لائق ہے کہ ٹھکرا دیا جائے‘ کیوں کہ جس عقیدے کو صحابہ نے عقیدہ نہیں سمجھا‘ جو بات تابعین اور تبع تابعین کے ذہن میں نہیں آئی اور جس کے بارے میں ہماری پوری فکری و اجتہادی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی‘ اس کو اصولی عقیدہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کو تحریف کہہ سکتے ہیں‘ گمراہی قرار دے سکتے ہیں اور فکر و اندیشے کی گستاخی پر معمول کر سکتے ہیں‘ مگر یہ کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ عقیدہ ہے‘ یا دین کی کوئی صحت مند اساس ہے۔

## تاریخ کیوں کسوٹی ہے؟

ممکن ہے اس مرحلے پر کوئی من چلا پوچھ بیٹھے کہ صاحب! تاریخ اور دینیات میں کیا تعلق ہے۔؟ تاریخ کو دینیات کے لیے‘ آخر پیمانہ اور کسوٹی کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے‘ جب کہ دین کی بنیاد سراسر وحی اور کتاب پر ہے اور تاریخ کا تعلق وقت و زمان کی کروٹوں سے ہے۔

بہ ظاہر یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کیجیے گا اور معاملے کی تہ میں اتر کر دیکھیے گا تو معلوم ہوگا کہ اس میں کچھ بھی وزن نہیں‘ محض فریب استدلال کی کرشمہ سازی ہے۔ دین اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے کہ جو دین بھی آئے گا‘ اس کا تعلق بہرحال ایک خاص گروہ سے ہوگا۔ وقت کے مخصوص تقاضوں سے ہوگا اور لغت و ادب کی متعین گنجائشوں سے ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایک تہذیب اپنے عروج کے زمانے میں ایک بنیادی و اساسی سوال کو معرض بحث میں نہیں لاتی، زمانہ ایسے موڑ اور مواقع پیدا کرتا ہے، جس میں کہ اس نوع کا سوال زیر بحث آسکتا تھا، مگر پھر بھی وہ سوال زیر بحث نہیں آپاتا۔ اسی طرح لغت و ادب کی گنجائشیں اختلاف و نزاع کے متعدد طوفان اٹھاتی ہیں، اور گوناگوں فرقوں کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ اہم سوال فکر و نظر کے سامنے نہیں آتا کہ منصب نبوت و رسالت کی حدود کہاں تک وسیع ہیں؟

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ محض ایک اپچ ہے، ورنہ جہاں تک قرآن اور ہمارے دینی ذہن و تاریخ کا تعلق ہے اس کے لیے کوئی وجہ جواز مہیا نہیں کی جاسکتی۔

اور اگر اس دور کے ان اجارہ داران قرآن کو اپنی اس بے معنی اپچ کی صحت پر اصرار ہو، اور وہ کسی طرح بھی اس سے دست کش ہونے کے لیے تیار نہ ہوں، تو اس کے جواب میں اگر کوئی دیوانہ یہ کہہ دے تو ان کے پاس کیا جواب ہو گا کہ جناب اصل شے قرآن نہیں، وہ اصول ہیں جو فطرت کی ترجمانی پر مبنی ہیں، وہ قوانین ہیں جو زمین و آسمان میں ازل سے تا ابد کار فرما ہیں۔۔۔ اور قرآن کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ان قوانین فطرت کا وقتی ترجمان ہے، اس لیے کہ قوانین فطرت کو دائمی حیثیت حاصل ہے اور قرآن چوں کہ الفاظ و حروف کی قید میں گرفتار ہے، اس بنا پر اس کی اطاعت صرف وقتی و زمانی ہے؟ جب کہ فطرت ہمیشہ جاری و ساری رہتی ہے۔

اگر جواب دعوے کی شکل میں یہ مفروضہ پیش کیا جائے تو اس کی تردید ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے کتنی دشوار ہو گی، اس کا آپ لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور پھر لطف یہ ہے کہ جن دلائل سے یہ لوگ فطرت کے مقابلے میں قرآن کی دائمی اطاعت کو ثابت کریں گے، انھی دلائل کی رو سے آنحضرت کی اطاعت کو بہ طریق اولیٰ تابہ ابد ضروری ٹھہرایا جاسکے گا۔

## کیا اطاعت رسول کے تقاضے پیغمبر کی زندگی تک محدود ہیں؟

### دعوے کا تجزیہ اور قرآن کی تصریحات:

عقائد کی تعیین دراصل قرآن سے ہوتی ہے، لہٰذا اگر اس کتاب ہدیٰ میں کسی شے کو عقائد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے تو اسے عقائد کی فہرست میں رکھا جائے گا، ورنہ نہیں۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل: ۹)

"یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو صحیح تر ہے۔"

اس بنا پر اگر یہ بات صحیح ہے کہ ہمیں دین کی ہر ہر اساس اور بنیاد کے لیے قرآن ہی کو حکم ٹھیرانا چاہیے تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس عقیدے کا جائزہ بھی قرآن ہی کے نقطۂ نظر سے لیں کہ آنحضرت کے وصال کے بعد آپ کی اتباع و اطاعت کے تقاضے معاشرے یا مزکر ملت کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ ایک دعویٰ ہے مگر غور کیجیے گا تو اس میں مندرجہ ذیل مستقل بالذات مقدمات مضمر نظر آئیں گے۔

۱۔ یہ کہ آنحضرت کی نبوت محض ایک وقتی شے تھی جو آپ کے وصالؐ کے بعد آپ سے آپ ختم ہو گئی۔

۲۔ اور یہ کہ آپ کے بعد ہدایت و رہنمائی کے لیے' دنیائے اسلام کو مرکزِ ملت یا قرآنی معاشرے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

آنحضرت مطاع ہیں۔ آپؐ کی اطاعت و پیروی قصرِ ایمان کی پہلی اینٹ ہے اور ہر ہر فیصلے میں آپ کے حکم و امر کو آخری فیصلہ قرار دینا چاہیے۔ اس انداز کی متعدد آیات آپ کے مطالعہ میں آچکی ہیں۔ قندِ مکرر کے طور پر استحضار کی غرض سے ایک مرتبہ پھر ان سے دیدہ و نظر کو فروزاں کرتے چلیے۔

يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ (یٰس: ۲۰)

"اے میری قوم! پیغمبروں کے نقش قدم پر چلو!"

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(آل عمران: ۳۱)

"آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم محبت الٰہی کے دعوے دار ہو تو میری پیروی کرو۔"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

(نساء: ۶۵)

> "تمھارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اپنے جھگڑوں میں جب تک تمھیں منصف نہ مانیں اور جو تم فیصلہ کرو اس سے دل میں تنگ نہ ہوں، بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔"

اطاعت رسول کے بارے میں قرآن میں دسیوں آیات آئی ہیں، جیسا کہ آپ ماسبق کی بحث میں دیکھ چکے ہیں، ہم نے ان میں سے ان چند آیات کو ایک خاص ترتیب کے پیش نظر چنا ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ:

پہلی آیت میں اطاعت رسول کو اس حیثیت سے بیان کیا گیا ہے کہ ہدایت و ارشاد کا یہ ایک ہمہ گیر اصول ہے اور کسی قوم یا زمانے میں بھی اس سے روگردانی اختیار نہیں کی گئی۔

دوسری آیت اطاعت رسول کی عارفانہ حیثیت کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ محبت الٰہی اور تعلق باللہ کے اونچے تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہو پاتے، جب تک یہ تعلق رسولؐ کی اطاعت و پیروی کی محسوس شکل نہ اختیار کر لے، اس لیے کہ آنحضرت کے سوا اور کون ہے جو عشق و فکر کی سرمستیوں میں حدود و توازن کو قائم رکھنے والا ہو۔

تیسری آیت میں، اس حقیقت کی پردہ کشائی فرمائی ہے کہ اطاعت رسول کی حدود کیا ہیں، آپ کے حکموں کو صرف مان لینا کافی نہیں، اس کے لیے نفسی و قلبی اطمینان درکار ہے، اور وہ خوشی اور انبساط درکار ہے جو بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی حب رسول کے جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دے۔

ان حقائق پر غور فرمایئے اور بتایئے کہ آیات کا یہ مزاج، معانی کے یہ تیور، اور تصریحات کی اس درجہ واضح نوعیت کیا کسی وقتی و ہنگامی اطاعت کے لیے ہے، یا اس سے ایسی اطاعت مقصود ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محبت و پیغمبر کے سلسلے میں مایہ ناز اور موجب مغفرت ہے۔

## شرط اور قید کو زیادہ واضح انداز میں مذکور ہونا چاہیے۔ ایک اصول!:

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت کے وصال کے بعد رسول کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور اس کی اطاعت و اتباع کے دائرے حد درجہ سمٹاؤ اختیار کر لیتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اس مضمون کی تائید میں، اسی اہمیت اور اسی انداز کی حامل آیات پیش کریں جن میں صاف صاف مذکور ہو کہ:

> اطاعت رسول کے اصول کو کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضروری نہ سمجھ لینا' کیوں کہ رسول صرف زندگی تک رسول رہتا ہے' اور ایک پیغمبر کا تعلق امت کی ہدایت و رہنمائی کے سلسلے میں صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے' جب تک بہ نفس نفیس ان میں وہ رہتا ہے۔ اس کے بعد نہیں۔

منطقی طور پر اس وضاحت کے ہم اس بنا پر طلب گار ہیں کہ عقائد اسی درجے کی تفصیل چاہتے ہیں۔ استدلال و استنباط کی ابلہ فریبیاں اس میں کام دینے والا نہیں' اور بالخصوص جب کوئی عقیدہ ایسا ہو کہ اس کا تعلق کسی زمان و مکان یا شرط و قید کے ساتھ وابستہ ہو تو اس شرط و قید کو بہ صورت نص قرآن میں خصوصیت کے ساتھ مذکور ہونا چاہیے۔

یہ اصول اگرچہ بالکل واضح ہے اور اصولیوں کا مسلمہ ہے اور کسی تائید و حوالے کا محتاج نہیں' تاہم ازراہ احتیاط اسے بھی ہم قرآن ہی میں دکھاتے ہیں۔ نسخ قید کے بارے میں ارشاد باری ہے:

مَانَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡنُنۡسِهَانَاتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَا اَوۡمِثۡلِهَا (بقرہ:۱۰۶)

> "ہم جس آیت پر خط تنسیخ کھینچتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں' تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت بھیج دیتے ہیں۔"

غرض یہ کہ قید یا نسخ و شرط' جس حکم یا مسئلے کے بارے میں وارد ہو' اس کا پہلے سے بہتر صورت میں دوبارہ مذکورہ ہوتا ہے' اور کم از کم ویسا تو قطعی ہوتا ہے۔

قرآن کے اس اصول کے پیش نظر نبوت کے وقتی ہونے پر ایسی آیات درکار ہیں جو زیادہ واضح اور استدلال و تعبیر کی مغالطہ آرائیوں سے یکسر پاک ہوں!

کیا کوئی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ پورے قرآن میں ایک آیت بھی ایسی ہے' جو پیغمبر کی سربراہی کو صرف اس کی زندگی ہی تک محدود قرار دے' یا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی وقت بھی انسانی معاشرہ نبوت و وحی کی رہنمائی سے آزادی حاصل لے کر سکتا ہے؟ اس کے بعد دعوے کے دوسرے مقدمے پر غور کرو۔ یعنی یہ کہ آنحضرت کے وصال کے بعد اطاعت و اتباع کے تقاضے آپ سے آپ معاشرے کو منتقل ہو جاتے ہیں' کیا اس پر کوئی نص موجود ہے؟ اور کوئی آیت بھی پورے قرآن میں ایسی پائی جاتی ہے' جس سے معاشرے یا مرکز ملت کی حجیت و استناد کا دوامی

ثبوت ملتا ہو؟ یعنی یہ ثابت ہوتا ہو کہ نبوت و وحی کی روشنی تو عارضی اور پیغمبر کی ذات تک محدود ہے، مگر معاشرے یا مرکز ملت کی ضیاباریاں تابہ قیام قیامت جاری و ساری ہیں۔

قرآن کا اعجاز ملاحظہ ہو، اس نے اس شبہے کا بھی سدباب کر دیا ہے اور اس سلسلے میں ایسی فیصلہ کن بات کہہ دی ہے کہ جس سے ہر طرح کی غلط فہمی کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے اطاعت و اتباع کے تقاضے تین خانوں میں منحصر ہیں: (۱) خدا (۲) رسول اور ان لوگوں کی اصطلاح کے بموجب (۳) معاشرہ مرکز ملت، یا فکر و اجتہاد کی کوئی بھی اجتماعی صورت جس کی بنیاد اسلام پر ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء: ۵۹)

"مومنو! خدا اور رسول کی پیروی کرو اور جو تم میں سے صاحب امر ہیں ان کی بھی"

ان میں کون اطاعت وقتی ہے اور کون دائمی ہے، کون زمان و مکان کی حد بندیوں سے وابستہ ہے اور کون ہمیشہ ہمیشہ لیے ہدایت و رہنمائی کی ضامن؟ اس کے لیے اسی آیت میں مذکور اس ٹکڑے کو دیکھیے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نساء: ۵۹)

"اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف رونما ہو تو اگر خدا و آخرت پر تم ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔"

گویا آخری فیصلہ اور حجیت و استناد کا آخری پیمانہ خدا اور اس کا رسول ہے، 'مرکز ملت' اولی الامر اور معاشرے کے اجتماعی فیصلے نہیں۔!

## (۱۷)

# حفاظت حدیث اور قرآن

سنت سے فرار اور انکار حدیث کی جو صورتیں ممکن تھیں گزشتہ صفحات میں ان میں سے دو کے بارے میں ہم تفصیلی گزارشات پیش کر چکے ہیں یعنی یہ بتا چکے ہیں، کہ قرآن حکیم ان معنوں میں ہرگز مفصل نہیں کہ صاحب قرآن کی اسوہ طرازیوں سے بے نیاز ہو جائے اور جس اساس اور بنیاد کی استواری اور استحکام اس کا نصب العین ہے اور جس عنصر کو دین کے جزو ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے، خود اسی اساس اور بنیاد کو برباد کر دے اور اسی اصل و عنصر کی اہمیت کو گھٹا کر رکھ دے۔

ہم اس غلط فہمی کو بھی دور کر چکے ہیں کہ آنحضرت کی نبوت وقتی و ہنگامی سربراہی کا قصہ نہیں، بلکہ ایک ابدی ہدایت ہے اور اس کی فیض رسانیوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہنے والا ہے، جب تک کہ انسانی معاشرے کو ہدایت و رہنمائی کے متعین اصولوں کی احتیاج لاحق ہے۔

فرار کی تیسری راہ یہ تھی کہ یہ مانا کہ تشریح قرآن کے سلسلے میں احادیث کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مگر ذخیرہ احادیث چوں کہ محفوظ نہیں ہے اور اس میں عجمی سازش کی جھلک صاف طور پر پائی جاتی ہے، لہذا یہ متناقض اور پایہ استناد سے ساقط ہے۔

یہ اعتراض بظاہر بہت وزنی ہے اور اس کو پیش کرنے والے وہ تمام مستشرقین ہیں، جنھوں نے حدیث، فقہ اور سیرت کو اپنا موضوع ٹھہرایا ہے۔ ان کی اس تحقیق کی غرض و غایت زیادہ

پیچیدہ نہیں۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ ان کی پوری دینی تاریخ تحریف و تبدل کا افسوس ناک مرقع ہے اور عہد نامہ قدیم سے لے کر عہد نامہ جدید تک کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے یہ مستند کہہ سکیں اور دنیا کے سامنے بہ طور تاریخی حقیقت کے پیش کر سکیں تو اس صورت حال سے قدرتا ان کے دلوں میں منتقمانہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں' اور یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو بھی کسی نہ کسی طرح کھینچ کر عیسائیت کی اس سطح پر لے آئیں اور اس کی تاریخ میں جو حیرت انگیز تسلسل' ربط اور استواری پائی جاتی ہے اس کو غلط ثابت کر دیں۔ نیت کا فساد' تحقیق و تفحص کے پاکیزہ جذبے کو کس قدر بگاڑ دیتا ہے' اس کی عمدہ مثال ہمیں مغرب کے ان محققین میں ملتی ہے جو مسیحیت کے جوش تبلیغ میں اپنے مرتبۂ تحقیق کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ مگر چوں کہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں' اس لیے بہ ہر حال معذور ہیں۔

زیادہ افسوس ناک طرز عمل ان سادہ لوح مسلمان حضرت کا ہے جو مغرب کے ان چبائے ہوئے نوالوں کو مختلف عنوانوں سے سجا سجا کر دستر خوان پر پیش کرتے ہیں اور مصر ہیں کہ انھیں مسلمانوں کے حلق میں اتار کر رہیں گے' اور یہ نہیں جانتے کہ ملت اسلامیہ کا دینی مزاج و ذوق اس انداز کی گمراہیوں کو آسانی سے گوارا کرنے والا نہیں۔

مارگولیتھ' میور اور شاخت اگر حفاظت حدیث کے عقیدے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں تو یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے' مگر مسلمان جب اس نزاع کی پیش پا افتادہ باتوں کو اچھالتے ہیں تو وہ کیا چاہتے ہیں اور اس شرارت سے ان کا کیا مقصود ہے اس کی توجیہہ کم از کم ہمارے ذہن کے احاطۂ ادراک سے باہر ہے۔

خیر۔! اب جب کہ ایک گروہ کی کاروباری مصلحتیں اس بات کی مقتضی ہیں کہ وہ اس طرح کے اعتراضات کو بہرحال اہمیت دیں اور انہی پٹی ہوئی راہوں پر گام فرسا ہوں تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کا جواب دیں اور اس میں فکر و استدلال کی جو خامیاں ہیں انھیں واضح کریں۔

حفاظت حدیث کے سلسلے میں پچھلی بحثوں کو ذہن میں مستحضر رکھیے۔ ہم یہ بتا آئے ہیں کہ نبوت دین کی ضروری اساس ہے۔ یہ بھی بتا چکے ہیں کہ جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس نے رسول کی اطاعت و پیروی کو بغیر کسی شرط و قید کے ضروری ٹھہرایا ہے اور ہم اس نکتۂ جاں پرور کی

بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ نبوت کا تصور اسلام میں مکانکی نہیں ہے، بلکہ یہ منصب جلیلہ ایسے نور اور روشنی سے تعبیر ہے جس سے قلب وضمیر پوری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

اگر یہ نکات ذہن میں پوری وضاحت کے ساتھ جلوہ گر ہیں تو ان کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ احادیث رسول کی حفاظت کے بارے میں کوئی خلش دل میں باقی نہ رہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ رسول کو اس صورت میں کبھی بھی اساس دین کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتا اور شارح ومطاع قرار نہیں دے سکتا، جب کہ علمی اعتبار سے یہ اساس بجائے خود مشکوک اور کمزور ہو، اور جب کہ اس کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داریوں کو نہ صرف یہ کہ اس نے قبول نہ کیا ہو، بلکہ اس کی صیانت کے لیے ایسا نظام نہ رائج کیا ہو جو سائنٹیفک اور علمی اصولوں پر استوار ہو۔ آیئے زیر بحث مسئلے کو ہم اسی وضاحت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کریں۔

اس تجزیے کا مطلب یہ ہے کہ متنازع فیہ سوال، تحقیق وتفحص کے ان دو متعین خانوں میں منحصر ہے۔

۱۔ کیا قرآن نے حفاظت حدیث کی ذمہ داریوں کا اعلان کیا ہے؟

۲۔ اور کیا تاریخی طور پر حفاظت حدیث کا کوئی سائنٹیفک نظام پایا جاتا ہے؟

آیئے ان دونوں نکات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

## ابن حزم کی دقیقہ سنجی:

جہاں تک تنقیح نمبر ۱ کا تعلق ہے، اس کے جواب کے لیے ہم علامہ ابن حزم کی دقیقہ سنجی کے مرہون منت ہے۔ ان کی ظاہریت محل گفت گو ہو سکتی ہے اور ان کے انداز استدلال پر بھی قیل وقال کی یقیناً گنجائش ہے۔ مگر ان کی اس خصوصیت میں ان کا کوئی حریف نہیں کہ بسا اوقات یہ خصم کے مخصوص دلائل کی ایسی لگتی ہوئی اور دل نشین توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ جس سے دلائل کا رخ ہی پلٹ جاتا ہے۔ مثلاً احادیث کی عدم حفاظت کے بارے میں سورہ حجر کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (حجر: ۹)

(ہم نے یہ نصیحت اتاری ہے اور بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے

ہیں۔ )

اور کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، احادیث کی حفاظت کا نہیں۔

علامہ کا اس پر استدراک ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں:

قرآن کی حفاظت کے معنی، صرف متن قرآن کی حفاظت کے نہیں ہو سکتے، بلکہ اس پورے نظام فکر و ذکر کے ہیں جو قرآن کے مطالب و معانی کی تشریحات پر حاوی ہے۔ کیوں کہ اگر وہ فصیح و بلیغ زبان ہی نہ رہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے، اور اس معاشرے کے خدوخال ہی مٹ جائیں، جس کی قرآن نے رہنمائی کی ہے اور جس کی مشکلات کو اس نے سلجھایا ہے، یا وہ علمی ماحول اور پس منظر ہی خدانخواستہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے کہ جس کو سمجھے بغیر قرآن سے کسی واضح نقشہ حیات کا استنباط نہیں کیا جا سکتا تو اس کو قرآن کی حفاظت نہیں کہیں گے۔ قرآن تو اسی وقت محفوظ سمجھا جائے گا، جب اس کے مطالب محفوظ ہوں گے، اس کی تشریحات محفوظ ہوں گی، اس کی زبان دست برد زمانہ سے محفوظ رہے گی اور وہ ماحول اور معاشرہ محفوظ رہے گا جس نے عملاً قرآن کی روشنی سے دیدہ و دل کو منور کیا تھا۔ گویا جب تک لوازم قرآن محفوظ نہیں، متن قرآن محفوظ نہیں!

علامہ نے کتنے پتے کی بات کہی ہے۔ اسے اس ہمہ گیر صداقت کی روشنی میں دیکھیے کہ جن قوموں نے گزشتہ تاریخ میں تشریح و تعبیر کے اولین سرچشموں کی حفاظت نہیں کی ہے ان کے دین کو تحریف و تبدل نے کس طرح مسخ کیا ہے اور کس طرح ان کی الہامی کتابیں آج افادیت و زندگی سے محروم ہو گئی ہیں۔

علامہ ابن حزم کی تائید میں حفاظت حدیث کے سلسلے میں ایک ایجابی اور مثبت قدم بھی اٹھایا جا سکتا ہے، قرآن نے جہاں **الذکر** کی حفاظت کی ذمہ داری قبول فرمائی ہے، جس میں سنت و حدیث بھی تضمناً داخل ہے، وہاں آپؐ کے ذکر کو خصوصیت سے بلند کرنے کا تہیہ بھی کیا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الانشراح: ۴)

(اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔ )

بتائیے، اس سے زیادہ واضح اور فیصلہ کن کون سی آیت اس مضمون کے بارے میں ہو سکتی

ہے۔ محل استدلال یہ نکتہ ہے کہ رفعت ذکر حفاظت ذکر کو مستلزم ہے۔ کیوں کہ اگر ذخیرہ احادیث مشکوک اور نامستند ہو تو جس رفعت ذکر کا مژدہ آنحضرت کو سنایا جا رہا ہے، وہ کبھی بھی تاریخی حقیقت کی صورت میں متحقق نہ ہو سکے گا۔

## حفاظت حدیث کا سائنٹیفک نظام:

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن حکیم ہی کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رفع ذکر حبیب کا تذکرہ بھی کیا ہے اور تشریحات نبوت کو محفوظ رکھنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیام: ۱۱۹)

(پھر اس کے حقائق کو کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمے ہے۔)

تو حل طلب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ حفاظت حدیث کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے کیا سائنٹیفک نظام اختیار کیا ہے اور وہ کون ذرائع تھے جن کی بدولت فن حدیث کا لازوال خزانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

اس سلسلے میں ہم صرف حسب ذیل تین نکات کی طرف توجہ دلائیں گے:

۱۔ عمل و کردار یا تاریخ اسلامی کا بے نظیر تسلسل۔

۲۔ تعلیم و تدوین حدیث کا خاص اہتمام۔۔۔۔۔۔ اور

۳۔ آثار و سنن پر مبنی فقہ اسلامی کی تدوین

## تسلسل عمل و کردار:

جہاں تک پہلے نکتے کی تشریح کا تعلق ہے، چند حقائق بالکل واضح ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام ایک عملی مذہب ہے، اس کی ایک تاریخ ہے، اس نے ایک متعین اور ممتاز معاشرے کی تخلیق کی ہے، اور جن جن افکار و تصورات کو اس نے پیش کیا ہے، ان کو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں سمو کر دکھایا ہے۔ یہ معاشرہ جس کو اسلام نے جنم دیا، یہ جماعت جو اسلام کی بدولت زندہ و جاوید ہوئی، اور یہ امت جس نے آنحضرت کی تعلیمات کو حرز جان بنایا اور تسخیر عالم کا باعث ہوئی، ایک جیتی جاگتی اور زندہ و فعال امت ہے۔ اس کی تاریخ اور عمل کا کوئی گوشہ تاریکی کا شکار نہیں

اور اس کی حرکت و تگ و دود کی کوئی کڑی ایسی نہیں جو گم شدہ ہو۔ اس کی ہر بات معلوم اور متعین اور ہر شے نکھری ہوئی اور واضح۔۔ اس حقیقت کی روشنی میں غور طلب یہ شے ہے کہ آنحضرت کی زندگی میں ہزاروں انسانوں نے' اسلام قبول کیا' اس کی تفصیلات کو جانا بوجھا اور ان پر عمل کیا اور پھر اس زندہ و فعال گروہ کو لاکھوں انسانوں نے دیکھا پرکھا اور محسوس کیا۔ ان کا خاص نظام عبادت ہے' مخصوص طرز معاشرت ہے' اور متعین تہذیب و ثقافت ہے' اور پھر کروڑوں انسانوں نے ان کے اس توارث عمل اور تہذیبی ورثے کو بعد کے آنے والے کروڑوں انسانوں تک پہنچایا' تاآنکہ یہ دولت اور میراث اس دور تک پہنچی اور ہمارے لیے خیر و برکت کا باعث ہوئی۔

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جب اس پورے تسلسل عمل و کردار میں جس کا نقطۂ آغاز آنحضرت کی ذات گرامی اور عہد گرامی سے ہوا' کہیں انقطاع اور رخنہ نہیں پایا جاتا تو اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی دینی ثقافت اور تہذیب مذہبی کا ایک ایک خدوخال بالکل محفوظ ہے اور تاریخ کی ستم ظریفیاں اس کے مزاج و نہاد پر قطعی اثر انداز نہیں ہو سکیں۔ یعنی یہ معاشرہ تھوڑی سی جزوی تبدیلیوں کے باوجود وہی روزے رکھتا ہے' وہی نمازیں پڑھتا ہے' جن کی تعلیم آنحضرت نے دی اور اس کے طریق حج اور اداے زکوٰۃ کے مسائل کا آج بھی وہی انداز ہے' جس کی بنیاد آنحضرت نے رکھی۔

ہم جانتے ہیں کہ آنحضرت کے بعد طرح طرح کی بدعات کو فروغ ہوا' نئی نئی باتیں دین کا جز بنیں اور خالص اور اصلی دین میں کئی غیر دینی عناصر کی آمیزش ہوئی' مگر اہل علم کے حلقوں میں ان سب پر احتجاج ہوا' ان کی تردید میں صحابہ سے لے کر آئمہ حدیث تک ہر گروہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہ بتایا کہ اسلام کی واضح اور روشن تعلیمات میں ان چیزوں کے اضافے کو ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ تسلسل عمل و کردار اس نوعیت کا ہے کہ اس میں بہ ہرحال کوئی نیا عنصر ایسا داخل نہیں ہو پایا کہ جس کے خلاف امت نے نوٹس نہ لیا ہو اور جس کو علم و عقیدے کی حد تک کم از کم الگ نہ کر دیا گیا ہو۔

تسلسل کردار و عمل کے یہ معنی ہیں کہ امت کے روزمرہ کے اعمال میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو پائی اور اس کے اجتماعی نقشۂ حیات پر کسی جانی بوجھی پرانی روایات کو بدلا نہیں گیا۔ چناں

چہ نمازیں آج بھی پانچ ہیں، روزے آج بھی تیس ہیں اور حج و مناسک کی آج بھی وہی صورت ہے جو کہ چودہ سو سال پہلے تھی۔ ان میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہو پائی۔

## تاریخ کی محفوظیت اور اسلام:

تاریخ کی محفوظیت اسلام کا مایہ ناز امتیاز ہے۔ یہودی بہت پرانی اور روایت پرست قوم ہے جسے اپنی تہذیب و ثقافت سے تابہ حد تعصب لگاؤ ہے۔ مگر فلک ستم پیشہ کی کار فرمائی ملاحظہ ہو کہ ان پر ایسا دور بھی آیا جب یروشلم سے ان کا تعلق منقطع کر دیا گیا، جب بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور تورات یا صحائف انبیا کا ایک ایک ورق نذر آتش کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بالکل ہی ایک نئی تاریخ مرتب کرنا پڑی اور صرف حافظے کے بل بوتے پر اپنی عظمت رفتہ کے نقوش کو از سر نو اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ احیاے دین کی اس سعی و کوشش میں انھیں کس درجہ کامیابی حاصل ہوئی اور کس حد تک یہ قوم انبیا کے مقدس ورثے کو، اگلی نسلوں تک منتقل کر پائی، اس کا سراغ لگانا ہو تو خود بائیبل کا مطالعہ کیجیے۔ کتاب کا ایک ایک صفحہ بتائے گا کہ کس بے دردی سے حقائق کو بدلا گیا ہے اور کس دلیری اور جرأت سے اللہ کے دین کو مسخ کیا گیا ہے؟

عیسائیت کی تاریخ شومئ قسمت سے یہودیوں سے مختلف نہیں، آج جو شے اناجیل اربعہ کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں ہے، اس کے کسی حصے کو بھی حجیت و استناد کا درجہ حاصل نہیں۔ نہ اس کی زبان حضرت مسیح کی زبان ہے، نہ اس کی مضامین کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بعینہ وہی ہیں جن کی تبلیغ و اشاعت کے لیے حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے مامور بنا کر بھیجا تھا۔ اس میں یہودی فلسفے کی آمیزش بھی ہے اور رومی دیو مالا کی جھلک بھی، روپوش کے افکار بھی ہیں اور مرتبین اناجیل کے اپنے تصورات بھی، توحید بھی ہے اور تثلیث بھی، نبوت و عبدیت کے دعوے بھی ہیں اور الوہیت کے مضمرات بھی! یعنی اس میں وہ سب کچھ موجود ہے کہ جس سے اس عہد کے عقائد کی پوری پوری تصویر کھینچی جا سکتی ہے، اور اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ انجیل یا خوش خبری نہیں ہے جس کو صبح و مسا کی بھرپور زندگی میں عیسائی اپنا رہنما ٹھہرا سکتے تھے۔

یہ فخر اسلام کے مقدر میں تھا کہ اس کے ماننے والے قرآن حکیم کی تعلیمات کو زندہ رکھیں اور اس کے ایک ایک شوشے پر حفظ و صیانت کے پہرے بٹھائیں۔ یہی نہیں، اس کی تشریحات اور

تعبیرات کو آویزۂ گوش بنائیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کو طرۂ ہوش ٹھہرائیں۔ اور اس سعادت کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھنے والا تھا کہ محسن و معلم اور مرشد و مزکی کی ایک ایک ادا کو اس ذمہ داری‘ اس حزم و احتیاط اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ اگلی نسلوں تک پہنچائیں کہ جب وہ قال قال کی دل نواز صدائیں سنیں تو ذہن و قلب میں قامت یار کی تمام رعنائیاں سمٹ آئیں۔ جب حدثنا و اخبرنا کے نغمے کانوں سے دو چار ہوں‘ تو فکر و دانش کے مرکزوں میں لب محبوب کی تمام حلاوتیں ارتعاش و اہتزاز کی ایک لہر دوڑا دیں۔

اس مضمون کی مزید تشریح آگے آئے گی‘ یہاں تو ہمیں صرف اس حقیقت کی طرف التفات و توجہ کی سمتوں کو موڑنا ہے کہ جہاں تک اسلامی معاشرے کا تعلق ہے اس نے دینی تعلیمات کو عمل و کردار کی صورت میں محفوظ رکھا ہے اور یہ کہ حفاظت دین کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کوئی قوم اپنے ہادی و رہنما کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے۔ غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے سردست عمل و کردار کے اس تسلسل کو ذرا محدود کیجیے اور یوں سمجھیے کہ آنحضرت نے قرآن کی جو تشریح کی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو جس انداز و طریق سے برت کر دکھایا‘ اس نے باقاعدہ ایک اجتماعی زندگی کی شکل اختیار کرلی اور پھر اس معاشرے میں یہ ہدایات اس طرح رچ بس گئیں اور اس طرح ہزاروں‘ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں تک منتقل ہوتی چلی گئیں کہ اگر کوئی شخص کتاب اللہ اور ذخائر احادیث کی ورق گردانی نہ کرے‘ جب بھی مجرد اسلامی معاشرے کے مطالعہ سے اسلام کے مزاج اور معمولات کے بنیادی نقشے کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اور بتایا جاسکتا ہے کہ اس ملت کے عقائد و افکار کی اساس کیا ہے اور اس کے تصورات و اعمال کی موٹی موٹی باتیں کیا ہیں؟

## تعلیم و تدوین حدیث کا اہتمام:

تسلسل کردار و عمل کے پہلو بہ پہلو اس حقیقت پر بھی غور کیجیے کہ یہ تسلسل کیوں قائم رہا؟ اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ آنحضرت نے جس معاشرے کو پیدا کیا اور جس جماعت میں اپنے کردار و عمل کی تابش و ضو کو سمو کر دکھایا وہ جادۂ مستقیم سے انحراف نہیں اختیار کرے گی اور اپنی منزل کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دی گی!

ہماری رائے میں ان خدشات کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس معاشرے کی تخلیق کی ہے اور جس امت کو دین کی عملی نعمتوں سے نوازا ہے‘ اس کو یوں ہی چھوڑ نہیں دیا‘ بلکہ اس کے لیے

علمی اساسوں اور بنیادوں کو بھی مہیا کیا ہے۔ چناں چہ پہلی اور قطعی بنیاد قرآن ہے اور دوسری مستند اور ایمان افروز بنیاد حدیث ہے۔ یہ دونوں مشعلیں ایسی ہیں کہ جن کی ضیاگستری سے عالم اسلام ایک لمحے کے لیے بھی کبھی محروم نہیں رہا۔

یہ مفروضہ غلط اور غیر علمی ہے کہ حدیث کی تدوین تیسری صدی ہجری میں کہیں جا کر ہوئی اور اس سے پہلے صحابہ یا تابعین نے تدوین و کتابت حدیث کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہمیں احادیث و سیر کے ذخائر سے اس طرح کی کافی شہادتیں ملتی ہیں کہ جن سے خود صحابہ کا احادیث کو قلم بند کرنا ثابت ہوتا ہے۔

چناں چہ بعض حفاظ کا کہنا یہ ہے کہ زید بن ثابت نے علم الفرائض کے بارے میں احادیث کی تصریحات کو ایک رسالے کی شکل میں مدون کیا تھا۔ بخاری نے تصریح کی ہے کہ عبداللہ بن عمر احادیث کو قلم بند کیا کرتے تھے۔ اسی طرح امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایک ایسی کتاب کی تدوین کا ذکر کیا ہے جو حضرت علی کے فیصلوں پر مشتمل تھی۔ خود آنحضرت کا سلاطین و ملوک کی طرف خطوط لکھوا کر بھیجنا مشہور اور مصدقہ واقعہ ہے، مصدقہ اس لیے کہ اب یہ خطوط اپنی اصلی شکل میں مل گئے ہیں اور ڈاکٹر حمید اللہ کی مساعی جمیلہ سے مغرب کے علمی حلقوں میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کا مضمون بعینہٖ وہی ہے جو کتب حدیث میں مذکور ہے۔ اس اثری شہادت سے وہ مستشرقین بوکھلا گئے ہیں جو یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ احادیث وضعی ہے اور حدثنا اور اخبرنا کا یہ سارا کارخانہ رواۃ کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔

اس انکشاف سے ان کے پندار استشراق کو سخت ٹھیس لگی ہے اور اب یہ حضرات اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح خطوط کا جعلی ہونا ثابت ہو جائے۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شد

تھوڑی دیر کے لیے ان روایات سے قطع نظر کر لیجیے اور یوں سوچیے کہ اگر اسلام ایک عملی دین ہے اور آنحضرت کی زندگی تنہا ایک شخص اور فرد کی زندگی نہیں تھی بلکہ ایک رسول، ایک پیغمبر اور شارح دین کی زندگی تھی تو یہ کس درجہ ضروری تھا کہ صحابہ آپ کی زندگی کی جزئیات سے اعتنا کرتے، آپ کے احوال و ارشادات کو دوسروں تک پہنچاتے اور اس کی حفاظت و تبلیغ کا خاطر خواہ انتظام کرتے۔

بعض لوگوں نے اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ان اقوال کی آڑ لی ہے، جن میں حدیث بیان کرنے سے روکا گیا ہے، مگر کیا ان لوگوں نے سوچا ہے کہ اس سے خود ان کے دعوے کی تردید کا پہلو نکلتا ہے، کیوں کہ اس سے کم از کم اس حقیقت کا پتا تو چلتا ہے کہ لوگ احادیث کو قلم بند کرنے کے کس درجہ آرزو مند تھے۔ دوسری شے جو دیکھنے کی ہے یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتابت حدیث سے روکا خود ان کا طرز عمل کیا تھا اور ان کا درجہ صدیقیت اور فاروقیت آنحضرت کے ساتھ تعلق و رشتے کی کن نوعیتوں کا طالب ہے۔ یعنی کیا ثانی اثنین کی زندگی کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ سنت کی منت پذیریوں سے آزاد تھی، یا حضرت عمر کے جذبۂ عشق رسول سے کوئی شخص انکار کرنے کی جرائت کر سکتا ہے اور ایمان داری سے یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمر حجیت حدیث کے قائل نہیں تھے۔

میراث جدہ کے بارے میں حضرت ابوبکر کے استصواب سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے صحابہ سے برسرعام یہ پوچھا تھا کہ اس کے متعلق آنحضرت کا کیا ارشاد تھا؟ اور جب مغیرہ نے بتایا تھا کہ آنحضرت جدہ کو سدس دیا کرتے تھے تو حضرت ابوبکر نے محمد بن مسلمہ کی شہادت پر اس فیصلے کو تسلیم کر لیا تھا۔

اسی طرح یہ واقعہ آپ نے قریب قریب ہر واعظ کی زبان سے سنا ہو گا کہ حضرت ابو موسیٰؓ، حضرت عمرؓ کے ہاں آئے اور تین مرتبہ سلام کہہ کر اس بنا پر لوٹ گئے کہ سلام کا جواب نہیں آیا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں بلوایا اور سند پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے اس طرز عمل کی تائید میں آنحضرت کا ارشاد گرامی رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ کو توثیق کے بعد ابو موسیٰ کی یہ بات ماننا پڑی۔

جن لوگوں نے ان مراسیل کو بیان کیا، ان کے وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ انھیں کبھی جہل و نادانی سے انکار حدیث کی غرض سے بھی پیش کیا جائے گا۔ وہ تو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ صحابہ احادیث کے رد و قبول میں کس درجہ تثبت، احتیاط، اور چوکسی کے قائل تھے۔ اور محدثین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہا کہ ایک ہی حدیث کے لیے طرق متعددہ کا ہونا کس درجہ مفید اور ضروری ہے۔ مزید براں حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب قول صحیح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

صحابہ اخذ و تحمل حدیث میں رواۃ کا کتنا خیال رکھتے تھے، اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن

عباس کے اس طرز عمل سے لگایئے کہ بشر عدوی ان کے پاس آتا ہے اور قال رسول اللہ و قال رسول اللہ کی رٹ لگاتا ہے۔ مگر حبر امت ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ وہ جب پوچھتا ہے کہ کیوں صاحب حدیث سے یہ بے توجہی! تو عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں:

> **انا کنا مرة اذا سمعنا رجلا یقول قال رسول الله ابتدرته ابصارنا واصغینا الیه باذاننا فلما رکب الناس الصعب والذلول لم ناخذ من الناس الا ما نعرف**
>
> (ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب کوئی شخص حدیث رسول بیان کرتا تو ہماری آنکھیں بے اختیار اس کی طرف اٹھتیں اور ہمارے کان پوری توجہ اور التفات سے اس پر مرکوز ہو جاتے، مگر جب سے لوگوں نے بغیر تحقیق کے ہر ہر بات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا ہے تو ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ صرف انھی احادیث کو قبول کریں جن سے ہمارا ذوق و علم آشنا ہے۔)

صحابہ میں روایت حدیث کے بارے میں جذبہ احتیاط اس درجہ غالب تھا کہ بعض جید صحابہ نے اس بنا پر سرے سے کوئی حدیث ہی بیان نہیں کی کہ مبادا روایت حدیث میں کہیں غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ چناں چہ سعید بن زید بن عمرو بن نفیلؓ نے محض اسی وجہ سے روایت حدیث سے کنارہ کشی اختیار کر لی، حالاں کہ ان کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا تھا اور وہ چاہتے تو بہت سے واقعات کی پردہ کشائی فرما سکتے تھے۔ اسی حقیقت کا اظہار عمران بن حصین نے ان الفاظ میں کیا کہ:

> اگر میں چاہتا تو تم لوگوں کو دو دن لگاتار احادیث رسول سناتا رہتا، مگر اس اندیشے سے ہمت نہیں پڑتی کہ کہیں میرا وہی حال نہ ہو جائے جو ان لوگوں کا ہوا ہے جنھوں نے واقعات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ یعنی غلط الفاظ کے انتخاب سے کہیں کہیں فرق آگیا ہے۔

احتیاط و تثبت میں یہ غلو تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ: صحابہ ایک ایک حدیث کی تلاش کے لیے سفر کی بے شمار صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور اسے حاصل زندگی سمجھتے ہیں۔ صحیح بخاری میں جابر بن عبد اللہ کا واقعہ مذکور ہے کہ انھوں نے عبد اللہ بن انیس سے صرف ایک حدیث سننے کی خاطر پورے ایک ماہ کی کلفتوں کو انگیز کیا۔

یہ دور صحابہ کا تھا۔ اس سے ملا ہوا تابعین کا ہے، جن میں سعید بن مسیب، قیس بن ابی حازمؒ، ابو عثمان نہدی، قیس بن عباد، وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان حضرات نے تعلیم و تدریس کے باقاعدہ مرکز قائم کیے اور تلامذہ کی ایک کھیپ تیار کر دی، جنھوں نے تبلیغ و تعلیم حدیث کے نصب العین کو زندگی بھر کے لیے اپنا لیا۔ یہ طبقہ تبع تابعین کا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں، اور ان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک وسیع ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ انھی میں بڑے بڑے ائمہ مذاہب کا شمار ہوتا ہے۔ یعنی اس میں فقہ اسلامی کے وہ نابغہ اور باکمال لوگ داخل ہیں، جنھوں نے حدیث کے ساتھ ساتھ فہم حدیث یا فقہ اسلامی کو بھی فروغ دیا، جیسے مالک، اوزاعی، ثوری، العتکی اور ابن جریج وغیرہ۔

تدوین حدیث کی تاریخ پر سرسری نظر رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اس مبارک دور میں حدیث کے کئی مجموعے تیار ہو گئے۔ چناں چہ مکہ میں ابن جریج، مدینہ میں مالک، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور کوفہ میں سفیان ثوری وغیرہ نے ضبط و تحریر احادیث کے سلسلے میں جلیل القدر خدمات انجام دیں۔

اور ابھی دوسری صدی ہجری ختم نہیں ہوئی تھی کہ مسانید کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک مسند عبداللہ بن موسیٰ عبسی نے لکھی، ایک امام احمد نے ترتیب دی۔ ایک اسد بن موسیٰ نے تحریر کی۔ ایک نعیم بن حماد خزاعی نے مدون کی اور اس طرح یہ سلسلۂ حدیث و روایت بالآخر امام بخاری تک پہنچا، جنھوں نے اس سے زوائد کو چھانٹا۔ آثار و فتاویٰ کو الگ کیا اور جرح و تعدیل کی ترازو میں تول تول کر ایک ایک حدیث کو اپنی صحیح میں درج کیا۔

## حفاظت حدیث کا تیسرا عامل ---------- تدوین فقہ:

حفاظت حدیث کا تیسرا عامل (Factor) فقہ اسلامی کی تدوین ہے، جس سے سنت کا وہ حصہ ہمیشہ کے لیے زیب قرطاس ہو گیا، جس کا تعلق زندگی کی تشریحی و قانونی بنیادوں سے ہے، یا جس کو ہم اسلام کے فقہی و آئینی نقشے (Legal Structure) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کی خاطر یوں کہیے کہ جہاں کردار و عمل کے تسلسل کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں سنت کے مطابق عبادات اور معمولات کا بندھا ٹکا نظام قائم ہو گیا اور جہاں تعلم و تدوین حدیث کی کوششوں نے ان معمولات و عبادات کے لیے سند (Authority) مہیا کی، وہاں فقہ کی تدوین سے یہ فائدہ

پہنچا کہ سنت و حدیث کے قریب قریب تمام قانونی پہلو نظر و فکر کے سامنے آ گئے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر یہ حقیقت ہے کہ فقہ کے ان تمام مدارس فکر میں کوئی مدرسہ بھی ایسا نہیں جس نے سنت کی حجیت و استناد کو ٹھکرایا ہو اور تنہا قرآن کی تصریحات پر قصر فقہ کی تعمیر کی ہو۔ ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور اوزاعی وغیرہ فقہا و ائمہ کے کارناموں سے کون ناواقف ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی فکری کاوشوں میں دوسری صدی ہجری کے اوائل سے تیسری صدی ہجری کے نصف تک کے تمام ان دلائل کو سمیٹ لیا ہے، جن سے فقہ و قیاس کی توسیع میں مدد مل سکتی ہے۔

چناں چہ ان کی کتابوں میں ان کے بیان کردہ مسائل اور طریق استدلال میں ہمیں وہی روح ایمان پرور، وہی جیتا جاگتا اسلامی ضمیر اور وہی خصوصیات دینی کارفرما اور جاری و ساری نظر آتی ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے پیش رو مشائخ تابعین و تبع تابعین سے بطور ورثے کے حاصل کیا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جزئیات میں ہمیں ان بزرگوں سے کہیں کہیں اختلاف ہو، مگر ان کی عظمت قدر اور ان کی ان جلیل القدر خدمات سے کیوں کر انکار ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر آئین و قانون کی زلف پریشان کو سلجھانے کی کوشش کی اور آنے والی نسلوں کو بتایا کہ تشریع و فقہ کی مستقل بنیادیں کون ہیں اور وہ کون اصول اور پیمانے ہیں، جن سے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

نامناسب نہ ہو گا اگر ہم ان حضرات کے مختصر سوانح پر ایک نظر ڈالتے چلیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ لوگ اسلام کے کتنے قریبی دور میں پیدا ہوئے۔ ان کے اساتذہ و مشائخ کا درجہ کیا ہے؟ اور کیوں کر ان کی کوششوں نے فقہ کے بیش قیمت ذخائر کی شکل اختیار کی۔

## امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ:

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جنھیں فہم و فکر کا خارقہ کہنا چاہیے، ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں اپنے اللہ سے جا ملے جس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے ستر برس کی طویل عمر پائی اور تہذیب و تمدن کی ان تمام گل کاریوں کو بچشم خود دیکھا، جنھیں اموی اور عباسی عہد کی طرفہ طرازیوں نے ترتیب دیا تھا۔ یہی نہیں، انھوں نے حجاج کے چشم عتاب کا سامنا بھی کیا تھا اور عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد عدل و انصاف کے نظاروں سے بھی لطف اٹھایا تھا۔ یہ وہ دور تھا، جب عبد اللہ بن الحارث اور انس بن مالک ایسے خال خال صحابی زندہ تھے۔ دراصل یہ زمانہ کبار تابعین کا تھا۔

اس میں اختلاف ہے کہ انھوں نے باقاعدہ کسی صحابی سے استفادہ کیا یا نہیں، مگر یہ بات بہ ہرحال قطعی ہے کہ بالواسطہ ان کی فقہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علی کے افکار سے متاثر ہوئی۔ بالواسطہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے براہ راست جنھوں نے فائدہ اٹھایا، وہ قاضی شریح اور علقمہ بن قیس نخعی ہیں اور نخعی کے نفائس فکر کے حامل حماد بن ابی سلیمان ہیں، جن کی شخصیت اور علم سے حضرت امام سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔

اس میں بھی اختلاف راے ہے کہ فقہ کی کوئی کتاب آپ نے تصنیف کی یا نہیں اور آیا ابن ندیم نے جن کتابوں کا ان کی طرف انتساب کیا ہے جیسے "الفقہ الاکبر" "کتاب العالم والمتعلم" وغیرہ، ان کا انتساب تاریخی طور پر درست یا نہیں۔ مگر یہ حقیقت بہ ہرحال مسلمہ ہے کہ ان کے ارشد تلامذہ نے اپنی کتابوں میں فقہ حنفی کے نام سے جن فروع و اصول کا تذکرہ کیا ہے، ان کی تعیین و تنقیح میں بڑی حد تک حضرت امام ہی کی مجتہدانہ کوششوں کو دخل ہے اور اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے، جس کی حضرت امام نے نشان دہی کی ہے۔

فقہ حنفی کی خوش نصیبی کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے کہ اسے ابو یوسف، زفر اور محمد بن حسن شیبانی جیسے یگانۂ روزگار فضلا میسر آئے۔ ان حضرات کو اگرچہ فقہ حنفی کے زبردست مبلغین و شارحین کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے، تاہم ان میں ایک ایک بجائے خود بھی اچھی خاصی مجتہدانہ حیثیت کا مالک ہے اور اپنے مرتبہ و مقام کے لحاظ سے انفرادیت لیے ہوئے ہے۔

ان تینوں کی فقہی خدمات کن خصوصیات کی حامل تھیں، اس کو مزنی نے اپنی ایک جامع میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا۔

**ماتقول فی ابی حنیفة ؟ قال سیدھم۔ فابی یوسف؟ قال اتبعھم للحدیث۔ قال فمحمد بن الحسن؟ قال اوسعھم تفریعًا۔ قال فزفر؟ قال احدھم قیاسا۔**

(آپ کی ابو حنیفہ کے بارے میں کیا راے ہے؟ انھوں نے کہا وہ سید الطائفہ ہیں اور ابو یوسف؟ ان کا جواب یہ تھا کہ وہ ان سب سے بڑھ کر حدیث کے متبع ہیں اور محمد بن حسن؟ انھوں نے کہا انھیں تفریعات کا امام کہنا چاہیے اور زفر کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا قیاس و راے میں بہت تیز۔)

فقہائے احناف میں ابو یوسف کا مرتبہ علمی بہت اونچا ہے۔ ابن ندیم نے ان کی متعدد کتابوں کا نام لیا ہے۔ مگر دست برد زمانہ سے جو بچ رہی وہ صرف کتاب الخراج ہے۔ اس میں فکر و استدلال کے حقائق کے پہلو بہ پہلو احادیث و آثار کا بھی کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ خصوصیت سے حضرت عمر کے فیصلوں کو تو کثرت سے نقل فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کا نام قریب قریب ۱۲۳ مرتبہ کتاب کی زینت بنا ہے۔ یہ چوں کہ عہدۂ قضا پر مدتوں فائز رہے ہیں‘ اس لیے انھوں نے فقہ حنفی کو عمل و تجربے کے قریب تر کر دیا ہے۔

محمد بن حسن کی تعلیم و استفادے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے جہاں امام ابو حنیفہ سے فقہ سیکھی‘ وہاں امام مالک سے حدیث بھی پڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفریعات میں فکر و استدلال کے ان دونوں پیمانوں کا برابر ثبوت ملتا ہے۔ ان کی مشہور چھے کتابیں ہیں جنھیں حنفی مدرسہ فکر کی بنیادی کتابیں کہنا چاہیے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) مبسوط (۲) زیادات (۳) الجامع الصغیر
(۴) السیر الصغیر (۵) الجامع الکبیر (۶) السیر الکبیر

الحاکم الشہید نے ان سب کو "الکافی" نامی ایک ہی کتاب میں جمع کر دیا تھا‘ جس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں اور سرخسی کی المبسوط جو تیس ضخیم جلدوں میں چھپ گئی ہے انھی شروح میں سے ایک ہے۔

زفر کو فقہ حنفی کا تیسرا ستون قرار دینا چاہیے۔ ان میں اپنے استاد کا رنگ غالب ہے۔ یعنی مسائل میں یہ جس قدر قیاس کی استواریوں سے کام لیتے ہیں‘ ابو یوسف اور محمد بن الحسن اس درجہ نہیں لیتے۔ ان دونوں میں ان کے مقابلے میں اعتصام بالسنہ کا میلان زیادہ پایا جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ نے کتاب اللہ کے بعد جو آحاد سے تعرض نہیں کیا اور اپنی فقہ کی وسعتوں کو صرف سنت مشہورہ یا ان اقوال صحابہ تک محدود رکھا‘ جن کی مخالفت منقول نہ ہو‘ تو اس کی حسب ذیل وجوہ تھیں:

۱۔ عراق میں ان دنوں احادیث کا چرچا بہت کم تھا۔ نیز

۲۔ یہ خطہ چوں کہ ایرانی اور یونانی تہذیب و ثقافت کی جولان گاہ رہا تھا‘ اس لیے اس نے قیاس و رائے کے تقاضوں کو زیادہ ابھار دیا تھا۔

۳۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت تک تنقیح حدیث کے پیمانے بھی وضع نہیں ہوئے تھے اور جدید مسائل پورے زور اور قوت کے ساتھ ابھر آئے تھے جو کسی نہ کسی فوری حل کے متقاضی تھے۔

یعنی عرب جو اس وقت تک سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے‘ اب تہذیب و تمدن کی نئی نئی الجھنوں کا شکار تھے۔ غلاموں کی فراوانی‘ اراضی مفتوحہ کی مختلف نوعیتوں اور کاروبار کے ارتقا نے اسلامی معاشرے کو بدل کر رکھ دیا تھا‘ اس لیے ضروری تھا کہ زمانے کی رفتار کو روکے بغیر اس کی رہنمائی کی جائے اور اس کے لیے فقہ و قانون کے سانچوں کو متعین کیا جائے۔

فقہ حنفی کے بارے میں بیان نامکمل رہے گا‘ اگر ہم اس عام تاثر کے بارے میں اپنی رائے کا کھلے بندوں اظہار نہ کریں کہ اس کو حدیث کی نصرت و تائید حاصل نہیں۔ یا یہ کہ فقہاے احناف کا سرمایہ علمی زیادہ تر قیاس و رائے کی موشگافیوں پر مبنی ہے۔ ہمارے خیال میں علی الاطلاق یہ رائے صحیح نہیں۔ فقہ حنفی کے دو حصے ہیں:

☆ ایک عبادات کا حصہ ہے۔۔ اور

☆ ایک معاملات کا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک عبادات کا تعلق ہے‘ فقہ حنفی کی استواریوں کا دعوٰی نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں محدثین کا مسلک زیادہ مضبوط اور زیادہ مدلل ہے۔ اس لیے کہ عبادات کے مسائل سراسر نصوص یا احادیث سے ثابت ہوتے ہیں اور نصوص و احادیث کے متعلق حنفی فقہ کا دائرہ طلب زیادہ وسیع نہیں۔

مگر معاملات کا معاملہ اس سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس میدان میں فقہاے احناف نے جس قدر جولانیاں دکھائی ہیں اور جس دقت نظر‘ ژرف نگاہی اور مبنی پر تجربہ بصیرت و علم کا ثبوت دیا ہے اس کا اقرار نہ کرنا محض تعصب ہو گا۔

بحیثیت مجموعی فقہ حنفی کا یہ شرف کیا کم ہے کہ یہ تقنین (Codification) کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔

## امام مالک رحمۃ اللہ علیہ:

امام مالک رحمہ اللہ ۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ ہجری میں انتقال فرمایا۔ عمر عزیز کا زیادہ حصہ

مدینتہ النبی میں بسر ہوا۔ انھیں عشق پیغمبر کے باعث حدیث و سنت کا یہ مرکز جمیل اس قدر بھایا کہ سوا مکہ مکرمہ کے، اور وہ بھی حج کے سلسلے میں اور کہیں جانے کا انھوں نے کبھی قصد ہی نہیں کیا۔ اسی دیار حبیب میں یہ پلے بڑھے۔ اسی دبستان علم و معرفت میں انھوں نے تعلیم و تعلم کے مرحلے طے کیے اور اسی ریاض سنت میں انھوں نے بالآخر وہ مسند درس بچھائی کہ جس کی شمیم آرائیوں سے پورے عالم اسلامی نے استفادہ کیا۔ ان کے شیوخ میں نافع بن ابی نعیم اور ابن شہاب زہری کو خصوصیت حاصل ہے۔ نافع، حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد اور مولیٰ ہیں اور زہری اپنے دور کے سب سے بڑے رمز شناس حدیث! ان کے مدرسۂ فکر سے جو لوگ زیادہ متاثر ہوئے، ان میں عبداللہ بن وہب، عبدالرحمٰن ابن القاسم، اشہب، عبداللہ بن عبدالحکم اور لیثی کے نام سرفہرست ہیں۔

حدیث کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے قدرے مختلف تھا۔ ان کے نزدیک اگر حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے یا کم از کم حسن کے مرتبے پر فائز ہے تو اس سے احتجاج و استدلال میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی نہیں، ان کے نزدیک اہل مدینہ کا عمل بھی اس لائق تھا کہ اس پر فقہ و تشریع کی بنیادیں استوار کی جائیں۔ چناں چہ لیث کو ایک خط میں مخاطب کرکے لکھتے ہیں:

**ان الناس تبع لاھل المدینۃ التی الیھا کانت الھجرۃ وبھا نزل القران۔**

> لوگ اہل مدینہ کی اطاعت و اتباع پر مجبور ہیں، کیوں کہ یہی وہ مقام ہے جو آنحضرت کا مہجر قرار پایا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں قرآن کی برکات نازل ہوئیں۔)

موطا اور مدونہ، ان کے علم و معرفت کے دو شان دار مجموعے ہیں۔

موطا حضرت امام نے خود مرتب کیا تھا اور اس کی چھان بین اور تحقیق و تفحص میں قریب قریب چالیس سال لگائے تھے۔ اس میں چار ہزار سے کچھ زائد احادیث مندرج ہیں۔ اس کے کئی نسخے منقول ہیں۔ زرقانی نے جس نسخے کو شرح کی غرض سے چنا وہ یحییٰ بن لیثی کی روایت پر مبنی ہے۔

حدیث کے اس قدیم ترین سرچشمے کو شہرت و قبولیت کے کیا مدارج عطا ہوئے، اس کا اندازہ

اس سے لگائیے کہ حجاز سے تابہ اندلس و قیروان اس کے چرچے پہنچے اور فقہائے مصر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مدونہ حضرت امام نے خود مرتب نہیں کیا، بلکہ ان کے شاگرد رشید اسد بن الفرات نیشاپوری نے اسے جمع کیا۔ اس میں دونوں طرح کے افکار کی جھلک ہے۔ ان افکار کی بھی جن کا تعلق براہ راست امام سے ہے اور ان افکار کی بھی جو ان اصولوں سے مستنبط ہیں کہ جنھیں امام مالک نے تشریح و قانون کے سلسلے میں بنیاد اور اساس کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ یعنی اس میں ان تفریعات کا بھی اچھا خاصہ حصہ ہے جن کے بارے میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ براہ راست ان سے مروی نہیں تاہم یہ امام مالک کے فقہی پیمانوں کے مطابق ضرور ہیں۔ اس کی باقاعدہ ترتیب کا فخر سحنون کو حاصل ہے۔ انھوں نے نہ صرف اسے ابواب میں سجایا اور تقسیم کیا بلکہ بعض مسائل کی تائید کے لیے آثار بھی مہیا کیے ہیں اور انھی کی کوشش سے یہ مجموعہ معارف مغرب کے علمی حلقوں میں مقبول ہوا ہے۔

موطا میں اگرچہ مراسیل کی کثرت ہے، منقطع السند احادیث کی بھی کمی نہیں اور بلاغات کی اچھی خاصی تعداد بھی پائی جاتی ہے، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ دوسری صدی ہجری تک کے معمولات دینی اور فقہی پیمانوں کی جتنی کامیاب اور مستند تصویر اس کتاب نے پیش کی ہے اور کوئی کتاب اس باب میں اس کی شریک نہیں۔

بنابریں کیا اہل قرآن حضرات کم از کم موطا کی حد تک قرآن کی تشریح و تعبیر کو غیر معتبر جاننے کے لیے تیار ہیں؟ اور اس واقعہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں کہ صحابہ سے لے کر تابعین اور تبع تابعین کے اس دور تک، فکر و ایمان کی جن بنیادوں کا سراغ ملتا ہے ان میں اختلاف و تنازع کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی سمجھ بوجھ پر فی الواقع تعجب ہوتا ہے جو ایک طرف تو اتنا بڑا دعویٰ کو لے کر اٹھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی اصلی تاریخ کو بھلا دیا، ہدایت و رہنمائی کے سرچشمے سے منہ موڑ لیا، اور بجائے اس کے کہ صرف قرآن سے استفادہ کرتے، دینیات کی بنیاد بے بنیاد احادیث و روایات پر رکھ دی۔

دوسری طرف یہ نہیں بتاتے کہ اتنا بڑا انقلاب کب واقع ہوا؟ یہ عظیم گمراہی تاریخ کے کس دور میں رونما ہوئی اور کب اور کن لوگوں نے معجزانہ طور پر قرآن کو چھوڑ کر احادیث رسول کی

پیروی کو اختیار کرنا شروع کر دیا؟ یعنی اتنا حیرت انگیز انقلاب ہماری دینی تاریخ میں رونما ہوا اور ہمیں کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

تاریخ خاموش، کتابیں انگشت بدنداں اور ادب و دانش کے ذخائر حیران و ششدر!

یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی اور عقل و خرد کے مطابق ہے؟ اسلام تاریخی حقیقت کا نام ہے، یا یہ کوئی قبل تاریخ واقعہ سے تعبیر ہے کہ جس کا کچھ اتا پتا نہیں!

اگر صحابہ سنت رسول پر جان چھڑکتے تھے، تابعین و تبع تابعین اس کی اشاعت و تبلیغ میں جان فشانیاں دکھاتے تھے تو وہ کون بدبخت تھے جنھیں اس کی صحت و استناد پر شبہ تھا۔

ہمارے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ عقائد و ایمانیات کی تشریح و تعبیر میں کچھ نئے نئے افکار ابھر آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فروع و مسائل میں کہیں کہیں اختلاف پیدا ہو جائے۔۔۔۔ اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ بعض حلقوں میں بدعات کو فروغ حاصل ہو جائے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ دین کی اصل اور جڑ سے متعلق اتنا بڑا تناقض رونما ہو جائے اور ہماری پوری تشریعی تاریخ میں اس کا ذکر تک نہ ہو۔ لوگ راتوں رات قرآن کو چھوڑ کر حدیثوں اور روایتوں پر ٹوٹ پڑے ہوں اور اسلامی معاشرے کو اسے احساس تک نہ ہو۔

یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ امام ابو حنیفہ ؒ کی فقہی کوششوں کے بعد یہ دوسری کامیاب کوشش تھی، جس نے اسلامی ذہن و کردار کو محفوظ رکھنے میں مدد دی، جس کی بدولت صحابہ ؓ کے اقوال و آثار کا اچھا خاصہ ذخیرہ قلم بند ہو گیا اور جس کی وجہ سے یہ حقیقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابھر کر نظر و بصر کے سامنے آگئی کہ دوسری صدی ہجری تک مدینتہ الرسول میں کم از کم مذہب و دین کی عملی شکل کیا تھی، صحابہ و تابعین کی عبادات کا انداز کن خصوصیات کا حامل تھا، زکوٰۃ اور صدقات کے مسائل کن تفاصیل و فروع کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھے، نکاح و طلاق کے جھگڑے کیوں کر طے ہوتے تھے اور تجارت و کاروبار کی پیچیدگیوں کو کس طرح حل کیا جاتا تھا۔

## امام شافعی:

فقہ و اجتہاد کے تیسرے عظیم الشان ستون امام شافعی ہیں۔ ۱۵۰ھ کے لگ بھگ عسقلان میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب جھگڑا یہ پیدا ہوا کہ یہ قرشی تھے یا نہیں؟ جرجانی حنفی نے ازراہ تعصب انھیں موالی میں شمار کیا ہے، مگر علم الانساب کے ماہرین انھیں خالص اور نتھرا ہوا

قرشی قرار دیتے ہیں۔ ابتدا ہی میں والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے' اس لیے والدہ انھیں مکہ مکرمہ لے آئیں۔ یہاں آنے سے انھیں علماے حدیث کے درس میں بیٹھنے کے مواقع ملے اور انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مزید براں عربیت کا ذوق انھیں شہر کی گھما گھمیوں سے نکال کر اکثر بنی ہذیل کے قبائل میں لے جاتا' جہاں یہ ان سے لغت و شعر کے نوادر سنتے' لسان و ادب کے لطائف سے بہرہ مند ہوتے اور فصاحت و بلاغت کے سرچشموں سے براہ راست فہم و ذوق کے فطری تقاضوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ و حدیث میں تو یہ امام تھے ہی' ادب و شعر میں بھی ان کی امامت کا لوہا مانا گیا۔ چناں چہ اصمعی ایسے ادیب کو بھی جب شعرا بنی ہذیل اور ان سے تعلق رکھنے والے قبائل کے کلام کی جستجو ہوتی تو انھیں حضرت امام ہی کے در دولت پر حاضری دینا پڑی۔

لغت اور ادب میں ان کے کچھ تفردات بھی ہیں مثلاً:

"قرأن کو ہمیشہ قران پڑھتے تھے لفظ "ابو" کو نصبی و جری دونوں حالتوں میں ابو واؤ کے ساتھ ہی لکھتے تھے۔ اسی طرح مفتی کی جمع ان کے ہاں "مفتیین" بہ اثبات یائین بھی آئی ہیں۔

بحیثیت مجموعی ان کا انداز بیان سہل ممتنع اور فصیح و بلیغ ہے اور ان خصوصیات کا بہ درجہ اتم حامل ہے جو قرشیت کا لازمی تقاضہ ہے۔

ان کے شیوخ میں امام مالک اور امام محمد بن حسن (صاحب ابی حنیفہ رحمہ اللہ) کے اسماے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب تک یہ مدینہ میں رہے سنت و حدیث کے اس ریاض سے جیب و داماں کو سجاتے رہے کہ جسے امام مالک کے دست اشتیاق نے ترتیب دیا تھا' اور جب سواد عراق میں قیام پذیر ہونے کا موقع ملا تو فقہ و قیاس کی ان رنگینیوں سے قباے علم کو آراستہ کرتے رہے کہ جنھیں امام محمد بن حسن کے ذوق اجتہاد نے جنم دیا تھا۔

حدیث میں ان کا مرتبہ یہ تھا کہ اکابر اہل مکہ انھیں ناصر الحدیث کے پر فخار لقب سے پکارتے تھے اور فہم حدیث میں ان کا یہ درجہ تھا کہ امام احمد بن حنبل ایسے عالی مرتبت امام کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بن پڑا کہ:

لولا الشافعی ماعرفنا فقه الحدیث

(اگر شافعی نہ ہوتے تو ہم میں حدیث کی سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو سکتی۔)

عمر کا آخری حصہ مصر میں بسر ہوا اور یہیں دفن بھی ہوئے۔ اصول فقہ کی ترتیب و وضاحت میں ان کا کیا مقام تھا؟ اس کی ایک جھلک فخرالدین رازی کے اس اعتراف میں دیکھیے۔

**كانوا قبل الشافعي يتكلمون في مسائل اصول الفقه ويستدلون ويعترضون۔ ولكن ما كان لهم قانون كلي مرجوع اليه في معرفة دلائل الشرعية وفي كيفية معارضتها وترجيحا تها فاستنبط الشافعي علم اصول الفقه ووضع للخلق قانونا كليا يرجع اليه في معرفة مراتب ادلة الشرع فثبت ان نسبة الشافعي الى علم الشرع كنسبة ارسطا طاليس الى علم العقل۔**

(شافعی سے پہلے اگرچہ لوگ اصول فقہ کے مسائل میں بات چیت کرتے تھے اور اعتراض و استدلال سے بھی کام لیتے تھے۔ مگر ان کے پاس کوئی ایسا قانون کلی نہیں تھا کہ جس کی طرف رجوع کیا جا سکے اور جس سے معلوم کیا جا سکے کہ دلائل شریعت میں ترجیح و فوقیت کس کو حاصل ہے۔ شافعی نے پہلی دفعہ اصول فقہ میں ایسے پیمانے وضع کیے اور ایسے قانون کلی کی نشان دہی کی کہ جس کی رو سے ادلہ شرعیہ کے مراتب صحت کی ٹھیک تعیین ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شافعی کا علوم شریعت میں وہی درجہ ہے جو معقولات میں ارسطو کا ہے)

امام شافعی نے اگرچہ امام مالک اور امام محمد بن الحسن دونوں سے یکساں استفادہ کیا ہے اور حدیث و فقہ کی باریکیوں کو دونوں کے نقطہ نظر سے جانا بوجھا، تاہم ان کی انفرادیت اور ان کی تحقیق و تفحص نے اپنے لیے دونوں سے الگ راہ تجویز کی، جس میں دونوں کی خوبیوں کا انعکاس تو پایا جاتا ہے، مگر دونوں میں جو کمزوریاں اور نقائص ہیں ان کی جھلک کہیں نہیں، بلکہ زیادہ واضح تر اسلوب بیان میں یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے دونوں کے انداز فکر پر ایک گہری اور تنقیدی نظر ڈالی اور دیکھا کہ نہ تو امام مالک کا یہ طرز عمل درست ہے کہ صحابہ کے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث کو بھی چھوڑ دیا جائے اور نہ اہل عراق کے اس تشدد کے لیے کوئی وجہ جواز ہے کہ خبر مشہور کے سوا کسی حدیث کی حجیت و استناد کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح قیاس و رائے کے پیمانوں میں بھی ایک طرف تو انھیں ایسی پابندیاں نظر آئیں کہ جن سے مختلف النوع مسائل کو سلجھانا مشکل ہو گیا اور دوسری طرف ایسی آسانی اور یسر دکھائی دیا کہ جس کی وجہ سے متعدد احادیث سے محرومی گوارا کرنا پڑتی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر انھوں نے حزم و احتیاط اور توسط و اعتدال کا جچا تلا راستہ پسند کیا اور کہا:

**الاصل قرآن و سنة فان لم يكن فقياس عليها واذا اتصل الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وصح الاسناد منه فهو سنة والاجماع اكبر من الخبر المفرد و الحديث علىٰ ظاهره واذا احتمل المعاني فما اشبه منها ظاهره اولاها به واذا تكافئت الاحاديث فاصحها اسناداً اولاها وليس المنقطع بشيٍ ماعدا منقطع ابن المسيب ولا يقاس اصل على اصل ولا يقال للاصل لم و كيف وانما يقال للفرع لِمَ فاذا صح قياسه على الاصل صح و قامت به الحجة۔**

(مسائل میں اصل شے قرآن و سنت ہے، اور اگر ان دونوں میں واضح رہنمائی نہ پائی جائے تو پھر قیاس کا درجہ ہے، اور حدیث جب صحت اسناد کے متصلاً آنحضرت سے ثابت ہو جائے، تو اسے سنت ہی قرار دینا چاہیے۔ اجماع کی حیثیت بہ ہرحال خبر مفرد سے زیادہ اہم ہے۔ حدیث کو اس کے ظاہر معنی پر محمول کرنا چاہیے اگر کوئی حدیث مختلف معانی پر محتمل ہو تو اس معنی کو ترجیح دی جائے گی جو ظاہر سے زیادہ قریب تر ہو۔ اگر ایک ہی موضوع سے متعلق متعدد حدیثیں مروی ہوں تو ان میں قابل قبول وہ ہو گی جو سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہو۔ منقطعات کی کوئی حیثیت نہیں، ہاں ابن المسیب کے منقطعات البتہ درخور اعتنا ہیں۔ اصل کو اصل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے، ہاں فرع کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اگر قیاس اصل کے مطابق صحیح ہو، تو درست ہو گا اور حجت بھی سمجھا جائے گا۔)

امام شافعی کے تلامذہ میں، زعفرانی، کرابیسی، ابوثور، بویطی، مزنی اور الربیع المرادی بجائے خود

مشاہیر میں سے ہیں۔

آثار قلم میں سے جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں کتاب الام اور الرسالۃ دو اہم شاہ کار ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام کی نظر احادیث کے بارے میں کس درجہ وسعت اور عمق لیے ہوئے ہے۔ نیز تشریح قرآن کے سلسلے میں یہ سنت کو کتنا ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان دونوں کتابوں میں حضرت امام کے ذوق اجتہاد، ملکہ عربیت اور قوت بحث و جدل کی بہترین تصویر دکھائی دیتی ہے۔

## امام احمد بن حنبل:

پورا نام احمد بن حنبل ہے۔ ۱۶۴ھ میں بغداد کو شرف تولد بخشا، طلب حدیث میں تگ و تاز کا دائرہ بہت وسیع تھا، چناں چہ اس وقت کا کوئی اہم علمی مرکز ایسا نہ تھا جہاں یہ پہنچے نہ ہوں۔ کوفے کو انھوں نے شرف قدوم سے نوازا، بصرے میں انھوں نے اقامت اختیار کی اور مکہ و مدینہ میں انھوں نے کسب فیض کیا۔ یہی نہیں، یمن و جزیرہ ایسے مقامات تک کے اساتذہ و شیوخ کی خدمت میں انھوں نے حاضری دی۔

مشائخ و اساتذہ میں امام شافعی، یزید بن سعید بن قطان اور سفیان بن عیینہ کے نام سرفہرست ہیں۔ تلامذہ کے حلقے میں امام بخاری، امام مسلم، ابو ذرعہ اور ابو داؤد ایسے نامور محدثین شامل ہیں۔

ان کا رجحان فقہ سے زیادہ حدیث کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبری نے انھیں زمر فقہا میں شمار نہیں کیا۔ ابن قتیبہ نے بھی المعارف میں فقہا کے ضمن میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح الانتقاع کے مصنف شہیر ابن عبدالبر نے فقہ و قیاس کی وسعتوں کو صرف ائمہ ثلاثہ ہی تک محدود رکھا ہے، امام احمد بن حنبل کا نام نہیں لیا۔ ان کے بارے میں دراصل لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کا شمار بجائے فقہا کے محدثین میں ہونا چاہیے، کیوں کہ انھوں نے زیادہ تر اپنے مدرسہ فکر کی بنیاد احادیث ہی پر استوار کی ہے اور قیاس سے صرف اس وقت استفادہ کیا ہے جب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ چناں چہ حسب ذیل پانچ اصول تھے جن کی روشنی میں یہ مسائل کی تشریح کرتے تھے۔

۱۔ اگر کتاب و سنت میں کسی نص کا پتا چل جاتا تو پھر صحابہ کے اقوال و اجتہادات کی پروا

نہ کرتے۔

۲۔ اگر صحابہ کا ایسا فتویٰ مل جاتا کہ جس کا کوئی مخالف معلوم نہ ہو تو اسے بلا تامل قبول کر لیتے، مگر اسے اجماع پر محمول نہ کرتے بلکہ از راہ احتیاط صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتے:

## لا اعلم شیئًا یدفعہ

*”اس کی تردید میں کوئی قول مجھے معلوم نہیں۔“*

۳۔ صحابہ میں اختلاف کی صورت میں اس قول کو ترجیح دیتے جو کتاب و سنت سے قریب تر ہوتا۔

۴۔ مرسل اور حدیث ضعیف کو بھی حجت گردانتے، ان کے مقابلے میں قیاس درخور اعتنا نہ سمجھتے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ حدیث ضعیف سے مراد حدیث باطل نہیں، بلکہ وہ حدیث ہے جو صحیح نہ ہو۔

۵۔ ہدایت و رہنمائی کی ان چاروں صورتوں کی عدم موجودگی میں بہ درجہ مجبوری قیاس سے کام لیتے۔

اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حدیث و سنت کے معاملے میں حد درجہ محتاط تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ فکر و عمل کے کسی مرحلے میں بھی اپنی رائے کو کوئی اہمیت دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادلہ میں قیاس کا درجہ ان کے نزدیک سب سے آخر میں ہے اور وہ بھی اس وقت جب شدید ضرورت اس کی متقاضی ہو، ورنہ عموماً ایسے مسائل میں جن میں انھیں کوئی واضح روشنی نہ محسوس ہوتی ہو، سکوت سے کام لیتے اور یہ کہہ کر جواب سے پہلو تہی فرماتے:

## لا ادری

”میں نہیں جانتا“

اللہ! اللہ!! اس لا ادری میں بھی احساس ذمہ داری کی کتنی بڑی مقدار پنہاں ہے، اس میں کس درجہ احتیاط اور تورع کے تقاضے پائے جاتے ہیں اور کس درجہ تقویٰ و خشیت الٰہی نمایاں ہے، بلکہ یوں کہیے کہ اس میں کتنے بڑے علم کا اظہار ہے۔ اس لیے کہ سچا علم یہ نہیں کہ ایک انسان کیا جانتا ہے اور اس کے فکر و اندیشہ کے آفاق کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہیں، سچا علم

یہ ہے کہ انسان اپنے حدودِ جہل سے آشنا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کے ادراک و معرفت کی صلاحیتیں کن امور کو پالینے میں ناکام رہیں اور مسائل کے وہ گوشے کون سے ہیں جن تک اس کی رسائی نہیں ہو پائی۔ گویا عالم ہونا آسان ہے اور احساسِ جہل دشوار ہے۔!

امام کا یہی وہ کردار ہے، جو انھیں دوسروں سے امتیاز بخشتا ہے۔ یہ فتویٰ دینے میں مستعجل نہ تھے، مگر جب کتاب و سنت کی رو سے کسی رائے پر جم جاتے تو پھر اس میں وہ استقلال ہوتا کہ دنیا کی قاہر حکومتیں بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرسکتی تھیں۔ چناں چہ "خلقِ قرآن" کے مسئلے میں انھوں نے جس شجاعت، جس عزیمت اور ہمت کا ثبوت دیا ہے، وہ ان کے کردار و عمل کے اسی گوشے کی طرف اشارہ کناں ہے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن میں مرتسم رہنا چاہیے کہ حضرت امام نے جس مسئلے کے لیے جان کو جوکھوں میں ڈالا، آزمائش و ابتلا کی اذیتیں برداشت کیں، وہ صرف اتنی سی بات نہیں تھی کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں۔

ہمارے نزدیک اس سوال کی حیثیت تو محض ایک علامت کی تھی، جس میں اختلاف رائے کی قطعی گنجائش ہے۔ اصل بحث یہ تھی کہ سیدھے سادے عقائد کے بجائے معتزلہ نے جو بحث و نظر کا پیچیدہ اور عقلی انداز اختیار کیا تھا اور اس سے وہ جو نتائج اخذ کرتے تھے، انھیں قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور عقلِ فضول نے ایمانیات کے باب میں جس اسلوب سے نئی نئی بحثوں کو چھیڑ دیا تھا اور جس ڈھب اور نہج سے عجیب عجیب فتنوں کو ابھار دیا تھا، اس کی روک تھام کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض بات جس نے امام کو میدان میں اترنے پر مجبور کردیا تھا، یہ تھی کہ معتزلہ نے بجائے اس کے کہ بحث کو فکر و اندیشہ کی استواریوں کی بنا پر طے کرتے، یہ چاہا کہ:
اسے حکومت کے بل بوتے پر منوایا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوششیں صراحتاً اشتعال انگیز تھیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یونانی علوم کی اشاعت و فروغ سے ذہن قدرتی طور پر فلسفیانہ ذوق فہم کو پسند کرنے لگے تھے، ہم اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ معتزلہ کا اپنے دور کے عقلی مزاج سے متاثر ہونا بالکل قدرتی امر تھا، اسی طرح ہمیں اس حقیقت کے مان لینے میں بھی قطعی تامل نہیں کہ اسلام کے دفاع کے سلسلے میں ان کی مساعی نہایت درجہ قابلِ قدر تھیں۔ لیکن جس انداز

سے انھوں نے مسئلہ صفات کو پیش کیا‘ اسے کسی صورت میں بھی معقول قرار نہیں دیا جاسکتا‘ کیوں کہ اس سے منطقی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو صفات سے بالکل عاری فرض کیا جائے اور اس میں سے ان تمام خوبیوں کو چھین لیا جائے جو ہمارے لیے بہترین نمونہ ہو سکتی ہیں۔ خلق قرآن کا مسئلہ صفات ہی کی ایک شاخ تھا اور اسے بھی معتزلہ نے غلط اور گمراہ کن انداز میں پیش کیا‘ اس لیے کہ اس بحث میں جو نکتہ زیادہ نکھار کر پیش کرنے کا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں‘ بلکہ اس کے برعکس یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم اور معارف ہدایت کو بندوں تک کیوں کر منتقل کرتا ہے‘ یعنی وحی کی فطرت کیا ہے؟ اور یہ کہ وحی کے مختلف مدارج اور نوعیتوں کا حکم ایک ہی ہے یا اختلاف ودرجہ سے حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے؟

اگر بحث کو ان خطوط پر چلایا جاتا تو معتزلہ کی روش بلاشبہ زیادہ معقول اور قابل قبول ہوتی۔ مگر انھوں نے کج بحثی سے کام لیا اور اس سے ایسے ایسے لوازم اخذ کیے کہ جنھیں مان لینے سے کتاب اللہ کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

زیادہ افسوس ناک اور شرم ناک امر یہ تھا کہ انھوں نے ایک خالص عقلی وکلامی بحث کو بزور شمشیر منوانا چاہا‘ امام احمد بن حنبل نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور محسوس کیا کہ اس وقت سوال صرف ایک مسئلے کا نہیں بلکہ ایک برخود غلط فکری رجحان کا ہے‘ جو اپنے آغوش میں بوقلموں گمراہیاں لیے ہوئے ہے‘ ایک بے ہودہ اصول کی تبلیغ واشاعت کا ہے کہ جس سے رنگا رنگ فتنوں کے دروازے کھل سکتے ہیں اور ایک ایسے حفاظتی اور دفاعی قدم کا ہے کہ اگر صحیح سمتوں کی طرف نہ اٹھے تو طرح طرح کے فتنے ابھر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر مسائل کو نمٹانے کا یہ غیر منطقی طریق تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ حق ہمیشہ غالب رہے گا۔

یہ تھے وہ سوالات جنھوں نے امام احمد بن حنبل کو اس بے مثال قربانی پر مجبور کیا۔

## امام اوزاعی:

پورا نام عبد الرحمان عمرو بن محمد الاوزاعی ہے۔ بعلبک میں قریب قریب ۸۸ھ کے ولادت ہوئی‘ زہری وعطا ایسے اعلام سنت سے استفادہ کیا اور سفیان ثوری‘ عبد اللہ بن المبارک ایسے جلیل القدر حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ سفیان ثوری ان کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ذی طویٰ میں ان کی تشریف آوری ہوئی تو یہ خیر مقدم کے لیے یہاں پہنچے

اور جس اونٹ پر یہ سوار تھے' اسے قطار میں سے نکال لائے اور اس کی گردن کے نیچے ازراہ احترام اپنا سر رکھ دیا۔

عمر کا زیادہ حصہ بیروت میں بسر ہوا اور یہی مقام ان کے فیوض علم کا مرکز و چشمہ قرار پایا' جس سے ہزاروں لوگوں نے اپنی پیاس بجھائی' انھوں نے اگرچہ کوئی مستقل کتاب یادگار نہیں چھوڑی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خدا جانے ان کی علمی کوششیں کیوں دست برد زمانہ کا شکار ہو گئیں۔۔۔ تاہم ان کے بعض فقہی فتوے' آرا اور ادلہ کا ذکر کتب فقہ میں اکثر آتا ہے' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر مسائل میں کس درجہ گہری اور معروضیت (Objectivity) لیے ہوئے تھی۔ یہ جب تک شام میں رہے انہی کا طوطی بولتا رہا اور کسی شخص کو بھی جرأت نہیں ہوئی کہ ان کی شہرت و پذیرائی کا مقابلہ کر سکے' یہی وجہ ہے کہ انھیں امام اہل الشام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ان کی موت بہت دردناک حالات میں واقع ہوئی۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بیان کیا ہے کہ ایک دن یہ غسل کے ارادے سے بیروت کے کسی حمام میں داخل ہوئے' وہاں نہانے میں اتنی دیر ہوئی کہ حمام کے مالک نے سمجھا شاید امام غسل سے فراغت حاصل کر کے جا چکے ہیں' اس نے اس خیال سے دروازہ بند کر دیا اور گھر کو روانہ ہوا۔ ادھر امام حبس اور گھٹن کی تاب نہ لا کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

حمام کا مالک جب لوٹ کر آیا تو اسے یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ اس کی غفلت سے اتنا بڑا سانحہ رونما ہو گیا۔

ابن عساکر نے ان کی موت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> "علم و فضل کا یہ پیکر' دست راست دائیں رخسار کے نیچے دیے' قبلہ رو لیٹا ہوا تھا۔"

یعنی عین اس حالت میں بھی کہ جب احساسات ختم ہو رہے تھے' جسم و جان کا باہمی رشتہ منقطع ہونے کو تھا' اتنا شعور باقی تھا کہ جان نہایت اطمینان سے جان آفرین کے سپرد کرنا چاہیے اور چہرے کا رخ ان آخری لمحوں میں ٹھیک اسی طرح مرتکز رہنا چاہیے کہ جس طرف زندگی کی تگ و دو ہمیشہ مرتکز رہی ہے۔

ان کے مدونہ فکر کی استواریاں فقہ میں اس درجہ نمایاں ہیں کہ مغرب کے بعض مستشرقین

کو اس پر رومی قانون (Roman Law) کے چربے کا شبہ ہوا، اور انہی کی فقہ پر کیا موقوف ہے، فقہ اسلامی پر گولڈ زہیر نے تو عام طور پر یہی اعتراض کیا ہے کہ یہ رومی آئین کی نقالی ہے، مگر یہ قطعی صحیح نہیں۔ مستشرقین کے طرز استدلال میں ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ اس نوع کے نتائج قائم کرتے وقت صرف یہی دیکھتے ہیں کہ جس قانون کو وہ اصل قرار دے رہے ہیں، اس میں اور مفروضہ نقل میں یکسانیوں (Similarity) کی کیا نوعیت ہے، مگر اس اہم اور فیصلہ کن اصول کو بھول جاتے ہیں کہ دونوں کے پس منظر، دونوں کے مآخذ اور دونوں کے طریق استدلال میں کتنا بڑا فرق ہے۔

جہاں رومی قانون کی بنیاد قدیم نیم مذہبی اور مقامی رسم و رواج پر قائم ہے، وہاں اسلامی فقہ کی اساس تمام تر وحی الٰہی پر مبنی ہے اور دونوں کے طریق ارتقا میں بین فرق ہے، دونوں کی نشوونما (Growth) دو مختلف قسم کی آب و ہوا میں ہوئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی فقہ کا آغاز جن حالات میں ہوا، جن ضرورتوں سے ہوا اور جس فضا میں اس نے ترقی و اتمام کی منزلیں طیں کیئں، وہ اس پس منظر سے بالکل جدا ہے جو رومی قانون کو میسر آیا۔ صرف جزوی یکسانیاں ہی تو اس لائق نہیں کہ ان کی بنا پر اوزاعی کے مدرسۂ فکر کو رومی تقنین کا چربہ قرار دیا جائے، اس لیے کہ ہر قانون میں کچھ چیزیں بہ ہر حال مشترک و مماثل ہوتی ہیں۔

نقطۂ نظر کی یہی وہ غلطی تھی جس کے بل پر بعض مستشرقین نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ (معاذ اللہ) قرآن بھی محض تورات و تالمود ہی کی عکاسی کا دوسرا نام ہے۔

چناں چہ "یہودیت اور اسلام" کے مصنف شہیر مسٹر روز نتھال (Rosenthal) نے تو کھلے بندوں میں یہ لکھا ہے کہ قرآن میں اپنا کچھ بھی نہیں، بلکہ یہ ساری حکمت و دانش، یہ تمام قصے اور احوال اور انبیا کی تعلیمات جو اس میں جابجا مذکور ہیں، پہلی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

لطف یہ ہے کہ اتنے بڑے بول کی دلیل کیا ہے؟ یہی تماثلات یا ذکر و بیان کی یکسانیاں!

ان لال بھکڑوں کو کون سمجھائے کہ قرآن کا سرے سے یہ دعویٰ ہی نہیں کہ وہ اپنے مضامین اور محتویات کے اعتبار سے بالکل ہی نئی کتاب ہے اور اس کی کوئی بات بھی پہلے صحیفوں میں مذکور نہیں۔ اس کے برعکس اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ تمام مذہبی و دینی صداقتوں کا مجموعہ ہے، تمام انسانی ممکنات دانش و فکر کا نچوڑ ہے اور پوری کائنات کے لیے خدا کا وہ آخری پیغام ہے کہ جس

کے بعد کوئی نیا پیغام آنے والا نہیں۔

دراصل مغرب پر دو دور گزرے ہیں۔

ایک دور وہ تھا جس میں یہ مفتوح تھے، مغلوب تھے اور ذہنی و فکری اعتبار سے پست تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی تہذیب و تمدن کا آفتاب عالم تاب نصف النہار پر تھا۔

دوسرا دور وہ ہے جو اسلامی زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں یورپ نے بیدار ہونا شروع کیا اس دور کا آغاز چوں کہ تعصبات اور صلیبی لڑائیوں سے ہوا اس لیے مابعد کے مغربی مصنفین کی تحریروں میں اس دور کی تلخیاں کچھ اس انداز سے کھل مل گئیں اور اس طرح ان سے ان کا دائرۂ فکر و نظر مسموم ہوا کہ اب تک اس کے اثرات زائل نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و فن کا کوئی میدان یا کوئی موضوع ہو، یہ حضرات مجبور ہیں کہ اس میں اپنی مغلوبیت کا اظہار کر کے رہیں اور غیر شعوری طور پر منتقمانہ ذہنیت کا ثبوت دیں۔

بہ ہر حال یہ ہیں وہ آئمہ فقہ جن کی مساعی اور فقہی کوششوں سے حفاظت حدیث کا سائنٹیفک اہتمام ہوا۔ ظاہر ہے ان کی کوششیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، پہلی صدی ہجری کے آخر سے لے کر تیسری صدی کے اوائل تک پھیلی ہوئی ہیں، اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں کہ اسلامی فقہ کو مدون ہونا تھا، کیوں کہ یہ عہد ٹھیک وہ عہد ہے جس میں اسلامی تہذیب نئے نئے مسائل سے دوچار ہوا اور فقہا و محدثین کے سامنے معاملات کی نسبتاً پیچیدہ اور توضیح طلب صورتیں ابھریں، ان کی علمی کوشش سے فقہ کی تدوین تو بہ ہر حال ہوئی، نفس اسلام کو بھی ان سے یہ گراں قدر فائدہ پہنچا کہ اس کا آئینی ڈھانچا، اس کے ادلہ احکام اور وہ روح ہمیشہ ہمیشہ کے محفوظ ہو گئی جس نے اس کے تہذیبی دبستان کو معطر کر رکھا ہے۔

## حجیت حدیث کے سلسلے میں ایک آخری سوال:

حجیت حدیث کی جاں فزا بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس سوال کا جواب دینا نہایت ضروری ہے کہ اگر حدیث شریعت کی ناگزیر اساس ہوتی تو اسے حضور نے لکھوا نہ دیا ہوتا؟

اس سوال کے تفصیلی جواب سے عہدہ برآ ہونے سے پیشتر اس کے اندر جو منطقی پیچ یا سفسطہ پنہاں ہے، پہلی ہی فرصت میں اس پر نظر ڈال لینا زیادہ مناسب ہو گا۔ سوال کا منشا غالباً یہ ہے کہ پیغمبر کا قول و فعل اور سیرت و عمل بجائے خود حجت نہیں، بلکہ اس میں حجت و استقلال کی

صلاحیتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں، جب یہ پیغمبر کے ایما سے ضبط تحریر میں آجائیں۔ یعنی پیغمبر اس وقت تک قابل اطاعت اور لائق پیروی نہیں اور نہ اس کی دینی تشریح و تعبیر مستند و معتبر ہے جب تک کہ وہ ان سب باتوں کو قلم بند کرنے کا حکم نہ دے۔

نتیجتاً اگر یہ نقطہ نظر صحیح ہے تو ان ہزاروں انبیا کے بارے میں کیا کہا جائے گا جنھیں سرے سے کسی "کتاب" سے بہرہ مند ہی نہیں کیا گیا، بلکہ جن کی نبوت کا دارومدار صرف ان کے اونچے کردار اور مصلحانہ عمل ہی پر استوار ہے اور جو صرف منذرین و مبشرین کے زمرے میں شمار ہونے کے لائق ہیں، کیا انھیں نبی تسلیم نہیں کیا جائے گا؟ یا مرقوم وحی کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حجیت و استناد سے انکار کیا جائے گا؟

اس طرح کے گمراہ کن سوالات قلب و ذہن میں دراصل خلش اس وقت پیدا کرتے ہیں جب سوچنے کا انداز صحیح نہ ہو، فکر جادۂ مستقیم سے ہٹ جائے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے ان ذرائع کو انسان چھوڑ دے، جنھیں ترتیب و وضع کے اعتبار سے صحیح ذرائع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا قرآن نے پیغمبر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ پیغمبر کی یہ تعلیمات، اس کا یہ عمل اور تشریحات تاریخ کے صفحات میں پوری طرح محفوظ ہیں یا دست برد زمانہ کا شکار ہو گئیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس مفروضے کی بنا پر کیا ہمارے ہاں فی الواقع کوئی تہذیب پروان چڑھی؟ کسی تمدن نے حقیقتاً انگڑائی لی اور زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں نے نمایاں طور پر کوئی فقہی اور آئینی شکل اختیار کی یا نہیں؟ جواب اگر اثبات میں ہے تو بتایا جائے کہ اس کے بعد اس انداز کے شبہات میں کیا وزن و ثقل رہ جاتا ہے؟

صحیح طریق سے سوچیے گا تو لامحالہ آپ صحیح نتائج تک پہنچیں گے۔۔۔ اور اگر فکر و فہم کے مغالطوں کو رہنما ٹھہرائیں گے تو حقیقت تک رسائی ہو چکی۔۔۔! ہماری دیانت دارانہ رائے ہے کہ مذکورہ بالا سوال قطعی غلط سوال ہے، اور زیر بحث مسئلے کو حل کرنے میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اگر اس کی روشنی میں تحقیق و تفحص کے قدم آگے بڑھائے جائیں تو قطعی غلط نتائج مترتب ہوں گے۔ دیوار کو اگر سیدھا رکھنا مقصود ہے تو پہلی اینٹ بہت احتیاط سے رکھنی چاہیے۔

مگر کیا سوال کو گمراہ کن قرار دے کر چھوڑ دینا چاہیے؟ نہیں! ہم اس کے حق میں نہیں۔ بعض لوگ کچھ طبعی کمزوریوں کی بنا پر صاف‘ واضح اور روشن شاہراہوں پر چلنے کے عادی نہیں ہوتے‘ ان کے نزدیک پگڈنڈیوں اور غیر معروف راستوں سے ہو کر منزل تک پہنچنا زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ یہ ان کی مجبوری ہے‘ جس کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔ یوں بھی صحیح رفاقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے میں ان کا بہ ہر حال ساتھ دیا جائے۔

اس سوال کے جواب میں ایک سیدھا اور براہ راست سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہے؟

## کیا پیغمبر کی پوری زندگی کو قید تحریر میں لایا جاسکتا ہے؟

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص تیئس برس تک ایک مکمل اور جامع قائدانہ زندگی بسر کرے اور پھر اس زندگی کے تمام گوشوں کو معرض تحریر میں بھی لے آئے اور زندگی بھی ایسی بھرپور ہو جس میں ارشادات و اقوال کی نکتہ آفرینیاں بھی ہوں اور عمل و کردار کی حکمتیں بھی۔

اندازہ لگایئے کہ تیئس سال کے اس پھیلاؤ کو جس کی بوقلمونیوں کا احاطہ ہی نہیں کیا جاسکتا اور فکر و عمل کی ان عظیم وسعتوں کو جو پیغمبر کی نفسیات تک کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں‘ کوئی شخص رقم کر سکتا ہے؟ کوئی شخص لکھ سکتا ہے اور الفاظ و حروف کی زنجیروں سے جکڑ سکتا ہے؟ زندگی ایک بہتا دریا ہے‘ جس کی ایک ایک موج اپنے اندر ایک دفتر معنی پنہاں رکھتی ہے۔ اگر پورے گلستان کی شمیم آرائیوں اور نزہت آفرینیوں کو ایک گل دستے میں منتقل کیا جاسکتا ہے تو بلاشبہ واردات نبوت کو بھی قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ اور پھر پیغمبر سے یہ مطالبہ کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ وہ ہدایت و رہنمائی کے اعلیٰ فرائض بھی انجام دے‘ ایک شان دار مگر قدرتی و طبعی زندگی بھی بسر کرے اور پھر زندگی کے ایک ایک گوشے اور موڑ کو الفاظ و حروف کے آئینوں میں سجاتا بھی چلا جائے۔ ظاہر ہے یہ کام پیغمبر کا نہیں‘ اس کے ماننے والوں کا ہے کہ اس کے بارے میں اپنے تاثرات قائم کریں اور انھیں آئندہ نسلوں تک پہنچائیں‘ ورنہ پیغمبر کی زندگی بالکل مصنوعی اور بناوٹی ہو کر رہ جائے گی‘ اس کی روانیاں ختم ہو جائیں گی اور اس کے فکر و کردار کا انداز قطعی بے ساختہ اور قدرتی نہیں رہے گا‘ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر کام اس بنا پر انجام دے گا کہ اسے اپنے عمل کو لکھوانا اور قلم بند کرانا بھی ہے۔ علاوہ اس کے کہ اس سے پیغمبر کی زندگی میں تصنع کے

پیدا ہو جانے کا احتمال ہے، یہ خطرہ بھی ہے کہ نبوت کی وسعتیں افسوس ناک حد تک سمٹاؤ اختیار کر لیں گی۔

احادیث و روایات کے سلسلے میں اہل شوق کو پہلے سے شکوہ ہے کہ اس سے اگرچہ تمام دینی تقاضے بہ احسن وجوہ پورے ہوتے ہیں، تاہم یہ ذخیرہ اپنی معتدبہ ضخامت کے باوجود اس درجہ مختصر ہے کہ اس میں قامت یار کی تمام رعنائیاں منعکس نہیں ہو پائیں اور بہت سی ایسی جھلکیاں نظر و بصر کے سامنے نہیں آسکیں جن کا تعلق کرشمہ و ادائے نبوت سے ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ احادیث میں منتقل ہوا ہے وہ زیادہ سے زیادہ گفتار و کردار کا ایک سادہ نقشہ ہی تو ہے۔ یعنی آپ نے کیا فرمایا؟ اور کیا کیا؟ مگر عشاق کے لیے یہ وضاحت کہاں تک باعث تسکین ہو سکتی ہے؟ وہ تو دیکھنا چاہتے ہیں کہ محبوب نے کس طرح کیا اور کس انداز اور روح پرور طریق سے کون سا کام انجام دیا؟ گویا ان کے نزدیک کیف گفتار اور کیف عمل کہیں زیادہ لائق اعتنا اور ایمان افروز ہے۔

اب اگر اس پر تحریر و تقریر کی قدغن عائد کر دی جائے تو انوار نبوت کا یہ حلقہ اور بھی مختصر ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہر ہر بات لکھوا ہی دی جاتی تو اس سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوتا کہ اسلام جس میں حد درجہ کی لچک اور وسعت پائی جاتی ہے، ایک طرح کی تنگ دامانی (Rigidity) کا شکار ہو جاتا اور امت کے مجتہدین کے لیے فکر و اجتہاد کی تازہ کاریوں کی کوئی گنجائش نہ رہتی۔

ان حقائق کے پہلو بہ پہلو تحریر کا مطالبہ کرنے والوں کو اس چیز پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اسلام امیت کے ایسے دور میں آیا ہے کہ جس میں لکھنے والوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں ایسے بڑے پیمانے پر تحریر و تسوید کا منصوبہ کیوں کر پورا کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر کے ایک ایک قول و عمل کو ضبط تحریر میں لے آیا جائے؟

## دعوت کے ابعاد ثلاثہ:

قرآن حکیم نے آنحضرت ﷺ کو داعی الی اللہ یا خدا کی طرف بلانے والے کے اعزاز سے نوازا ہے۔

دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ (احزاب: ۴۳)

(اور خدا کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن۔)

یہ منصب دعوت جس پر آنحضرت فائز ہیں، کس درجہ اہم ہے اور کن کن لطافتوں کا حامل ہے، اس کا اندازہ اس لفظ کے متضمنات سے ہوتا ہے۔

دعوت تین چیزیں چاہتی ہے۔

۱۔ مشمولات (Contents) کی استواری و معقولیت۔

۲۔ ان کے بارے میں محکم تر ایمان و اذعان۔۔۔ اور

۳۔ شرائط تبلیغ و اشاعت کا استقصا

دعوت اسلامی کن عالی قدر مشمولات کی غماز ہے اور اس میں فکر و دانش کے عوامل کا کتنا حصہ ہے، یہ بحث تو آگے آئے گی، یہاں جو چیز سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا نبی داعی الی اللہ کی حیثیت سے محکم تر ایمان و اذعان کی کیفیتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے اور یہ کہ اس کا انداز تبلیغ و اشاعت دوسروں سے بہ مدارج مختلف ہوتا ہے، تو ہمارے ذہن میں اس کے متعلق کس نوع کی تفصیلات ہوتی ہیں۔

## پیغمبر کا درجہ علم:

بات یہ ہے کہ علم و عرفان کے تین درجے ہیں

پہلا درجہ یہ ہے کہ:

شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جائیں اور دل پر کسی جزوی حقیقت کا انکشاف ہو۔

دوسرے درجے کے یہ معنی ہیں کہ:

حقیقت پوری طرح نکھر کر نظر و بصر کے سامنے آگئی ہے۔

تیسرے درجے کا مطلب یہ ہے کہ:

حقیقت صرف ذہنی و قلبی کیفیت ہی نہیں رہی بلکہ زندگی کا ایک تقاضہ بن گئی ہے اور کردار و سیرت میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ طالب و عارف ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا۔

یہی نہیں، اب اس کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ جو کچھ اس کی چشم بصیرت نے دیکھا ہے اور اس پر جو عملی برکات مترتب ہوئی ہیں اس کی فیض رسانیاں صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہیں، بلکہ اس کے انوار و تجلیات کا دائرہ پھیل کر پوری نوع انسانی کا احاطہ کر لے اور کوئی شخص

بھی اس سے محروم نہ رہے۔ علم و عرفان کا یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے داعی الی اللہ کی دعوت کا آغاز ہوتا ہے:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (تکویر: ۲۴)

(اور وہ مکشوفات غیب کے معاملے میں بخل سے کام لینے والا نہیں۔)

محکم تر ایمان و اذعان کے یہ معنی بھی ہیں کہ پیغمبر علم کی ایسی اونچی سطح سے بولتا ہے کہ جہاں موضوعی علم (Subjective) کے باقیات بالکلیہ ختم ہو جاتے ہیں اور اس کا تعلق براہ راست معروضی (Objective) اور صرف معروضی علم سے قائم ہو جاتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (نجم: ۳،۴)

”ہمارے رسول جب بھی بولتے ہیں ہمیشہ اس وحی الٰہی کی ترجمانی کرتے ہیں جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے، اپنی کوئی بات نہیں کہتے۔“

یعنی پیغمبر کی حیثیت اس صورت میں صرف منزل جاناں کی نشان دہی کر دینے والے شخص کی نہیں رہتی، بلکہ بجائے خود جاناں کی ہو جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا فرمان و عمل اب سند (Authority) کی طرف بلاوا ہی نہیں رہتا بلکہ اپنی جگہ خود بھی سند کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اذہان و ایمان کی استواریوں کا یہ وہ مقام ہے جہاں پیغمبر کی اطاعت ایک بشر، ایک سربراہ اور قائد کے دائرے سے نکل کر اللہ کی اطاعت کے مترادف ہو جاتی ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۸۰)

(جس نے رسول کی فرماں برداری اختیار کی، اس نے گویا اللہ ہی کی فرماں برداری اختیار کی۔)

## شرائط دعوت:

دعوت کی شرائط میں جو چیزیں خصوصیت سے داخل ہیں وہ یہ ہیں کہ داعی جس پیغام کو بنی نوع انسان کے سامنے پیش کر رہا ہے آیا وہ اس کے جملہ تقاضوں سے آگاہ ہے؟ اور ان پر خود بھی عمل پیرا ہے یا یہ کہ اس کی دعوت میں تضاد اور بے عملی رونما ہے؟ اور یہ کہ اس کا انداز ایک عام

مبلغ و واعظ کا انداز ہے جو موقع و محل کی نزاکتوں کو نہیں جانتا' یا اس میں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی شامل ہے۔

اپنی دعوت کے تمام تضمنات سے باخبر ہونا' نبوت کی پہلی اور بنیادی شرط ہے' چناں چہ ایک حکیم اور فلسفی کے افکار و تصورات تناقض میں رونما ہو سکتا ہے' مگر نبوت اپنے آغوش میں تضاد اور تناقض کو کسی طرح بھی گوارا نہیں کرتی۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○ (نساء : ۸۲)

(اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔)

غرض یہ ہے کہ اگر پیغمبر توحید کو پیش کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں کوئی ہدایت اس طرح کی نہیں ہو سکتی کہ جس سے شرک کی بو آتی ہو' اگر عدل و مساوات کو معاشرے کی اساس ٹھہراتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ظلم و عدوان کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں' اگر نیکی اور عمل صالح کی تبلیغ اس کا نصب العین ہے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کے نظام ہدایت میں کہیں بھی برائی کی حمایت کا ادنیٰ پہلو بھی نکلے۔ یعنی اگر پیغمبر توحید کا علم بردار ہے تو عمل کے ہر ہر گوشے میں تقاضۂ توحید ہی کا انعکاس ہونا چاہیے۔ اگر عدل و مساوات کی حمایت و تائید اس کا نصب العین ہے تو اس کی تعلیمات کی رو سے معاشرے کے کسی گروہ کو بھی ظلم و ستم و تعدی کی کسی شکل کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح اگر پیغمبر معاشرے میں نیکی اور صلاح و تقدس کے جذبات پھیلانا چاہتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ پوری انسانی زندگی اخلاق کی صاف ستھری بنیادوں پر استوار ہو اور کہیں بھی ایسا رخنہ نہ پایا جائے جہاں سے برائیاں سر اٹھا سکیں۔

یوں سمجھیے کہ نبوت ایک ایسے قصرِ ہدایت سے تعبیر ہے جس کی در و دیوار اور ایک ایک اینٹ سے اتحادِ مقصد نمایاں ہے۔

دعوت کے جملہ متضمنات سے باخبر ہونے کے یہ معنی بھی ہیں کہ پیغمبر اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے کہ وہ جس کار زار میں اتر رہا ہے وہ پھولوں کی سیج نہیں' میدان وغا ہے' جہاں قدم قدم پر مخالفتوں کے کانٹے اور دشمنی و عناد کے مظاہر ہیں۔ یہاں پورے معاشرے سے لڑائی

اور معاشرے کے تمام سربراہیوں سے جنگ ہے‘ اس لیے کہ اسے ان تمام برائیوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنا ہے کہ جن سے شرف انسانی داغ دار اور کردار و سیرت کی ردائے عظمت تار تار ہے‘ اور ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر ابتلاو آزمائش کی سختیوں کو انگیز کیے سرانجام پانے والا نہیں!

پیغمبر خوب جانتا ہے کہ اس کا کام آسان نہیں بلکہ ایک طرف تو اسے محبت و الفت کے خوابیدہ جذبوں کو بیدار کرنا ہے اور شفتگی و دل نوازی کی ادائے دل فریب سے قلب و ذہن پر قابض ہونا ہے اور دوسری طرف اسی نہج پر اسے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنا‘ دشمنوں سے نمٹنا ہے اور کامیابی و کامرانی کی راہوں کو اپنے عمل و جہاد سے ہموار کرنا ہے۔

یہ دونوں کام اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے بالکل ہی مختلف نتائج کے حامل ہیں۔ اگر ایک محبوبیت اور جذب و کشش کی انتہائی بلندیاں چاہتا ہے تو دوسرا عزیمت و استقامت کے بلند تر نمونوں کا طالب ہے۔ گویا پیغمبر کی زندگی ان دونوں پہلوؤں کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۴)

(اور تو بہترین خلق سے بہرہ مند ہے۔)

شرائط دعوت میں ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ داعی موقع و محل کی مناسبتوں سے بہرہ مند ہو اور اس نکتے سے پوری طرح واقف ہو کہ انسانی اذہان کی سیاحت مختلف ہے۔ کوئی خطابیات سے متاثر ہوتا ہے‘ کوئی منطق سے‘ کسی کو صرف حقائق کی طرف دعوت دینا ہی کافی ہوتا ہے‘ اور کوئی جدل و مناظرے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ مقبولیت و تاثر پذیری کے بھی موسم اور اوقات ہیں۔ کبھی ایسے حالات و اطوار ہوتے ہیں کہ انسان روشن اور قوی تر دلائل و براہین کے سامنے بھی نہیں جھکتا اور کبھی رقت و انفعال کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک کلمۂ حق دل میں گھر کرلیتا ہے اور ایک حرف اصلاح‘ فسق و فجور کی دبیز تہوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ جہاں تک انفرادی اصلاح کا تعلق ہے‘ فکر و ذہن کے اس قدرتی اختلافات کو ملحوظ رکھے اور ہر شخص کو ایسے اسلوب و انداز سے سمجھائے کہ جو اس کی طبیعت کے اقتضا اور نفسیات کے عین مطابق ہو۔

قرآن نے دعوت کے انہی مدارج کی طرف ایک آیت میں بہ صورت انشا اشارہ کیا ہے‘ جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت داعی کی حیثیت سے اس وصف سے بھی متصف ہیں۔ یہ آیت یہ

ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

(اے پیغمبر! لوگوں کو دانش و حکمت موعظہ حسنہ اور بحث و مناظرے کی خوبیوں کے ذریعے اللہ کی طرف بلاؤ۔)

## (۱۹)

# مسئلہ توحید اور وجود باری

### اسلام اور مستقبل:

دعوت اسلامی کے وہ کون ممیزات ہیں جنھوں نے فکر و عمل کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا' جنھوں نے تہذیب و تمدن کے تیز رو قافلوں کو روشنی اور طاقت عطا کی' جنھوں نے انسانی کردار کو چمکایا اور اخلاق و معاشرت کی سطحوں کو رفعت بخشی' جن سے علوم و فنون کی شمعوں نے جلا پائی اور جن کی بدولت انسان پہلی دفعہ ان ہمہ گیر اقدار سے روشناس ہوا جن کو پوری انسانیت کی متاع عزیز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان ممیّزات سے ہم دو مفروضوں کی روشنی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ایک یہ کہ اسلام نے ماضی میں تاریخ انسانی کے کن سنہری ابواب و فصول کی ترتیب میں حصّہ لیا--- اور

دوسرے یہ کہ مستقبل میں اس تہذیبی ورثے سے ہم کس درجہ بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ یا واضح تر لفظوں میں مستقبل کے انسان و معاشرے کو فکر و تصور کی کن کن بلندیوں کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔

مستقبل کا مسئلے ہمارے نزدیک اس لیے اہم ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے اسلامی تعبیر کے کئی گوشے ہنوز تشنہ ہیں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس بحر بے کراں کی متعدد موجوں کو ابھی لعل و گہرا

کھلتا ہے اور انسان کی ثروت علمی میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔ اس زلف دیدہ زیب کے کتنے ہی پیچ و خم ایسے ہیں کہ جنھیں ابھی اور سنورنا اور عقل و ہوش کے تقاضوں کو خیرہ کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک نہ صرف تعبیر و تشریح کا دریا ابھی پایاب نہیں ہوا بلکہ اس میں ایسی ایسی گہرائیاں اور جزیرے ہیں، جن تک ہمیں رسائی حاصل کرنا ہے۔ خصوصیت سے اسلام کا علمی دور اور اجتماعی حصہ تو قطعی از سرنو تشریح کا متقاضی ہے۔

دعوت اسلامی کے ان ممیزات کی وضاحت اسی صورت میں ممکن ہے، جب ہم اس کے مشمولات پر قدرے تفصیل سے اظہار خیال کریں۔ ان مشمولات کو تقسیم و تجزیے کے چار مستقل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ توحید۔

۲۔ رسالت۔

۳۔ آخرت۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور

۴۔ اعمال صالح

آیئے ان میں سے ہر ایک موضوع پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ ان سے ماضی و مستقبل کے دوگونہ تقاضوں پر کس حد تک روشنی پڑتی ہے اور فکر و تجربہ کے عوامل کو کس کس حد تک نئی روشنی اور ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ سب سے پہلے توحید کو لیجیے۔

## مسئلہ توحید اور اس کے مضمرات:

مسئلہ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور اگر ہم اسے پورے اسلام کے مترادف قرار دیں اور یہ کہیں کہ اس میں اسلامی رجحانات کی مکمل تشریح موجود ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ یہ ایک ایسا کلمہ ایجاز ہے کہ جسے اگر پھیلا دیجیے تو اس سے دین کی تمام جزئیات کو مرتب کیا جاسکتا ہے، یعنی یہ وہ قطرہ ہے جس میں پورے سمندر کی طغیانیاں پائی جاتی ہیں اور وہ جام جہاں نما ہے کہ پوری کائنات کی تمام جھلکیاں اس میں دیکھ لیجیے۔ اس میں علم الکلام کے نکات و غوامض بھی ہیں اور ایمان و عقیدے کی شیم آرائیاں بھی، فقہ کی وسعتیں بھی ہیں اور ذوق تصوف کے لطائف بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اجتماعی زندگی کے وہ رازہائے سربستہ بھی کہ جن کے حل و کشود پر موجودہ انسانیت کی فلاح و بہبود مبنی ہے۔ قرآن نے اس مسئلے کو کس اہمیت کا حامل قرار دیا

ہے' اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ یہی وہ شے ہے' جسے قرآن نے بار بار بیان کیا ہے یا یہی وہ شاہ نغمہ (Theme) ہے جو بار بار کانوں سے ٹکراتا اور ذوق و وجدان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نیز یہی وہ حقیقت ہے' گھوم پھر کر جس کی طرف قرآن مختلف اسالیب سے پلٹتا ہے اور مختلف مناسبتوں سے جس کے بو قلموں پہلوؤں کی تشریح کرتا ہے۔ قرآن اسے اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ گویا دین کی یہی وہ اونچی سچائی ہے کہ جس نے اسے پالیا اس نے گویا پورے دین کی نعمتوں سے اپنے دامن طلب کو بھر لیا اور جو اس سے محروم رہا اس نے دین و دنیا کی تمام محرومیوں کو سمیٹ لیا۔

سورہ بقرہ میں ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۶۳)

(اور تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔)

نساء میں ہے۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النساء: ۱۷۱)

(خدا ہی معبود واحد ہے۔)

مائدہ میں اسی مضمون کو اور نکھار کر زیادہ حصر کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط (المائدہ: ۷۳)

(اس معبود یکتا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔)

قرآن کی اصطلاح میں الٰہ کا یہ لفظ صرف ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا کہ اس کائنات کے علاوہ ایک بالا تر ذات یا ہستی کامل بھی ہے' بلکہ اس سے مراد ایک ایسی ذات کے ہیں' جس نے اس دنیا کو عدم کے دھندلکوں سے نکال کر وجود کی روشنی بخشی ہے' جو اس کا رب اور پروردگار بھی ہے' جس نے آسمان بنایا ہے' زمین پیدا کی ہے' نجوم و کواکب کی اس بزم حسین کو سجایا ہے اور انوار عطا کیے ہیں' جس نے انسان کو فکر و گویائی کی قوتوں سے مالا مال کیا ہے۔ پھر یہ ذات گرامی ارسطو کے تصورات کے مطابق' الگ تھلگ' مجرد اور عقل محض (Pure Reason) نہیں کہ جو دانش و علم کے ہر ہر تقید سے ماورا ہے' بلکہ ایسی سمیع' بصیر اور مشفق و رحیم ہستی ہے جو اپنے بندوں کی خیال رکھتی ہے' ان کی جملہ ضروریات سے آگاہ ہے اور جو دل کی دھڑکنوں اور خیال و

آرزوؤں کی جنبشوں تک سے آشنا ہے' اور اپنے بندوں کی رگ حیات سے بھی قریب تر ہے۔

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (زمر: ٦٢)

(خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔)

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (البقرہ: ۱۱۷)

(آسمانوں اور زمین کا پروردگار۔)

وَاَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (نجم: ۴۹)

(اور وہی شعریٰ کا رب ہے۔)

وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (فصلت: ۱۲)

(اور ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے آراستہ کیا۔)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ عَیْنَیْنِ ○ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ' وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ ○

(البلد: ۸'۱۰)

(کیا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان دو ہونٹ نہیں بخشے اور ہم نے اسے دو راستے بھی سمجھائے۔)

وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (بقرہ: ۲۲۴)

اور خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ )

فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ (بقرہ: ۱۵۸)

(سو اللہ اعمال کو قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔)

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ○ (ق: ۱۱)

(اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں؟)

## مضمرات توحید کی تعیین:

توحید کے اس ابتدائی اور سرسری تعارف کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توحید کے آخر وہ اونچے مضمرات کون ہیں جو فکر و عمل کے تمام تقاضوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور جن کو مان لینے کے

بعد انسانیت نہ صرف ارضی خداؤں کے چنگل سے مخلصی حاصل کر لیتی ہے، بلکہ ثریا و سما تک کی بلندیوں کو چھو لینے پر قادر ہو جاتی ہے اور تہذیب و تمدن کے ان تمام لطائف کا احاطہ کر لیتی ہے، جن پر حقیقی کامرانیوں کا دارومدار ہے۔ یہ مضمرات پانچ ہیں، جن میں تین کا تعلق تو زندگی کے ظاہر سے ہے اور دو کا زندگی کے باطن اور روح سے۔

ظاہر سے متعلق مضمرات حسب ذیل ہیں:

۱۔ کائنات کے بارے میں خالص علمی (Scientific) انداز فکر کی تخلیق۔

۲۔ اجتماعی عدل (Social Tustice) اور

۳۔ آفاقیت (Universolity)

باطن سے وابستہ قدروں کو ان عنوانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اخلاص

۲۔ سیر الی اللہ

آیئے اختصار کے ساتھ توحید کے ان گراں مایہ مضمرات کو فکر و تعمق کا ہدف ٹھہرائیں اور دیکھیں کہ **لا الٰہ** کے ان دو لفظوں میں حکمت و دانش کی کتنی بڑی دولت پنہاں ہے۔

## کائنات کے بارے میں خالص علمی انداز فکر کی تخلیق:

ہماری رائے میں عقیدہ توحید نے نوع انسانی پر سب سے بڑا احسان یہ کیا ہے کہ اس نے غور و فکر کی صلاحیتوں کو علم و عرفان کے صحیح راستوں پر ڈال دیا ہے اور ایسا انداز استدلال بخشا ہے جو اپنے آغوش میں تمام منطقی استواریوں کو لیے ہوئے ہے، جس سے یہی نہیں کہ وہم و ظن کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں، ارتیابیت کے ان جملہ پہلوؤں کی بھی نفی ہوتی ہے، جنھیں نو افلاطونیت (Nes-Platonism) اور تصوف کے غیر صحت مندانہ تصورات نے مل جل کر جنم دیا۔ اس لیے کہ توحید کا قصر رفیع جن مستحکم ستونوں پر قائم ہے، یا صغریٰ کبریٰ (Syllogism) کے جن سہاروں پر اس سچائی کی بنیاد ہے وہ یہ ہیں یہ کہ یہ عالم محسوس جو ہمارے گردو پیش پھیلا ہوا ہے، ایک واقعی اور حقیقی عالم ہے۔ نظر یا اندیشہ و ظن کی سیمیائی نہیں، اور یہ کائنات رنگ و بو علت و معلول (Causation) کے مضبوط ترین نظام کی رہین منت ہے، یعنی اس کی تمام کڑیوں کو اصول، قاعدہ اور قانون کی استواریوں نے پوری طرح جکڑ رکھا ہے۔ چنانچہ اس میں کہیں بھی خلل نہیں، کہیں

بے ربطی نہیں اور کہیں بھی اختلاف و تفاوت کی ناہمواریاں نہیں' نیز یہ کہ تعلیل و تسبب کے اس عظیم کارخانے کو پیدا کرنے اور چلانے والی ایک ہی ذات گرامی ہے جو پرستش و عبادت کے لائق ہے۔

یہ عالم برحق ہے اور یہ کائنات طبیعی قوانین اور مصالح پر مبنی ہے' اس کے لیے دیکھیے سورہ زمر کے یہ الفاظ:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط (زمر:۵)

(اسی نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا ہے' اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو اپنے بس میں کر رکھا ہے' سب ایک وقت مقرر تک چلتے رہیں گے۔)

سورہ ابراہیم میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط (ابراہیم:۱۹)

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔)

اسی مضمون کی آیات الانعام' نحل' تغابن اور عنکبوت میں بھی جابجا پائی جاتی ہیں۔ مگر سورہ انبیا کی اس آیت کو تو اس معاملے میں فیصلہ کن سمجھنا چاہیے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (الانبیا:۱۶)

(اور ہم نے آسمان و زمین اور جو مخلوقات ان دونوں کے درمیان ہے' اسے یوں ہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔)

بالحق کا لفظ اس آیت میں بہت جامع ہے جو سورہ دخان کی آیت نمبر۳۹ میں بھی ہے' اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اس کائنات کا ایک مقصد ہے' اس کی تخلیق و آفرینش کی ایک غایت ہے' اور یہ معنی بھی ہیں کہ یہ کائنات حقیقتاً خارج میں موجود ہے اور ثبوت و وجود کی جلوہ گری سے پوری طرح بہرہ مند ہے۔ علاوہ ازیں اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس عالم کو تعلیل و تسبب کے ان تمام وسائل و ذرائع سے نوازا گیا ہے جو وجود تحقق کے لیے ضروری ہیں۔ یہ

کارخانہ ایسا کامل، مربوط اور منظم ہے کہ اس میں نقص و عیب یا خلل کہیں بھی پایا نہیں جاتا۔ تائید کی غرض سے سورۂ ملک کی اس نہایت ہی بلیغ آیت پر نظر ڈالیے، کیا تیور ہیں؟ پڑھیے اور سر دھنیے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ (ملک: ۳۔۴)

(اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ کیا تو خدائے رحمان کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ، بھلا کہیں بھی خلا یا شگاف نظر آتا ہے؟ دو بارہ سہ بارہ تنقید و احتساب کی نظر دوڑا، تھک ہار کر لوٹ آئے گی، مگر کہیں بھی کائنات میں نقص یا ناہمواری نظر نہ آئے گی۔)

کائنات کے بارے میں یہ موقف جو نظریۂ توحید اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے کس درجہ سائنٹیفک، بچا تلا اور معقول ہے۔ اس سے افلاطون کے اس تصور کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ یہ عالم محض "مثل" کا پرتو یا انعکاس ہے، حقیقی اور واقعی نہیں۔ برکلے کی ارتیابیت کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں نکلتی کہ جس کی رو سے کائنات کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ ذہن کی کرشمہ سازی ہے اور ان متصوفانہ افکار کی بھی قلعی کھل جاتی ہے جس میں کائنات کی ٹھوس حقیقتوں کا انکار پایا جاتا ہے۔

قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آسمان و زمین کا یہ نظام برحق ہے، آفتاب عالم تاب فی الواقع موجود ہے، چاند اور ستارے حقیقتاً ضیا افگن ہیں اور یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سبزہ، یہ روئیدگی اور صبح و شام کے یہ جلوے سب کے سب اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ ایک علام الغیوب انھیں پیدا کرنے والا اور خلعت وجود بخشنے والا بھی ہے۔

خالص علمی اور دینی نقطہ نظر سے دیکھیے تو کائنات سے متعلق یہی موقف صحیح بھی ہے، کیوں کہ اگر یہ دنیا باطل ہے، اگر یہاں تعلیل و تسبب کی کارفرمائیاں نہیں پائی جاتیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یہاں کسی لگے بندھے قاعدے، کسی نپے تلے اصول اور اٹل قانون کی فرماں روائی نہیں اور یہ سارا تماشا، معاذ اللہ محض فریب و خداع کا نتیجہ ہے۔۔۔۔ اس صورت میں علوم و معارف کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص بھی اس پوزیشن میں نہیں رہتا کہ کسی

متوقع چیز کے بارے میں پیش گوئی کر سکے۔ یعنی تعلیل و تسبب کے ہمہ گیر قانون کو اگر اس عالم میں جاری و ساری نہ مانا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی استدلال بھی قطعی نہیں، کوئی قضیہ بھی یقینی نہیں اور کوئی منطق ایسی نہیں کہ جس پر بھروسا کیا جائے۔

اس صورت میں عین ممکن ہے کہ کل آفتاب طلوع نہ ہو، ستارے رات کو ضو افشانیاں نہ کریں اور یہ کشتی نور چاند بحر فلک میں رواں ہونا ہی ترک کر دے، اور یہ نظام عالم کسی نادیدہ ڈگر پر ہو لے۔ قرآن ان تمام احتمالات کی نفی کرتا ہے اور ببانگ دہل کہتا ہے کہ اس نظام میں انحراف اور گڑبڑ کا کوئی امکان نہیں:

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَاهُمْ مُّظْلِمُوْنَ ○ وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِىْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ (یٰس: ۳۷-۴۰)

> (اور نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں، تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے، اور سورج اپنے مقرر رستے پر رواں دواں ہے، یہ خدائے غالب و دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے، اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں ٹھہرا دیں ہیں، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح باریک ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی چاند کو جا پکڑ سکتا ہے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔)

یوں بھی اگر اسلام کو ہم تمدن آفرین مذہب مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اس عالم کی گھما گھمیوں میں اسے بہ ہرحال ایک معلم کا کردار ادا کرنا ہے، تو ماننا پڑے گا کہ یہ عالم حقیقی ہے، قابل توجہ ہے اور قطعی اس لائق ہے کہ اس کے تہذیبی خانوں کی ترتیب و تغیر میں دلچسپی کا اظہار کیا جائے۔

مذہبی نقطہ نگاہ سے اس مسئلے کا جائزہ لیجیے، تب بھی یہی موقف فکر و نظر کی ترازو میں جچتا ہے، اس لیے کہ اگر یہ دنیا سرے سے باطل اور غیر حقیقی ہے اور محض ظل اور سایہ کی حیثیت ہی رکھتی ہے تو پھر مذہب و دین کے ان جھمیلوں کے لیے کیا وجہ جواز ہے؟ ایسی غیر حقیقی اور موہوم چیز کے

لیے وحی و نبوت اور کردار و سیرت کا یہ اہتمام کیوں؟

اس سے بڑھ کر اس موقعے پر یہ چبھتا ہوا اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ عالم رنگ و بو، جھوٹ فریب اور خداعی کرشمہ ہے تو اس صورت میں خود مذہب و دین کی سچائی پر کون سی دلیل قائم کی جائے گی۔

کیا جھوٹ اور کذب کے بطن سے کبھی سچائی نے جنم لیا ہے؟

سایہ اور اظلال نے کبھی حقائق کی تخلیق کی ہے؟

وہم و خیال کی جنبشوں نے وحی و تنزیل کا روپ اختیار کیا ہے؟

## واقعیت عالم کی تہذیبی اہمیت:

مزید براں واقعیت عالم کے مسئلے کی اہمیت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ اسلامی فلسفے کی پہلی اور بنیادی اینٹ ہے۔ اگر مسلمانوں کے ارباب فکر و علم حضرات کو لا طائل بحثوں اور کم اہم مناقشوں اور مشغلوں سے کبھی فرصت ملی اور انھوں نے اسلامی نظام کی از سر نو تشکیل و تعمیر کی ضرورتوں کو سنجیدگی کے ساتھ تسلیم کر لیا، تو اس وقت پہلا سوال جو نظر و بصر کے سامنے ابھر کر آئے گا یہی ہو گا کہ اسلام کائنات کے بارے میں کس زاویہ نظر کا حامل ہے اور یہ کہ یہ عالم مادی اور یہ کائنات محسوس، کس حد تک تحقق و وجود کی نعمتوں سے بہرہ مند ہے؟ اسلامی فلسفے میں اس سوال کے جواب پر عمل و کردار کا پورا کارخانہ قائم ہے۔ اگر یہ دنیا فی الواقع موجود نہیں ہے، جس طرح بعض ہندو وجودی کہتے ہیں اور اگر اس کی حیثیت محض مایا اور فریب کی ہے، تو منطقی طور پر تین ہی طرح کے طرز عمل اس کے بارے میں اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

اول یہ کہ یہ لوگ خیر و شر اور نیکی و بدی کے معاملات میں متساہل اور غیر متعلق (Indifferent) ہو جائیں اور اخلاق و مذہب کی اقدار کو کوئی خاص اہمیت نہ دیں۔ اس تساہل اور لا تعلقی پر مبنی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح کا ہو گا کہ کارگاہ حیات میں اگر چلتے چلاتے اتفاقاً کوئی نیکی سرزد ہو جاتی ہے تو فبہا، ورنہ برائی اور شر میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک اصل شے روز مرہ کی ادنیٰ ضروریات کی تکمیل ہے۔ خیر و شر، ایمان و کفر یا صواب و خطا کی بحثیں سرے سے غیر ضروری ہیں۔

اس نوع کے رجحانات کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ مذہب و اخلاق کے بارے میں سوچنا ہی

ترک کر دیں گے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بجائے تساہل و لاتعلقی کے دلوں پر لذتیت (Hedonism) کا خیال غلبہ حاصل کر لے اور لوگ اس طرح سوچنا شروع کر دیں کہ اگر یہ دنیا ہی غیر حقیقی ہے اور اگر اس عالم ہست و بود کے وجود کا کوئی پہلو بھی واقعیت کا آئینہ دار نہیں تو پھر اخلاق و اقدار کی گراں بار ذمہ داریاں آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہیں اور مذہب و عقیدے کے اوامر و نواہی کے لیے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی، جیسا کہ اس سے پہلے ہم پہلے چکے ہیں۔ اس صورت میں انسان یہ سوچتا ہے کہ کیوں نہ اس غیر حقیقی زندگی کے لمحات گریزپا کو عیش و طرف کے لذت آفرین لمحات سے بدل دیں اور کیوں نہ شیخ کی ناصحانہ صحبتوں کو چھوڑ کر مینا و جام کی روح پرور رفاقتوں کو اختیار کیا جائے، جو غیر حقیقی ہی سہی، خوش گوار تو ہیں۔ یعنی اگر لیل و نہار کی یہ گردشیں واقعی جھوٹ پر مبنی ہیں اور ان کے پیچھے علل و اقدار کا کوئی نظام کارفرما نہیں تو پھر عیش و طرب کی نشاط آفرینیوں کو کیوں جھٹلایا جائے اور زہد و قناعت کے پیمانوں کو کس فلسفے کی رو سے اختیار کیا جائے۔ بلکہ پھر دل کی شورشوں کو یہ کہہ کر کیوں نہ تسلی دی جائے کہ جھوٹ اور فریب کے اس انبار میں سے مسرت و شادمانی کی جتنی بھی سچائیوں سے دامن طلب بھرنا ممکن ہے، بھر لیا جائے اور مایا یا باطل کے اس جال میں خواہشات و امانی کی جتنی بھی چڑیوں کو پھانسا جا سکے پھانس لیا جائے، اس لیے کہ ایک نہ ایک دن اس طلسم وجود کو زائل ہونا ہے اور ایک نہ ایک گھڑی زندگی کے فریبوں کو عیاں ہونا ہے۔

اس کے برعکس تیسرا طرز فکر، رہبانیت اور فقر و فاقہ کے ان غیر صحت مند تصورات کو ابھار سکتا ہے، جنھیں کہ اسلام پہلے ہی قدم پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے غیر حقیقی اور غیر واقعی ہونے کے یہ معنی بھی ہیں کہ یہاں کی مسرتیں اور یہاں کی خوشیاں اور لذتیں ناپائیدار اور غلط ہونے کی وجہ سے قطعی شائستہ التفات نہیں ہیں۔

زندگی کے اس تصور میں علاوہ اس قباحت کے کہ اس میں خواہ مخواہ محرومیوں اور ناکامیوں کو دعوت دی جاتی ہے، یہ نقص بھی ہے کہ یہ تہذیب و تمدن کے جیتے جاگتے تقاضوں کے منافی ہے۔

## دہرا اشکال۔۔غزالی کا نظریہ توالی و تعاقب:

یہ کائنات حقیقتاً موجود ہے اور اس میں تعلیل و تسبب کی باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اس تصور کو

اگر توحید کا بدیہی اور اولین تقاضا مانا جائے اور کہا جائے کہ اس سے علمی نقطہ نظر کی تصدیق ہوتی ہے تو یہ صحیح ہے، مگر اس پر مندرجہ ذیل دو اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اس سے کھری مادیت کا تصور ابھرتا ہے اور تصوف و روحانیت کے ان صحت مند تقاضوں کی نفی ہوتی ہے کہ جنھیں مذہب کو روح اور جان قرار دیا جا سکتا ہے اور جن کی بدولت اخلاقی و دینی اقدار میں ایک طرح کی لطافت و معنویت پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ اگر تعلیل و تسبب کا قانون اٹل اور محکم ہے، تو اس صورت میں معجزات و خوارق کی کیا توجیہہ کی جائے گی؟ اس لیے کہ معجزات و خوارق تو کہتے ہی ایسے واقعات و حالات کو ہیں کہ جہاں تعلیل و تسبب کا سلسلہ قائم نہیں رہتا۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ دنیا جہاں تحقق و وجود کی نعمتوں سے بہرہ مند ہے، وہاں اس کا ایک حقیقی خالق بھی ہے۔ چنانچہ اخلاص، سیرالی اللہ اور آخرت کے ضمن میں ہم کھل کر بتائیں گے کہ یہ عقائد و تصورات، فکر و عمل پر کس کس پہلو سے اثر انداز ہوتے ہیں اور کیوں کر ان میں معنویت، گہرائی اور لطف و ذوق کی چاشنی پیدا کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔

دوسرا سوال ذرا ٹیڑھا ہے، اس میں دہرا اشکال (Dilemmd) یہ ہے کہ اگر کائنات میں تعلیل کی کارفرمایاں تسلیم نہ کی جائیں، تو اس سے خوارق کی توجیہہ تو ہو جائے گی، لیکن اس کے یہ معنی ہوں گے کہ طلب و جستجو اور تفحص و تحقیق کے لیے کوئی بھی ایسی اساس پائی نہیں جاتی کہ جس پر سائنسی انکشاف کی دنیا تعمیر کی جا سکے اور علم و عرفان کے قافلوں کو آگے بڑھایا جا سکے۔ اس صورت میں گویا ارتقا بالکلیہ ختم ہو جاتا ہے، اور طبعیات سے لے کر تہذیب و تمدن کے خانوں تک میں جمود ور کود چھا جاتا ہے۔

اور اگر تعلیل و تسبب کی استواریوں کو مان لیا جائے تو اس سے اگرچہ علوم و فنون کے ارتقا کے لیے تو گنجائش نکل آتی ہے اور تہذیب و تمدن کے تیز رو قافلوں کو بھی رکنا نہیں پڑتا، تاہم اس میں دو بین قباحتیں ہیں، ایک تو اس سے معجزات و خوارق کی بہ ظاہر توجیہہ نہیں ہو پاتی۔ دوسرے زندگی جبر و لزوم کے سانچوں میں ڈھل کے رہ جاتی ہے۔

غزالی نے اس تضاد سے بچنے کے لیے اقتران و توالیٔ حالات کا عجیب و غریب نظریہ پیش کیا

ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کارخانہ ہست و بود میں کہیں بھی تعلیل و تسبب کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس یہ دنیا حالات و حوادث کے صرف ایسے تسلسل سے تعبیر ہے کہ جس میں واقعات ایک خاص ترتیب اور نہج سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ پہلے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو ہم علل و اسباب سے تعبیر کرتے ہیں، اور بعد میں پیش آنے والے حالات کو معلوم و نتیجہ کہتے ہیں، حالاں کہ جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے، وہ اس سے زیادہ نہیں کہ یہاں واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو جاری و ساری ہے۔

غزالی کے اس نظریے میں دراصل ایک طرح کی مفاہمت کا پہلو پایا جاتا ہے، یعنی ایک طرف تو وہ نبوت اور معجزات کی معقول اور سمجھ میں آنے والی توجیہہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف تعلیل و تسبب کے نتائج کو جھٹلانا بھی نہیں چاہتے۔ اس لیے اگرچہ وہ تعلیل کے خارجی وجود کا انکار کرتے ہیں، تاہم واقعات میں توالی و تعاقب کے سلسلوں کو اس طرح اٹل اور محکم گردانتے ہیں کہ جس میں خلل و تخلف کی دخل اندازیاں قطعی پائی نہیں جاتی۔

آج غزالی اگر زندہ ہوتے تو موجود فلسفے کی اس تحقیق و کاوش کی دل کھول کر داد دیتے کہ قوانین فطرت کی دو سطحیں ہیں۔ ایک وہ طبعی و فطری (Natural) کہ جسے ہم محسوس کرتے ہیں، اور ایک وہ فوق الفطرت اور ماورائے طبیعت۔ (Natural Super) کہ جسے ہم اگرچہ محسوس نہیں کرتے، تاہم وہ موجود اور کارفرما ضرور ہے۔

کہنا یہ ہے کہ تعلیل و تسبب کی یہی وہ سطح ہے جس سے بغیر کسی منطقی تضاد سے دوچار ہوئے خوارق و معجزات کی بہ احسن وجہ توجیہہ ہو جاتی ہے۔ اور اس تکلف کی قطعی ضرورت نہیں رہتی کہ اقتران و تعاقب کے انوکھے نظریے کو تسلیم کیا جائے۔

## قرآن نے استقرا کی حمایت کی ہے:

توحید ایک اور طریق سے بھی سائنٹیفک نقطۂ نظر کو ابھارنے کا باعث ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کے ادلہ پر غور کیا ہے اور خصوصاً ان دلائل و براہین کو توجہ و التفات کا ہدف ٹھہرایا ہے، جن کا تعلق براہ راست اثبات توحید سے ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن نے ارسطو کے فرسودہ اور عقیم طریق استخراج، (Deduction) کے مقابلے میں استقرا (Induction) ایسے مفید و نتیجہ خیز منہاج استدلال کو کہیں زیادہ اہمیت دی ہے، بلکہ حصر و یقین کے رنگ میں کہنا چاہیے۔ کہ

قرآن نے استقرا اور صرف استقرا ہی پر فکر و عقائد کی بنیاد رکھی ہے اور استخراج کو چھوا تک نہیں!

سورۂ قٓ میں ہے:

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○(٦)

(کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اسے کیوں کر بنایا اور کیوں کر سجایا ہے اور اس میں کہیں شگاف و خلل تک نہیں۔)

سورہ ذاریات میں ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ○ وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (ذاریات: ۲۱)

(اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، اور خود تمھارے نفوس میں کتنی نشانیاں ہیں، تو کیا تم دیکھتے نہیں۔)

غاشیہ میں اسی طریق استدلال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ○ وَ اِلَی السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ ○ وَاِلَی الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ ○ وَاِلَی الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ ○ (۱۷۔۲۰)

(کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب و غریب انداز میں پیدا کیے گئے ہیں اور آسمانوں کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتے کہ کیوں کر انھیں بلندی عطا کی گئی ہے، نیز پہاڑوں کی طرف نظر نہیں ڈالتے کہ کس استواری سے کھڑے کیے گئے ہیں، اسی طرح کیا زمین پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح پاؤں تلے بچھا دی گئی ہے۔)

یہ بلند و بالا آسمان، یہ پاؤں تلے بچھی ہوئی زمین، یہ حیرت انگیز نفوس، یہ عجیب و غریب مخلوق اور یہ استقامت و استحکام کا پیکر پہاڑ، کیا جزئیات و افراد (Particulars) نہیں؟ اور جب قرآن حکیم ان کے بارے میں فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ کائنات کی ان عجوبہ طرازیوں پر غور کرو تو اس کے سوا وہ اور کیا چاہتا ہے کہ استقرا و تفحص سے ان میں عقیدے اور

ایمان کی جو جو پہنائیاں ہیں، انھیں نکھار کر منظر عام پر لاؤ اور بتاؤ کہ کیا کائنات کے ان حسین و جمیل نظم و نسق میں کہیں ہمیں متعدد آلہہ کا ثبوت ملتا ہے، کہیں دوئی کی جھلک نظر آتی ہے اور کہیں متعدد خداؤں کی کش مکش اور لڑائی دکھائی دیتی ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔

قرآن حکیم توحید سے متعلق جس منہاج فکر کو پیش کرتا ہے، اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ وہ سائنس اور اس کے انکشافات کو ایمان افروزی کا ایک منطقی ذریعہ سمجھتا ہے اور اسے ہرگز شک و شبہے کی نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ زیادہ صاف پیرائیہ، بیان میں یوں کہنا چاہیے کہ قرآن حکیم کے نقطہ، نظر سے جس نسبت سے انسان کائنات میں غور کرے گا اور جس نسبت سے اس کی حکمتوں کو فکر و تدبر کا مدار و محور ٹھہرائے گا، اسی نسبت سے ایمان باللہ کا تصور زیادہ نکھرتا جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ سائنس اور نفسیات کی ابتدائی ترقیات سے ملحدانہ افکار کو ایک حد تک مدد ملی ہے، مگر اب صورت حال یہ نہیں۔ تاریکیاں برابر چھٹ رہی ہیں، تعصبات کے دائرے آہستہ آہستہ سمٹ رہے ہیں اور ایسے ایسے حقائق سے انسان روشناس ہو رہا ہے کہ جو مذہب و دین کے پرانے مسلمات کو اعتماد و یقین کی روشنی عطا کر کے رہیں گے۔

دیکھیے قرآن اس امکان کو کس وثوق سے پیش کرتا ہے اور اس صبح سعادت کا نقشہ کس دل آویزی سے کھینچتا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ: ۵۳)

(ہم عنقریب انھیں آفاق میں خود ان کی ذات میں نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے۔)

## مسلمان ارباب فکر کی بدنصیبی:

مسلمان ارباب فکر کی بدنصیبی دیکھیے کہ توحید نے تو انھیں استقرا و تفحص کی اہمیتیں جتائی تھیں اور انھیں علم و تجربے کی کشادہ راہوں پر ڈالا تھا، لیکن انھوں نے اپنے لیے جس منطق کو پسند کیا، وہ ارسطو کی بے نتیجہ صوری منطق تھی، جس نے ارتقا و تقدم کے تقاضوں کے آگے

دیواریں اور رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ مغرب اس معاملے میں یقیناً خوش نصیب ہے کہ اس نے ڈیکارٹ، بیکن اور مل کی تنقیدوں سے متاثر ہو کر بالآخر ارسطو سے عقیدت و محبت کے رشتوں کو توڑا، اور استقرائی منطق کی روشنی میں نئے علوم و فنون کی طرح ڈالی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دو ڈھائی سو سالوں کی محنت کے بعد آج وہ اس قابل ہے کہ شمس و قمر پر بے دریغ کندیں پھینکے اور تسخیر کائنات کے حسین و شیریں خواب کو شرمندہ تعبیر کر کے دکھائے۔

ہماری جہالت ملاحظہ ہو کہ ارسطا طالیسی منطق کی دھجیاں ہم نے بھی بکھیریں، ہم میں بھی سہروردی، ابن حزم اور ابن تیمیہ ایسے عظیم انسان نقاد پیدا ہوئے، مگر ان کی کوششیں کسی طرح بھی استقرائی اور ایجابی منطق کی تخلیق کا باعث نہ ہو سکیں، اور آج بھی علم و فن کے اس زریں عہد میں ہمارے مدارس میں یہی بے نتیجہ، فرسودہ اور لغو منطق پڑھائی جاتی ہے۔

استقرا کو ہمارے منطقیوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ چوں کہ افراد و جزئیات کا استیعاب محال ہے اس لیے اس کے بل پر کوئی یقینی حقیقت دریافت نہیں ہو سکتی۔

یہی مطلب تھا ان کے اس قول کا:

**الاستقراء یفید الظن**

”کہ استقراء کی افادیت ظن و گمان کی حدود سے آگے نہیں بڑھ پائی۔“

مگر یہ حضرات اس حقیقت کو بھول گئے کہ کائنات میں ایک طرح کی یکسانی اور توافق (Uniformity) پایا جاتا ہے، اس لیے جو بات اس متجانس جزئیات کے بارے میں صحیح ہے، وہ دس ہزار اور دس لاکھ جزئیات کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

یہی وہ استقرائی کلیہ ہے، جس کی بنیاد پر سائنس کا سر بفلک محل استوار ہے جس کے بل پر گاڑیاں چلتی ہیں، جہاز اڑتے ہیں اور نغمہ و صوت کی طرب آفرینیاں دوش ہوا پر سوار ہو کر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کے فاصلوں کو چشم زدن میں طے کرتی پھرتی ہیں۔

## عدل اجتماعی:

توحید کے اونچے مضمرات میں ایک تصور عدل اجتماعی کا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توحید ایک مطمع نظر کا نام ہے، ایک معیار اور قدر سے تعبیر ہے اور ایک ایسے عقیدے کا نام ہے

کہ جس سے زندگی کے خطوط متعین ہوتے ہیں' تو پھر عدل اجتماعی کو ہمارے معاشرے میں ایک ایسی اساس کی حیثیت حاصل ہونا چاہیے کہ جس پر زندگی کے تمام غرفہ ہائے بلند کی تعمیر ہو سکے۔

توحید کیا ہے؟ کیا اس سے مراد صرف عددی وحدت کی تعیین ہے؟ یا یہ مسئلہ صرف ریاضی اور حساب کا مسئلہ ہے کہ جس کی رو سے ہمیں بہت سے آلہہ میں سے صرف ایک برتر اور عظیم الٰہ کو منتخب کرنا اور چھانٹنا ہے اور بس؟

یا یہ ایک فلسفہ حیات کی بات ہے اور نظریہ زیست کا قصہ ہے؟ ہمارے نزدیک توحید کا مسئلہ صرف عبادت و پرستش کا مسئلہ بھی نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عبادت اور پرستش کی سزا وار صرف اسی کی ذات گرامی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ عبادت قلب و روح کا نہایت ہی شریفانہ اور ناگزیر تقاضا ہے' تاہم توحید کے تقاضے اس کے سوا بھی کچھ ہیں۔ توحید اقرار باللسان بھی ہے' تصدیق بالجنان بھی ہے' رکوع و سجود اور دعا و تعظیم بھی ہے' مگر اس کے علاوہ یہ پورا دین' ایک خاص نقطۂ نگاہ اور متعین اسلوب حیات بھی ہے۔ چنانچہ اگر توحید کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں فرد اور معاشرے کی حیثیت سے اس کی خوبیوں کو اپنانا ہے اور اس کی تعلیمات کو اپنے فکر و عمل کا جزو ٹھہرانا ہے تو پھر ایک ایسا فلسفۂ حیات تراشنا ہو گا جس میں زیادہ سے زیادہ وحدت' زیادہ سے زیادہ یکسانی اور مساوات کی جھلک پائی جائے' اور غیر فطری' اور غیر معقول تفاوت و اختلاف ہرگز نہ ہو۔ یعنی توحید ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا کرنا چاہتی ہے' جس میں اونچ نیچ اور نشیب و فراز کا اختلاف اس نوعیت کا نہ ہو کہ ایک طبقہ تو دولت و ثروت اور عزو جاہ پر اجارہ داری قائم کر لے اور سہولت و عیش کے ان تمام سرچشموں پر قابض ہو کر بیٹھ جائے جن سے پوری ملت کو استفادہ کناں ہونا چاہیے تھا۔

اور دوسرا گروہ یا انسانوں کی عظیم اکثریت زندگی کی ابتدائی نعمتوں سے بھی محروم ہو۔ یہ کھلی ہوئی ناانصافی ہے اور واضح دھاندلی جو کسی طرح بھی اسلام کے اجتماعی انصاف کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ توحید کے نقطۂ نظر سے خدائی اور سروری صرف اس احکم الحاکمین کے لیے زیبا ہے جس نے دنیا کو کتم عدم سے وجود بخشا ہے اور باقی تمام نوع انسانی اس کے آگے عبودیت میں برابر ہے' کسی کو کسی پر' مال و دولت' حسب و نسب اور رنگ ولون کے اختلافات کی بنا پر فضیلت حاصل نہیں!

افلاطون نے کہا تھا:

"ایک شہر میں دو شہر آباد نہیں ہونا چاہئیں۔"

بعینہٖ توحید بھی یہی چاہتی ہے کہ ایک ملک ایک ہی ملک ہو۔ اس میں دو مختلف تہذیبیں اور دو مختلف معیار زندگی نہ ہوں اور ایک ملت، ایک ہی ملت ہو، ثروت و غربت کے دو مختلف نمونے نہ ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ جب آفتاب کی روشنی سے سب یکساں مستیز ہوتے ہیں اور فطرت کی فیاضیوں کے دروازے سب پر بغیر کسی تفریق و امتیاز کے کھلے ہیں، جب ہر شخص بغیر کسی دقت و دشواری کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب روحانی پر فائز ہو سکتا ہے اور کردار و سیرت کی کسی بھی سطح پر قدغن اور اجارہ داری کی اجازت نہیں دی جاتی، تو پھر دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں پر یہ پابندیاں اور اجارہ داریاں کیوں قائم ہیں؟ یہ اونچے اونچے محل اور خوب صورت اور کشادہ بنگلے صرف امرا کے لیے کیوں مخصوص ہیں؟ اعلیٰ تعلیم کے دروازے کیوں غربا پر بند ہیں؟ صحت و علاج کی سائنٹیفک سہولتیں کیوں ایک عام آدمی کو میسر نہیں؟

یہ سوالات ہیں جو ہر اس شخص کے دل میں کھٹکتے ہیں جو توحید کا علم بردار ہے اور اس عقیدے کو جیتی جاگتی عملی شکل میں نافذ دیکھنے کا متمنی ہے۔

یوں تو اقتصادی ناہمواریوں کی تاریخ بہت قدیم ہے، لیکن مشین اور صنعت کی طرفہ طرازیوں نے خصوصیت سے عدم مساوات کی خلیج کو بہت زیادہ گہرا کر دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب دنیا کے ہر ہر ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے، جس نے دولت و ثروت کے انباروں کو بری طرح سمیٹ لیا ہے اور سہولت و آسائش اور تہذیب و تمدن کے جملہ لوازم کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔

اگر یہ قصہ صرف یہیں تک محدود رہتا تو بھی کچھ مضائقہ نہ تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ زندگی کی تمام اقدار پر تصرف انہی کا ہے۔ یعنی سیاست پر ان کا قبضہ ہے، اقتدار کے عرش بریں پر یہ متمکن ہیں، اور پوری کائنات کی زندگی و موت کا مسئلہ ان کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ اگر چاہیں تو دنیا کو امن و امان سے رہنے دیں اور نہ چاہیں تو ساری دنیا کو جنگ اور تباہی کے عمیق غاروں میں دھکیل دیں۔

اجتماعی ناانصافیوں نے بین الاقوامی سطح پر کن خطروں کو ابھار دیا ہے اور تہذیب و تمدن کے

نقشوں میں کن نئے خطوط اور زاویوں کا اضافہ کیا ہے؟ تھوڑی دیر کے لیے ان سے قطع نظر کر لیجیے اور صرف یہ دیکھیے کہ خود ہمارے ہاں چھوٹے پیمانے پر اس گروہ کی بدولت کن اقدار کو گزند پہنچا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہمارے ہاں کسی شخص کے مقام و مرتبہ کا تعین تقوے سے ہوتا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ط (حجرات: ۱۳)

(تم میں سے عنداللہ زیادہ تکریم کا مستحق وہ ہے، جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔)

یعنی اسلام جس مثالی معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے اس میں عہدوں کی تقسیم اور مرتبہ و جاہ کی تعیین اس بنا پر نہیں ہوتی کہ کون شخص کس خاندان کا چشم و چراغ ہے، اس کی رگوں میں کس عظیم شخصیت کا لہو دوڑ رہا ہے، کس قوم یا قبیلے سے لگاؤ رکھتا ہے، یا اس کے عیش و نشاط کی فراوانیوں کا کیا حال ہے، کتنی کوٹھیاں اس کے قبضۂ تصرف میں ہیں، کتنی کاریں اس کی خدمت میں مصروف گردش ہیں اور مال و ثروت کے کتنے ڈھیروں کو یہ اپنے دامن حرص و آز میں چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرے میں کسی شخص کی قدر و قیمت اور ذمہ داری و مناصب کی تقسیم اس بنا پر ہوتی ہے کہ اس میں اتقا کس نسبت سے پایا جاتا ہے اور وہ فکر و ذہن یا کردار و عمل کی کتنی اونچی سطح پر فائز ہے۔ اتقا کے بارے میں یہ سمجھ لیجیے کہ یہ لفظ قرآنی استعمال کے لحاظ سے غضب کی جامعیت کا حامل ہے۔ اس میں دانش و حکمت کی بلندیوں سے لے کر سیرت کی رفعتوں تک ہر چیز داخل ہے۔

کہیے انسانی فضیلت کا اس سے بہتر کوئی معیار تصور میں آسکتا ہے۔

یہ ہے وہ فیصلہ کن کسوٹی جس پر کہ اسلام کے مثالی معاشرے کو کم از کم عہدہ و منصب کی تقسیم کی حد تک پورا اترنا چاہیے۔

اب یہ دیکھیے کہ کیا ہمارے چھوٹے سے چھوٹے تنظیمی دائرے سے لے کر بڑے سے بڑے تنظیمی دائرے تک وہ علمی ہو یا تہذیبی، ادبی ہو یا تادیبی، کیا ذرا بھی اس معیار کا خیال رکھا جاتا ہے؟ کیا ہم اپنے ہاں عہدہ اور منصب کی تقسیم میں کھلے بندوں توحید کی اس سب سے بڑی قدر کی تذلیل نہیں کرتے اور ہماری نظریں گھوم پھر کر انہی لوگوں کی طرف نہیں اٹھتیں جو دنیاوی طور پر صاحب حیثیت اور مال دار ہوں، ہم یہ نہیں کہتے کہ اس باب میں ہمارے ہاں عمداً اسلام کے

خلاف علم بغاوت بلند کیا جاتا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ ہم اس طرز عمل کے لیے مجبور ہیں۔ اس لیے کہ جب اور جہاں کہیں بھی کسی معاشرے میں معاشی ناانصافیوں کی وجہ سے اس نوع کی ناہمواریاں ہوں گی، اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ غربا اپنی مجلس اور خالص دینی ضروریات کے لیے بھی ایسے گروہ کی طرف دست طلب بڑھائیں جو اور سب کچھ ہے مگر دین دار نہیں ہے۔

## (۲۰)

# رسالت

جب ہمارا ذہن رسالت کی طرف منتقل ہوتا ہے اور ہم زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ آفرینش آدم سے لے کر نبی ﷺ کی ذات گرامی تک کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں آئے ہیں' جنھوں نے اپنے اپنے دور میں لوگوں کو دعوت حق دی' انھیں برائیوں سے روکنے کی سعی کی اور اعمال خیر کی طرف بلایا تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں پیدائش کے وقت ہی سے یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ بارگاہ الٰہی سے اس پر کچھ ذمے داریاں عائد کر دی گئی ہیں' جن کو بناھنا اور بروئے عمل لانا اس کے فرائض میں داخل ہے۔

دنیا کا پہلا انسان پہلا پیغمبر تھا یعنی ادھر انسانیت کا وجود اس عالم گیتی میں نمودار ہوا' ادھر اس کو راہ راست پر لانے کا آغاز ہو گیا اور قلب و ذہن کی گہرائیوں سے پیغمبروں کی آمد اور ان کی تعلیمات پر ایمان لانا لازمی قرار دے دیا گیا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (النساء: ۱۷۱)

(اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔)

یعنی جس طرح اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے' اسی طرح اس کے رسولوں اور پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اسی سورت میں اس سے پہلے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (النساء: ۶۴)

(اور ہم نے جس کسی کو بھی منصب رسالت سے بہرہ ور کر کے دنیا میں بھیجا' تو اسی لیے کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔)

پھر جس پیغمبر کو جس قوم میں بھیجا' اس قوم کی زبان میں پیغام ہدایت دے کر بھیجا تاکہ کسی کو اصل بات سمجھنے اور مقاصد کی تہہ تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ادھر

پیغمبر نے بات کی اور ادھر سننے والے کے ذہن میں اتر گئی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: ۴)

(اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ ان کے سامنے بات واضح کر سکے۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اصل مقصد کی وضاحت قومی زبان ہی میں ہو سکتی ہے' جسے ہر شخص آسانی سے اپنے دائرۂ فہم میں لا سکتا ہے' اور پیغمبروں کا اسلوب تفہیم یہی رہا ہے۔

## پیغمبر انسان تھے:

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن کی گرفت میں آجانی چاہیے کہ چوں کہ تبلیغ حق انسانوں میں کرنا مقصود تھا' اس لیے بارگاہ قدس سے اعزاز پیغمبری بھی انسان ہی کو عطا فرمایا گیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۳)

(اور اے محمد ﷺ! ہم نے آپ سے پہلے انسانوں ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا' جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔)

پیغمبر دنیا سے کسی الگ تھلگ مخلوق کا نام نہ تھا' وہ اسی دنیا میں رہتے تھے' ان کے بیویاں بھی ہوتی تھیں اور اولاد و احفاد بھی ہوتی تھی۔ قرآن اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ

(رعد: ۳۸)

(اور ہم نے (اے پیغمبر!) آپ سے قبل کئی پیغمبر بھیجے' ہم نے ان کو بیویاں بھی دیں اور اولاد بھی دی۔)

دوسری جگہ دیکھیے قرآن نے کس درجے صاف اور واضح الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا هُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خَالِدِيْنَ

(الانبیاء: ۸)

(اور ہم نے ان کے اس قسم کے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا کھائیں اور

یہ بات تھی کہ وہ ہمیشہ دنیا میں رہیں گے۔)

آگے اس کی مزید وضاحت ملاحظہ ہو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ط (الفرقان: ۲۰)

(اور تجھ سے پہلے جتنے پیغمبر ہم نے بھیجے' وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔)

یعنی وہ کوئی ایسی مخلوق نہ تھے' جنھیں ضروریات لاحق نہ تھیں اور دنیا کے کسی معاملے سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور وہ ہر وقت گھروں کی چار دیواری میں محصور رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی حوائج بھی رکھتے تھے' ان کا اکل و شرب کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا اور اگر بازاروں اور گلیوں میں جانے کی ضرورت پیش آتی' کوئی چیز خریدنا بیچنا مقصود ہوتی اور بیع و شرا کا معاملہ سامنے آتا تو یہ کام بھی وہ کرتے اور آزادی سے چلتے پھرتے تھے۔

## سلسلۂ تبلیغ کی وسعت:

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کی ہدایت کا سلسلہ وسیع تھا۔ اس نے پیغمبروں کی بعثت کو چند مقامات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ہر آبادی اور ہر بستی میں پیغمبر مبعوث فرمائے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ (النحل: ۳۶)

(اور ہم نے ہر امت میں یہ پیغام دے کر رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطانی کاموں کے ارتکاب سے بچو۔)

دوسری جگہ فرمایا:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس: ۴۷)

(ہر امت کا ایک رسول ہے۔)

نیز فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ (فاطر: ۲۴)

(جو امت بھی دورِ گزشتہ میں گزری ہے، ان میں کوئی راہ ہدایت دکھانے والا ضرور آیا ہے۔)

قرآن بار بار اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ دنیا کی ہر امت اور ہر گروہ میں کوئی نہ کوئی پیغمبر لازماً آیا ہے جس نے لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائی، ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی، انھیں امورِ خیر کی دعوت دی اور اعمال بد کے ارتکاب سے روکا اور برائی کے نتائج سے ڈرایا۔

تمام پیغمبروں اور اللہ کے فرستادوں کے ناموں سے اللہ نے کسی کو مطلع نہیں کیا بلکہ نبی ﷺ سے فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المومن: ۷۸)

(اور ہم نے آپ سے پہلے کتنے ہی رسول بھیجے، ان میں سے بعض وہ ہیں، جن کا حال ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دیا اور بعض وہ ہیں جن کا حال بیان نہیں کیا۔)

## فضیلت بین الرسل:

پیغمبروں کی وسیع فہرست میں بعض ایسے پیغمبر بھی ہیں جو اپنی بعض خصوصیات و اوصاف کی بنا پر بعض کی بہ نسبت مقام رفعت و فضیلت کے مالک ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط (البقرہ: ۱۵۳)

(یہ ہمارے پیغمبر ہیں، جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں کچھ تو ایسے تھے جن سے اللہ نے کلام کیا، بعض ایسے تھے، جن کے اس نے درجے بلند کیے۔)

قرآن کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ رسالت و نبوت کے لحاظ سے اگرچہ تمام رسل و انبیا کا

درجہ یکساں ہے' یعنی ان سب کو منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا' لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف درجات رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض سے اللہ نے براہ راست کلام کیا اور ان پر من جانب اللہ کتابیں نازل کی گئیں۔ پھر ان کے ادوار و حالات کے مطابق بعض معاملات میں ان کو رفعت و فضیلت کے مرتبۂ خاص سے نوازا گیا۔

## آنحضرت کے فضائل و درجات:

نبی ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں کے تذکرے میں ہم اس بات کے پابند ہیں کہ قرآن کے حدود میں مقید رہتے ہوئے یہ بتائیں کہ یہ کتاب ہدیٰ آپؐ کے بارے میں ہماری کیا رہنمائی کرتی اور ہمیں کن کن معلومات سے نوازتی ہے' تو آیئے ایک نظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن میں دیگر انبیاے کرام کا ذکر کس انداز میں کیا گیا ہے اور آنحضرت کا تذکرہ کس اسلوب میں فرمایا گیا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو لیجیے کہ وہ اولین انسان اور اولین پیغمبر ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ تعلیم الٰہی سے تمام ضروری اشیا کے ناموں سے انھیں مکمل آگاہی حاصل ہو گئی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ:۳۱)

(اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتا دیے۔)

یعنی انھیں سب اشیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی' بہ الفاظ دیگر وہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد قرار پائے۔

لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:۱۵۱)

(لوگو! یہ پیغمبر (ﷺ) تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان علوم سے تمھیں آگاہ کرتے ہیں' جن سے تم آگاہ نہ تھے۔)

اس آیت میں یہ صراحت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرتؐ کی حیثیت تمام دنیا کے معلم و استاذ کی ہے۔ یہاں جو "کتاب" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس میں اللہ کی طرف سے نازل شدہ تمام شرائع شامل ہیں اور "حکمت" کا لفظ ان تمام علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو انسانیت کے لیے مفید و کار آمد ہو سکتے ہیں۔ پھر یہاں "مَالَمْ تَكُوْنُوْا تعلَمُوْنَ" (جن سے تم آگاہ نہ تھے۔) کے چند الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہ کس درجہ جامع الفاظ ہیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے وہ تمام سرچشمے جو اس وقت دنیا میں موجود ہیں اور جو قیامت تک سطح ارض پر جلوہ گر ہوں گے، حضور ان سب کے معلم بن کر دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ بلاشبہ کتاب و سنت کو ان تمام علوم کے ماخذ و مصدر کی حیثیت حاصل ہے جو انسان کی دنیوی و دینی کامیابی و کامرانی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

دوسری جگہ آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰهٰ:۱۱۵)

(اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا، لیکن وہ بھول گیا۔)

یعنی ہم نے آدم سے بہشت کی ایک شے نہ کھانے کا عہد لیا تھا، لیکن وہ اپنا یہ عہد بھول گئے، انھیں نسیان ہو گیا اور انھوں نے وہ ممنوعہ شے کھالی۔

لیکن نبی ﷺ کے بارے میں اللہ وضاحت سے فرماتا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (الاعلیٰ:٦)

(ہم آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ بھولیں گے نہیں۔)

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ کا "مقری" خود اللہ تعالیٰ ہے جس نے آپ کو اپنے تمام احکام باقاعدہ پڑھائے اور وہ آپ کے قلب و ذہن میں پوری طرح محفوظ رہے۔ انھی احکام و شرائع سے آپ نے لوگوں کو آگاہ فرمایا۔

آدم علیہ السلام کے متعلق بارگاہ قدس سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ ان کے سامنے جھک جاؤ۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (البقرہ:۳۴)

(اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کے آگے سربسجود ہو جاؤ
چناں چہ وہ سربسجود ہو گئے۔)

اس کے مقابلے میں نبی ﷺ کے مرتبے کا قرآن ان الفاظ میں اعلان کرتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (الاحزاب: ۵۶)

(بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی
ان پر درود و سلام بھیجا کرو۔)

یعنی اگر اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سربسجود ہو جانے کو کہا تو آنحضرت کو یہ فضیلت مرحمت فرمائی کہ خود حریم قدس اور تمام ملائکہ کی طرف سے آپ کو درود و سلام کے تحفے بھیجے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم بھی اس کو اپنا معمول بنالو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ پوری دنیاے اسلام میں ہر آن جاری رہتا ہے۔ آج سے چودہ سو برس پہلے اس کا آغاز ہوا تھا، اور قیامت تک اس پر عمل ہوتا رہے گا۔ یہ ہے نبی ﷺ کی شان رفعت و عظمت!

۲۔ سلسلہ انبیا کے دوسرے نبی حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔۔۔ لیکن تبلیغ توحید کے باب میں ان کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس کے لیے انھیں بے حد جدوجہد کرنا پڑی اور بے شمار مصائب و آلام کی منزلوں سے ان کا کاروان حیات گزرا۔ نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کی طرف جو وحی کی گئی ہے یہ پہلی وحی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے بہت سے انبیا بھیجے ہیں اور ان کی طرف وحی کی ہے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (النساء
: ۱۶۳)

(اے پیغمبر! ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان
کے بعد نبیوں پر بھیجی۔)

یعنی وحی کی نوعیت اور کیفیت ایک ہی انداز کی ہے۔ سب نبیوں پر ایک ہی نہج سے سلسلہ

وحی جاری رہا۔

حضرت نوح کا شمار اولو العزم پیغمبروں میں ہوتا ہے اور آنحضرت بھی اسی مقدس زمرے میں شامل ہیں۔ چناں چہ قرآن کہتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝

(الاحزاب: ۷)

(اور اے پیغمبر! اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا تھا، اور وہ عہد خود تم سے اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے لیا تھا اور یہ نہایت مضبوط عہد تھا۔)

اپنے دور، اپنی تگ و تاز، مقاصد نبوت کی تبلیغ اور اس کے نتیجے میں مشکلات و آلام سے دوچار ہونے اور انتہائی پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کے اعتبار سے یہ پانچوں (جن کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے۔) اولوالعزم پیغمبر تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت نوح نہایت اولو العزم پیغمبر ہیں، اور پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے دنیا میں اللہ کی توحید کا اعلان کیا اور اس کی تبلیغ کے لیے کمربستہ ہوئے، لیکن ان کی بعثت صرف ان کی قوم کی طرف ہوئی۔ قرآن کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (الاعراف: ۵۹)

(ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔)

لیکن نبی ﷺ کے بارے میں جو تمام انبیا علیہم السلام کے بعد مبعوث فرمائے گئے، ارشاد ہوا کہ ان کا دائرۂ نبوت تمام دنیا کے لوگوں پر محیط ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف: ۱۵۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں میں اعلان کردو کہ اے افراد نسل انسانی، میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام بن کر آیا ہوں۔)

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سباء:۲۷)

(اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام نوع انسانی کی طرف سچائی کی خوش خبری سنانے اور برائی کی قباحتوں سے ڈرانے کے لیے بھیجا ہے۔)

نیز فرمایا:

وَاَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا○ (نساء:۷۹)

(اے پیغمبر! ہم نے تمھیں لوگوں کے پاس اپنا پیام بر مقرر کر کے بھیجا ہے‘ تمھارے اس منصب بلند کے لیے اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔)

پیغام بر کے علاوہ آپؐ لوگوں کے لیے رحمت و رأفت کا باعث بھی ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (انبیاء:۱۰۷)

(اور اے پیغمبر! ہم نے تجھے صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔)

۳۔ حضرت ادریس علیہ السلام کا شمار انبیاء علیہم السلام کی اولین جماعت میں ہوتا ہے اور ان کو صداقت شعار نبی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا○ (مریم:۵۶)

(وہ پیکر سچائی نبی تھے۔)

لیکن نبی ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ (الزمر:۳۳)

(وہ ذات اقدس جو سچائی لے کر دنیا میں تشریف لائے۔)

حضرت ادریس کے متعلق فرمایا:

وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم:۵۷)

(اور ہم نے انھیں بڑے اونچے مقام تک پہنچا دیا تھا۔)

اس کے مقابلے میں نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الم نشرح: ۴)

(اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔)

بلاشبہ نبی آخر الزمان کا ذکر چار دانگ عالم میں بلند کیا گیا اور مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک تمام روئے زمین پر آپ کا ذکر کیا جارہا ہے اور تا قیام قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

۴۔ حضرت ابراہیم اولو العزم پیغمبر تھے۔ جب انھوں نے اپنی قوم کے بتوں کو کلہاڑے سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو قوم کے سرکردہ لوگوں نے انھیں آگ میں ڈال دینے کا فیصلہ کیا۔ فیصلے کے مطابق آگ میں ڈال دیے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا:

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ ○ (انبیاء: ۶۹)

(ہمارا حکم ہوا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کو سلامتی سے ہم کنار کر۔)

یعنی اتنی ٹھنڈی بھی نہ ہو کہ اس کی ٹھنڈک ابراہیم کی برداشت سے باہر ہو جائے۔ اعتدال کے دائرے میں رہ۔! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس کے مقابلے میں نبی ﷺ کی حالت ملاحظہ ہو کہ دشمنان اسلام آپؐ سے لڑائی کی آگ بھڑکاتے تھے تو اللہ ایسے حالات پیدا کر دیتا تھا کہ آتش جنگ سرد پڑ جاتی تھی۔ قرآن کے الفاظ میں یوں کہیئے کہ:

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (المائدہ: ۶۴)

(وہ جب بھی لڑائی کی آگ سلگا دیتے ہیں، اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔)

حضرت ابراہیم کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا (انبیاء: ۵۸)

(انھوں نے اپنی قوم کے مشرکوں کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔)

نبی ﷺ کی کوششوں کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○

(بنی اسرائیل: ۸۱)

(اے پیغمبر! اعلان کر دو کہ حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا، اور باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔)

پھر خوئے ابراہیم کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ (التوبہ: ۱۱۴)

(بلاشبہ ابراہیم بہت ہی نرم دل اور بے حد بردبار تھے۔)

اب نبی ﷺ کے بارے میں قرآن کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے پیغمبر! یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے۔ اگر تم سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تمھارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔)

۵۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیئے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی وفات سے قبل ان کے والد وفات پا چکے تھے۔ نہ حضرت موسیٰ کی ولادت کے وقت ان کا کہیں ذکر آتا ہے، نہ انھیں تابوت میں بند کرنے کے موقعے پر ان کا کہیں تذکرہ ہوتا ہے اور نہ تابوت کو دریا میں ڈالنے کے وقت ان کا کہیں پتا چلتا ہے اور نہ موسیٰ کی تربیت، یہاں تک کہ قبطی کے قتل کے بعد ان کے مصر سے نکل جانے کے موقعے پر ان کا کہیں سراغ ملتا ہے۔ ان میں سے اکثر مواقع پر ان کی والدہ کا ذکر ہی آتا ہے یا ان کی بہن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھائی کی خبر کے لیے فرعون کے گھر گئی تھیں۔ والد کا کہیں نام نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے والد ان کی ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔

اگر یہ صحیح ہے اور حضرت موسیٰ واقعی یتیمی کی حالت میں پیدا ہوئے تھے تو حضرت محمد مصطفیٰ

ﷺ کی یہ خصوصیت ان سے ملتی ہے کہ آپ بھی دنیا میں تشریف لانے سے پیشتر ہی یتیم ہو گئے تھے اور آپ کے والد عبداللہ آپ کی ولادت سے پہلے وفات پا گئے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کی تربیت و پرورش آسیہ کے گھر ہوئی تھی (جو فرعون کی بیوی تھیں) نبی ﷺ کی تربیت و پرورش کا ابتدائی دور بھی ایک خاتون حلیمہ سعدیہ کے گھر میں ان کے زیر شفقت گزرا۔

موسیٰ علیہ السلام بھی قبطی کے قتل ہو جانے کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے مخالفوں سے بچ کر مصر سے نکل گئے تھے' اور حضرت شعیب کے پاس مدین پہنچ گئے تھے۔ نبی ﷺ بھی ہجرت کے موقع پر مکے سے مخالفین کے محاصرے سے بچ کر غار ثور میں چلے گئے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام میں دیانت و امانت اور امداد و اعانت کے جوہر پا کر حضرت شعیب کی بیٹی نے باپ سے کہہ کر انھیں اپنے گھر آنے کی درخواست کی تھی اور پھر گھریلو معاملات ان کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ بعد ازاں حضرت موسیٰ کی صلاحیت اور صالحیت کی وجہ سے وہ ان کے عقد میں آ گئی تھیں۔

اسی طرح حضرت خدیجہ نے بھی نبی ﷺ کی امانت و دیانت اور صداقت شعاری سے متاثر ہو کر اپنا کاروبار آپ کے سپرد کر دیا تھا' اور پھر آپ سے رشتہ ازدواج قائم کر لیا تھا۔ اس طرح بہت سی باتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ میں اشتراک پایا جاتا ہے' اور قرآن سے اس کا ثبوت ملتا ہے'

۶۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اولو العزم پیغمبر تھے۔ ان کے اور آنحضرتؐ کے بارے میں بھی چند باتوں کا تذکرہ دلچسپی کا باعث ہو گا۔

قرآن حکیم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کی نانی نے ان کی والدہ مریم صدیقہ کی پیدائش کے وقت یہ دعا کی تھی۔

إِنِّيٓ أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (آل عمران: ۳۶)

(میں اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں' ہوں کہ شیطان رجیم سے محفوظ

رہے۔)

نبی ﷺ کو بھی استعاذہ کے متعلق بارگاہ خداوندی سے یہی تعلیم دی گئی۔ ارشاد ہوا:

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (المومنون: ۹۷، ۹۸)

(اے پیغمبر! تیری دعا ہمارے حضور یہ ہونی چاہیے کہ خدایا میں شیطانی وسوسوں سے تیرے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ میں اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان میرے پاس آئیں۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کا بہترین انتظام فرمایا:

وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (المومنون: ۵۰)

(اور ہم نے ان کو ایک مرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھا۔)

اس آیت کا اشارہ اس زمانے کی طرف ہے جب حضرت مسیح عہد طفولیت میں تھے اور تمام لوگ ان کی اور ان کی والدہ (مریم) کی مخالفت کر رہے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس نازک موقعے پر ان کی مدد فرمائی۔

نبی ﷺ پر بھی عہد طفولیت آیا تھا اور آپ یتیمی کی حالت میں تھے۔ آپ کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (الضحیٰ: ٦)

(کیا اس (اللہ) نے آپ کو یتیم نہیں پایا تھا، پھر اس نے جگہ دی۔)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا تھا۔

اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا (مریم: ۳۰)

(میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔)

حضرت عیسیٰ نے تو خود ہی کہا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے کتاب دی گئی ہے اور منصب

نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے، لیکن نبی ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے انھیں کتاب عطا فرمائی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (الکہف: ۱)

(تمام ستائشیں اللہ کے لیے ہیں، جس نے اپنے بندے پر "الکتاب" اتاری (یعنی قرآن مجید نازل کیا) اور اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔)

آگے فرمایا: قَيِّمًا یعنی بالکل سیدھی اور صاف باتیں اس میں درج ہیں۔ ہر قسم کے پیچ و خم سے قطعاً پاک۔!

حضرت عیسیٰ کا اپنے بارے میں فرمان ہے:

وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ (مریم: ۳۱)

(اس نے مجھے بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔)

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں اور نبی ﷺ کو حکم دیتا ہے:

فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ

(نور: ۶۱)

(تم اپنے لوگوں پر سلام بھیجو، یہ ایک مبارک اور پاکیزہ دعا ہے جو اللہ کی طرف سے ٹھہرا دی گئی ہے۔)

اس نقطہ نظر کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضرت مسیح اور نبی ﷺ کے بارے میں اور بھی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت یعقوب، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت شعیب، حضرت صالح، حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے متعلق بہت سی آیات مل سکتی ہیں، جن سے نہایت آسانی سے یہ پتا چل سکتا ہے کہ ان میں اور نبی ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں میں کہاں کہاں اشتراک پایا جاتا ہے۔

یہ بھی قرآن کی روشنی میں آنحضرت کی زندگی کا ایک پہلو ہے جو قارئین کے سامنے آتا ہے۔

## (۲۱)

# آخرت

قرآن نے آخرت کا جو تصور پیش کیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا ہے اور دنیا کا یہ کارخانہ جو کروڑوں سال سے ایک خاص رفتار کے ساتھ چل رہا ہے بلاوجہ نہیں ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

(المومنون: ۱۱۵)

(کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں بے کار کو پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں۔)

یہ دنیا چند روزہ ہے اور عارضی ہے۔ اصل ٹھکانا وہی ہے جو موت کے بعد کا ہے اور آخرت کا ہے۔ وہ ٹھکانا ہمیشگی کا ہے۔ یہاں کا تمام سروسامان جو انسان شب و روز کی تگ و تاز کے بعد جمع کرتا ہے' یہیں رہ جائے گا۔ اصل وہی ہے جو خیرات و حسنات کی صورت میں انسان آگے بھیجتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس دنیا کی محبت میں تم پھنسے ہوئے ہو' اس کے فوائد تو بہت کم ہیں۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ (النساء: ۷۷)

(اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ دنیا کا سرمایہ تو بہت ہی تھوڑا ہے' اور جو شخص اللہ سے ڈرا' اس کے لیے آخرت ہی کا اصل سرمایہ ہے۔)

دوسری جگہ قرآن نے مزید وضاحت فرمائی۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (الانعام: ۳۲)

(اور دنیا کی زندگانی تو کچھ نہیں ہے' صرف ایک کھیل اور تماشہ ہے' متقی لوگوں کے لیے تو آخرت کا گھر ہی بہتر ہے۔ کیا تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔)

جن لوگوں نے آخرت کی زندگی کو بھلا دیا ہے اور دنیا کے معاملات ہی کو اپنا نقطہ حیات قرار دے لیا ہے' قرآن ان کو سخت الفاظ میں تنبیہہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (التوبہ: ۳۸)

(کیا تم آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی پر ریجھ گئے ہو؟ یاد رکھو! دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلے میں تھوڑا سا فائدہ اٹھا لینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔)

دنیا میں اللہ نے انسان پر کچھ ذمے داریاں عائد کی ہیں۔ وہ ذمے داریاں اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہیں کہ انسان دنیا کی زندگی کامل احتیاط کے ساتھ بسر کرے اور جو قدم اٹھائے سوچ سمجھ کر اٹھائے۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے' کسی کے حقوق تلف نہ کرے' ہر قسم کی برائی سے دامن کشاں رہے' ہر شخص کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھے۔ دنیا کے مال و منال کو آخرت پر ترجیح نہ دے۔۔۔ ہم روز مرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ دنیا کو مقدم رکھتے اور اس کے عارضی فوائد کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ قرآن اس سے روکتا ہے اور وہ آخرت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔"

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ○

(اعلیٰ: ۱۶' ۱۷)

(تمھارا معاملہ یہ ہے کہ تم دنیا کی زندگی کو اصل اہمیت دیتے ہو' حالاں کہ آخرت ہی بہتر اور پائیدار ہے۔)

اللہ کے نزدیک وہی لوگ لائق احترام اور شائستۂ التفات ہیں جو آخرت کو اپنا مطمح نظر ٹھہراتے ہیں اور دنیا میں جو کام کرتے ہیں' اس میں ان کا اصل مقصد آخرت کی زندگی سنوارنا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو بارگاہ خداوندی میں بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ

سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۱۹)

(اور جو شخص آخرت کا طالب ہوا اور اس کے لیے جیسی کوشش کرنی چاہیے' وہ کی اور وہ ایمان دار ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔)

آخرت کی کامرانی درحقیقت ان لوگوں کے لیے ہے جو دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرتے ہیں' کسی کو پریشان نہیں کرتے' کسی کو مظالم کا نشانہ نہیں بناتے' لوٹ مار' غصب و نہب اور قتل و غارت کے مرتکب نہیں ہوتے' جن کے تمام اوقات لوگوں کی بھلائی کے متعلق سوچ بچار میں گزرتے ہیں' دنگا فساد سے خود بھی دور رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (القصص:۸۳)

(یہ آخرت کا گھر ہم انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو ملک میں ظلم و فساد پھیلانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ نیک انجام دراصل پرہیزگاروں ہی کا ہے۔)

آخرت میں جب اعمال نامے پیش کیے جائیں گے تو بدکار لوگوں کو اپنی ان برائیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا جن کا ارتکاب وہ دنیا میں کرتے رہے' اور نیک لوگوں کے لیے اللہ کی رضامندی اور مغفرت کے دروازے کھلے ہوں گے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ (الحدید:۲۰)

(اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور خوش نودی ہے۔)

یعنی وہاں دو قسم کے لوگ ہوں گے' ایک وہ جو شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے اور دوسرے وہ جو اللہ کی رضا اور اس کی عطا فرمودہ نعمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔

دوسری جگہ قرآن نے یہ نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے' ان میں دنیا اور آخرت کی پوری تصویر انسان کے سامنے پیش کر دی ہے۔

> كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ○ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ○ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ○ (القیامہ: ۲۰۔۔۔۲۵)
>
> (کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے' اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے' اور کتنے ہی چہرے اس دن اداس ہوں گے' خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑنے والی سختی کی جائے گی۔)

نبی ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کو برائیوں سے روکنا اور اچھائی کی راہ پر گام زن کرنا تھا اور آپؐ تمام عمر یہ فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ قرآن نے مختلف مقامات میں اس کی پوری وضاحت کر دی ہے۔

* * *

## (۴۲)

# اعمال صالحہ

انسان کا اصل سرمایہ اعمال صالحہ ہیں جو دنیا اور آخرت میں اس کے لیے فائدہ مند ہو سکتے ہیں، اور وہی اعمال اس کے لیے فلاح و کامرانی کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ○ (روم: ۴۴)

(اور جنھوں نے اچھے عمل کیے تو وہ اپنا لیے بہتر سامان پیدا کر رہے ہیں۔)

اعمال صالحہ اور امور خیر کو اپنا مطمح نظر ٹھہرانا بنی نوع انسان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جو شخص اسے اپنا فریضہ حیات قرار دیتا ہے، وہ دراصل اپنے ہی مستقبل کے لیے راہ نجات تلاش کرتا ہے اور جس نے اس کے برعکس عمل کیا اور نیکی چھوڑ کر برائی کا مرتکب ہوا، اس نے اپنا ہی نقصان اٹھایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (حٰمٓ السجدہ: ۴۶)

(جو شخص نیک کام کرتا ہے تو اپنے ہی لیے کرتا ہے اور برائی کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہے۔)

اللہ نے دونوں راستے اس کے سامنے واضح کر دیے ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ اب اسے اختیار ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○ (البلد: ۱۰)

(اور ہم نے اسے دونوں راہیں دکھا دیں۔)

سعادت کی راہ بھی اسے صاف نظر آ رہی ہے اور شقاوت کی بھی۔ اب اسے کامل اختیار ہے کہ جس راہ کو چاہے اپنے لیے منتخب کر لے۔ سعادت کی راہ دنیا و آخرت میں فوز و فلاح کی راہ ہے اور شقاوت کی راہ خسران اور ناکامی کی راہ ہے۔۔۔۔ انسان بالعموم دنیا کی زندگی اور عاجل

مفادات کا طالب ہوتا ہے' جب کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کے فوائد پسندیدہ ہیں اور وہ انسان کو انہی کے حصول کی ترغیب دیتا ہے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے جو نہایت مختصر بھی ہیں اور جامع بھی۔۔۔!

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ (الانفال: ٦٧)

(تم دنیا کی متاع کے آرزو مند ہو اور اللہ تمھیں آخرت کے فوائد سے بہرہ مند کرنا چاہتا ہے۔)

اللہ نے انسان کو یوں ہی نہیں چھوڑ رکھا ہے۔ وہ برائی یا نیکی جو کچھ بھی کرتا ہے' اس کی پوری روداد معرض کتابت میں لائی جاتی ہے اور اس پورے ریکارڈ کو حشر کے روز ہر انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (الجاثیہ: ۲۹)

(یہ ہماری کتاب ہے' جو تمھارا نامہ اعمال ہے' اور یہ تم پر ٹھیک شہادت دے رہا ہے۔ جو کچھ تم کرتے تھے' اسے ہم لکھواتے جاتے تھے۔)

اعمال صالحہ کی فہرست بڑی وسیع ہے۔ اس میں صبر' شکر' توکل' اخلاص' صدق مقال' ایفائے عہد' انصاف' حسن قضا' تواضع' انکسار' عذوبت لسان' عفو' قناعت' سخاوت و جودت' احسان' ایثار' مساکین و یتامیٰ کی مدد' اعزہ و اقارب سے حسن سلوک' والدین کی خدمت' پڑوسیوں سے اچھے مراسم وغیرہ بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ پھر کذب و افترا' بہتان طرازی' ریاکاری' خوشامد' تکلف' رشوت' سود خوری وغیرہ امور سے بچنا۔ یہ سب چیزیں اعمال صالحہ کے لازمی اجزا ہیں۔ جس شخص نے ان پر عمل کیا' وہ معاشرے کا صالح فرد اور نیک ترین رکن ہے۔ صبر کے بارے میں قرآن نے بار بار تاکید کی ہے۔ فرمایا:

وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (انفال: ۴۶)

(صبر کرو' اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔)

یعنی مصیبت اور تکلیف کے وقت صبر کرنا مسلمان کے فرائض کا حصہ ہے۔ صبر کرنے والوں کو اللہ نے متقین میں شمار کیا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (ہود: ۴۹)

(صبر کر' انجام کار متقیوں ہی کے لیے ہے۔)

اللہ کا ہر حالت میں شکر بجالانے والوں کے لیے فرمایا:

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۷۲)

(اور اگر تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر کرو۔)

یہاں شکر کو اللہ کی عبادت کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح توکل کو مومن کی علامت قرار دیا۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (المائدہ: ۲۳)

(اگر تم ایمان دار ہو تو اللہ پر بھروسا کرو۔)

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ تم جو نیک عمل بھی کرو' وہ صرف اللہ کی رضا و خوش نودی کے لیے کرو۔ اللہ کے بندوں کا یہی شیوہ ہے کہ ان کے ذہن میں ہر وقت اللہ کی رضا کے حصول کا جذبہ موجزن رہتا ہے' چناں چہ ان کے اس جذبے کی تحسین کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا:

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ط (البقرہ: ۲۷۲)

(اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو' وہ فقط اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہے۔)

صدق مقال کے لیے فرمایا کہ جو شخص سچی بات کرتا اور راست گوئی سے کام لیتا ہے' وہ مومن ہے اور اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ: ۱۱۹)

(مسلمانو! خدا سے ڈرتے رہو اور سچ بولنے والوں کے ساتھی بنو۔)

ایفائے عہد کے بارے میں ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ط (المائدہ:۱)

(مسلمانو! اپنے عہد پورے کرو۔)

انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے متعلق نبی ﷺ سے فرمایا:

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (الاعراف:۲۹)

(کہہ دو! میرے پروردگار نے مجھے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔)

اسی طرح قرآن مجید نے مختلف مقامات پر دیگر بہت سے امور خیر سرانجام دینے کا حکم دیا ہے۔

* * *

## (۲۳)

# واقعہ معراج

نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کے واقعات میں سے ایک نہایت اہم واقعہ معراج کا ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

> سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ (بنی اسرائیل: ۱)
>
> (پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں پھیلا رکھی ہیں تاکہ ہم انھیں اپنی قدرت کے نمونے دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔)

معراج کا واقعہ ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ اور بہت بڑا معجزہ ہے، جس میں ایمان و اعتقاد کے تمام اوصاف سمٹ آئے ہیں۔ اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ نے انسان کو کتنی بڑی فضیلت سے نوازا ہے اور اسے کس قدر بلند مقام عطا فرمایا ہے۔

معراج کے باب میں سب سے پہلا سوال سطح ذہن پر یہ ابھرتا ہے کہ اس کی اصل حیثیت و کیفیت کیا ہے؟ کیا یہ خواب یا کشف کا معاملہ تھا یا نبی ﷺ واقعی جسمانی طور پر اوپر گئے تھے اور راستے کی تمام مشکلات کو عبور اور ہر قسم کے مواقع کو دور کرتے ہوئے بہ نفس نفیس آسمان تک پہنچے تھے؟

اس سوال کا جواب دونوں طرح دیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ محض کشف و رویا اور ف وخیال کا معاملہ تھا اور یہ بھی کہ یہ واقعتہ جسم و جان کا سلسلہ تھا اور آنحضرت حالت بے داری میں اور اپنی اصلی ہیئت میں وہاں پہنچے تھے اور ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے

آسمان سے گزرتے ہوئے ساتویں آسمان تک آپؐ نے پرواز کی تھی۔ جمہور علمائے سلف کا یہی عقیدہ ہے اور وہ اسی کو مبنی بر حقیقت قرار دیتے ہیں۔

دل لگتی بات یہی ہے کہ معراج کے واقعہ کا تعلق جسمانی صورت سے ہے، ورنہ کشف و رویا اور فکر و خیال کی شکل میں آسمان کی سیر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔۔۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ خواب میں انسان کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، جس کا عالم بے داری میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ادھر آنکھ کھلی اور ادھر بات ختم ہوئی۔

خواب میں زمین اچھل کر آسمان سے ہم کنار ہو جاتی ہے اور آسمان اپنی تمام بلندیوں کے باوجود جھک کر زمین کی سطح پر آ جاتا ہے، پہاڑ سمٹ کر رائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور رائی پھیل کر پہاڑ کی جگہ لے لیتی ہے۔ لیکن اس سے کیا حاصل۔۔۔!

اصل معاملہ تو بے داری کا ہے اور قرآن نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا ہے اور کتب حدیث میں جس اسلوب میں اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ واقعہ حالت نوم میں نہیں، حالت بیداری میں پیش آیا اور حضور جسد عنصری کے ساتھ آسمانوں پر گئے۔ اگر اس کا تعلق کشف و رویا سے ہوتا تو مخالفین اسلام ہرگز اس پر تعجب کا اظہار نہ کرتے۔ ان کا اس پر تعجب کرنا یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ حضور بہ نفس نفیس آسمان پر گئے اور ان تمام حالات سے آپ کو واسطہ پڑا، جن کا تذکرہ تفسیر و حدیث اور سیرت کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔

مختلف آسمانوں میں بعض پیغمبروں سے ملاقات کرنا، بہت سے خوف ناک اور مسرت انگیز مناظر دیکھنا، بعض صحابہ کے عمل و کردار کا مشاہدہ کرنا اور اللہ کی طرف سے کچھ احکام سننا، یہ سب چیزیں اس پر دلالت کناں ہیں کہ معراج جسمانی تھا۔

یہی وجہ ہے کہ کفار نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ازراہ استہزا حضرت ابوبکر صدیق سے کہا تھا کہ اب بتایئے اپنے ممدوح کے بارے میں آپ کے تعلق عقیدت کا کیا حال ہے، جب کہ وہ ساتوں آسمانوں تک پرواز کا دعویٰ کرنے لگے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ انھیں اللہ سے براہ

راست ہم کلامی کا موقع ملا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کے اس طنز و استہزا کے جواب میں فرمایا کہ مجھے تو ان کے اس دعوے پر ہرگز کوئی تعجب نہیں ہوا' جب میں نے ان کے دعوائے نبوت کو صحیح مان لیا جو سب سے مشکل کام ہے تو اس کے بعد وہ جو کچھ کہیں گے' میرے نزدیک ہر اعتبار سے صحیح اور قابل تسلیم ہو گا۔ میں یہ دل و جان سے مانتا ہوں کہ ان کا سینہ مہبط وحی ہے اور جبریل ان کے پاس اللہ کے احکام لے کر آتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ سے صبح و شام ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب میں نے اتنے بڑے اشکال کو مان لیا اور اس بہت بڑے استحالہ کے سامنے گردن جھکا دی تو معراج کے بارے میں کون سی ایسی اہم بات درپیش ہے کہ میں اس پر غور کروں۔

معراج میں نبی ﷺ کا بیت اللہ سے مسجد اقصیٰ تک جانا اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے کہ وہاں کی سرحدوں تک اسلام پھیلے گا۔ انبیا علیہم السلام کی امامت کرانے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت کا مقام و مرتبہ انتہائی بلند ہے۔ اس موقع پر شراب کی بجائے دودھ کی طرف ہاتھ بڑھانے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا مزاج فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معراج کب ہوا؟ اس کے متعلق سیرت کی کتابوں میں سیرت نگاروں کے مختلف اقوال مندرج ہیں' جو اس طرح ہیں۔

○ جس سال آپ کو منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا' اسی سال معراج کا واقعہ پیش آیا۔

○ نبوت کے پانچویں سال معراج ہوئی۔

○ نبوت کے بارھویں سال رمضان کے مہینے میں معراج ہوئی۔ یہ ہجرت سے سولہ مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔

○ نبوت کے تیرھویں سال ماہ محرم میں معراج ہوئی۔ یعنی ہجرت سے ایک سال دو مہینے پہلے۔

○ نبوت کے تیرھویں سال ماہ ربیع الاول میں یعنی ہجرت سے ایک سال پہلے واقعہ معراج پیش آیا۔

○ بلاشبہ سیرت نبویؐ کا یہ بہت بڑا واقعہ ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ نماز کا حکم شب

معراج ہی کو ہوا۔

بہرحال واقعہ معراج کا تعلق خواب یا کشف سے نہیں ہے، خواب کا ہوتا تو منکرین اسلام حضرت ابوبکر صدیق سے طنز و استہزا کے انداز میں ہرگز اس کا تذکرہ نہ کرتے۔ وہ خواب اور بے داری کی کیفیات سے خوب آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ دونوں میں فرق کی نوعیت کیا ہے۔

* * *

## (۲۴)

# ہجرت

نبی ﷺ کی زندگی کا بہت بڑا اور اہم واقعہ ہجرت ہے۔ آپ تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہے اور تیرہ سال کی یہ طویل مدت آپ نے اور آپ کے صحابہ نے جس تکلیف سے گزاری اس کی تفصیلات اسلامی تاریخ کی تمام کتابوں میں مرقوم ہیں اور لوگوں کے علم میں ہیں۔

اس اثنا میں مدینہ منورہ میں اسلام کی آواز پہنچی تو مختلف اوقات میں وہاں کے لوگوں نے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہونا اور اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح آپؐ کی صدائے حق مکے سے باہر دور تک پھیل گئی۔ باشندگان مدینہ خاص طور پر آپ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور انھیں اسلامی احکام سے مطلع کرنے کی غرض سے بعض صحابہ کو آپؐ نے وہاں بھیجا۔ لیکن ادھر مکے میں جو مسلمان موجود تھے' وہ بے حد اذیت ناک دور سے گزر رہے تھے اور وہ پکار اٹھے تھے۔

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (النساء . ۷۵)

(اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال' جہاں کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کار ساز بنا دے اور کسی کو ہماری مدد کر لیے کھڑا کر دے۔)

چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسی صورت پیدا کر دی جو نہایت موثر ثابت ہوئی۔ مسلمانوں نے بھی اس کی وجہ سے بے حد ارتقا کی منزلیں طے کیں اور اسلام کی آواز بھی چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کا حکم دیا اور آپ نے اس کے لیے تیاری شروع کر دی۔ صحابہ اچھی خاصی تعداد میں وہاں پہنچ گئے تھے اور یہ شہر اسلامی تعلیم کے مرکز

کی حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔

ایک دن خود آنحضرت نے بھی سفر ہجرت کا عزم فرما لیا۔ حضرت ابوبکر آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ قریش نے آپؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اللہ نے قریش کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور آپؐ مدینے کو روانہ ہوئے۔ مکے سے نکل کر سب سے پہلے غار ثور میں قیام کیا۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور لوگ اس کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ قریش کے لوگوں نے آنحضرت کو گھر میں دیکھا، بیت اللہ میں تلاش کیا۔ اور بھی مختلف مقامات پر آپ کا سراغ لگانے کی کوشش کی، کہیں سے کچھ پتا نہ چلا۔

قرآن نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ط
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ (الانفال: ۳۰)

(اس وقت کو یاد کرو جب کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیریں کر رہے تھے، تاکہ تجھے گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ ہی بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔)

یعنی اللہ نے اس وقت نبی ﷺ کو کافروں کی سازشوں سے بچایا اور آپ غار ثور میں چلے گئے۔ آپؐ کا سراغ لگاتے ہوئے کافروں کے بعض افراد بھی وہاں پہنچ گئے اور جا کر غار کے دھانے پر کھڑے ہو گئے۔ آپ غار کے اندر بیٹھے ہیں اور دشمن باہر کھڑے ہیں۔ اس وقت اللہ نے آپ کی مدد فرمائی۔ قرآن اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي
الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ
سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(التوبہ: ۴۰)

(اللہ نے اپنے رسول کی اس وقت مدد کی جب کافروں نے اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ وہ دو میں دوسرا تھا اور دونوں غار میں بیٹھے تھے۔ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ اپنے ساتھی سے کہا تھا غم گین نہ ہو' یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنھیں تم نہیں دیکھتے اور بالآخر کافروں کی بات پست کی' اور اللہ ہی کا کلمہ ہے جو کہ بلند ہے' اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔)

آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ غار ثور میں دو شخص موجود تھے۔ ایک آنحضرت اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیق۔۔۔۔۔ حضرت ابوبکر صدیق چوں کہ سب سے زیادہ آنحضرت سے تعلق و قرب رکھتے تھے اور وہ پہلے مسلمان بھی تھے' اس لیے ہر موقع پر آپ کی ہم دردی اور نصرت ان کے پیش نگاہ رہتی تھیں۔ غار ثور میں آکر بھی انھوں نے اس قلبی لگاؤ کو ملحوظ رکھا۔ غار کو صاف کیا اور اس کے تمام سوراخ بند کیے تاکہ کہیں سے کوئی موذی شے نکل کر آنحضرت کو تکلیف پہنچانے کا باعث نہ بنے۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ دشمن تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچ گیا ہے اور غار کے دھانے پر کھڑا ہے تو قدرتی طور پر انھیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں آپ کو کسی اذیت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آنحضرت کو جب ان کے اس اضطراب کا احساس ہوا تو قرآن کہتا ہے کہ آپ نے ان کی اس ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے فرمایا:

لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ: ۴۰)

(گھبرانے کی ضرورت نہیں' اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہمیں دشمن کی گرفت میں نہیں آنے دے گا۔)

یہ پہاڑ جس کے غار میں آپ تشریف فرما تھے' مکے سے چھے میل کے فاصلے پر تھا اور تین راتیں آپؐ نے اس میں بسر کی تھیں۔ ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ غار پر کھڑے ہوئے اعدائے حق کی صدائیں ان حضرات کے کانوں میں آنے لگی تھیں۔ ایسی حالت میں حزن و اضطراب کی کیفیت طاری ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

خطرہ دور ہوا اور اضطراب کی کیفیت رفع ہوئی تو دونوں غار سے نکل کر مدینے کو روانہ ہو گئے۔ وہاں جاتے ہی صورت حال بدل گئی اور مدینہ مسلمانوں کا مرکز قرار پاگیا اور اسی مقام پر اسلام کی اولین حکومت قائم ہوئی۔

کہنا چاہیے کہ ہجرت مسلمانوں کے ارتقا کی تمہید اور ان کی کامرانیوں کے نقطۂ عروج تک پہنچنے کی پہلی منزل تھی۔

ہجرت کے بعد نبی ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات اور بھائی چارہ قائم کر دیا اور ان میں قلبی محبت پیدا ہو گئی۔ یہ اللہ کا احسان تھا جو ان پر ہوا۔ قرآن کہتا ہے:

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا۔ (آل عمران: ۱۰۳)

(اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی اور تم اس کے اس فضل کی وجہ سے بھائی بھائی ہو گئے۔)

* * *

## (۲۵)

# تحویل قبلہ

واقعات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سے ایک عظیم واقعہ تحویل قبلہ کا ہے۔ مکہ مکرمہ میں نبی ﷺ کے سامنے یہ اہم مسئلہ تھا کہ کس طرف رخ کرکے نماز پڑھی جائے۔ بیت اللہ کی طرف یا بیت المقدس کی طرف۔۔۔۔ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ اور توحید ربانی پہلا گھر تھا اور اسی گھر میں خدا پرستی کا آغاز ہوا تھا۔

> اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ○ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ (آل عمران: ۹۶، ۹۷)

(بلاشبہ پہلا جو گھر لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ یہی ہے جو مکے میں ہے، برکت والا اور تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے۔ جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا، وہ امن و حفاظت میں آگیا۔)

یعنی عبادت ربانی اور یاد الٰہی کا اولین مرکز اور سب سے پہلی عبادت گاہ۔۔۔ اس کے دروازے پر پہنچتے اور اس کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی، بدامنی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور امن و سلامتی کا سایہ انسان کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔

لیکن آنحضرت کی عادت مبارکہ تھی کہ جب تک کسی معاملے میں اللہ کی طرف سے واضح حکم نہ آجاتا، اس وقت تک آپ اہل کتاب کے عمل کے مطابق عمل فرماتے۔ چناں چہ آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے کہ یہ اہل کتاب کا قبلہ تھا۔

ہجرت کے بعد نبی ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے۔ بیت المقدس بھی (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) مقدس و مطہر جگہ ہے اور انبیا علیہم السلام کا قبلہ اول۔ مقام امن و بابرکت۔ معراج کی رات کعبۃ اللہ سے چل کر

نبی ﷺ کی پہلی منزل وہی جگہ تھی، جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ۔ (بنی اسرائیل: ۱)

(پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام میں مسجد اقصیٰ تک کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے، سیر کرائی۔)

سولہ سترہ مہینے آپؐ نے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی۔ اس کے بعد اللہ کی طرف سے بیت اللہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم ہوگیا تو آپ اس پر عمل کرنے لگے۔ اس پر یہود و نصاریٰ وغیرہ نے کہنا شروع کیا کہ یہ عجیب معاملہ ہے، بیت المقدس پہلے انبیا کا قبلہ تھا، اسے ترک کرکے یہ لوگ بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اور انھوں نے قبلہ اول کو کس بنا پر ترک کردیا ہے؟

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ: ۱۴۲)

(جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں، وہ کہیں گے، مسلمان جس قبلے کی طرف رخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا؟ اے پیغمبر! تم کہو کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہے۔)

مطلب یہ کہ اللہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں، پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا، اب بیت اللہ کی طرف ہوگیا۔ دونوں جہتیں اللہ کی ہیں اور وہ جو چاہے کرتا ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اللہ کی طرف سے حکم ہو تو بیت اللہ کو قبلہ ٹھہرالیا جائے جو کہ حضرت ابراہیم کا بنا کردہ ہے اور مقام توحید ہے۔ قرآن آپ کی اس خواہش و تمنا کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا

(البقرہ: ۱۴۴)

(اے پیغمبر! ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمھارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھتا ہے' یقین کرو ہم عن قریب تمھارا رخ ایک ایسے ہی قبلے کی طرف پھرا دینے والے ہیں' جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے تحویل قبلہ کا حکم دے دیا اور فرمایا اب وقت آگیا ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط۔ (البقرہ: ۱۴۴)

(تم اپنا رخ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور جہاں کہیں بھی تم اور تمھارے ساتھی ہوں' ضروری ہے کہ (نماز میں) رخ اسی طرف پھیر لیں۔)

حدیث و تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ اس حکم کے نزول کے ساتھ ہی فوراً لوگوں نے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ بعض لوگوں کو اس کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے' انھوں نے دوران نماز ہی میں بیت اللہ شریف کی طرف رخ کر لیا۔ اس طرح ان کی نماز کے بعض ارکان بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہوئے ادا ہوئے اور بعض بیت اللہ کی طرف۔!

قرآن کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ جو یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو کیوں قبلہ بنا لیا' یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کا اصل قبلہ بیت اللہ ہی ہے اور تحویل قبلہ میں ان کا نقطہ نظر مبنی بر حق اور عین قرین صحت ہے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

(البقرہ: ۱۴۴)

(اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے' وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے۔)

اور یہی وہ امر حق ہے جس پر مسلمان عمل پیرا ہوئے ہیں۔

## (۲۶)

# جہاد

نبی ﷺ کے حالات کے سلسلے میں قرآن مجید نے جہاد کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ آنحضرت کی حیات طیبہ کا نہایت اہم باب ہے، آنحضرت کے عہد نبوت کی زندگی موٹے موٹے دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ مکی زندگی کے نام سے موسوم ہے اور ایک مدنی زندگی کے نام سے---! دور نبوت کی مکی زندگی تیرہ سال پر محیط ہے اور مدنی زندگی دس سال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

## جہاد کی اجازت

جہاد کی اجازت مسلمانوں کو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوئی اور پہلی آیت جو اذن جہاد کے بارے میں نازل فرمائی گئی، مندرجہ ذیل ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ
لَقَدِيْرُ ۙ ○ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا
رَبُّنَا اللّٰهُ ط وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط
وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○

(الحج: ۳۹، ۴۰)

(جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ شروع کر رکھی ہے، انھیں بھی (جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیوں کہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ضرور ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، ان کا بجز اس کے کوئی جرم نہ تھا کہ وہ کہتے تھے "ہمارا پروردگار اللہ ہے۔" اگر اللہ بعض لوگوں کے ہاتھوں بعض لوگوں کی مدافعت نہ کراتا تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔

خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ سب مقامات کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ جو کوئی اللہ کی سچائی کی حمایت کرے گا، ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ بے شک وہ قوت رکھنے والا (اور) غالب ہے۔)

اذن جہاد کی قرآن نے وجہ یہ بیان کی ہے کہ قریش مکہ نے مسلمانوں کو ظلم کا نشانہ بنا لیا تھا۔ قرآن کے الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے۔ اَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ یعنی مسلمان مظلوم ہیں اور مظلوم کا یہ حق ہے کہ ظالم کے مقابلے میں اپنا دفاع کرے۔

یہ مظلوم پورے تیرہ برس قریش کے ظلم و تشدد کا ہدف بنے رہے۔ آخر ترک وطن پر مجبور ہوئے اور مکے سے تین سو میل دور مدینے چلے گئے، لیکن وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا گیا، ان کے خلاف سازشیں کی گئیں اور ان کے قتل و غارت کے منصوبے بنائے گئے۔ جرم ان کا صرف یہ تھا کہ یہ کہتے تھے۔ رَبُّنَا اللّٰهُ (ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے۔)

قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اپنے دفاع و تحفظ کا سامان بہم پہنچانا مظلوموں کا قدرتی حق ہے۔ اس سے مظلوم کو محروم کر دیا جائے تو دنیا میں ظلم و استبداد سے مدافعت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہے گا۔ ہر طاقت ور گروہ دوسرے گروہ کی کم زوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے عمل و عقیدے کی آزادی کو جب چاہے ختم کر دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ایک گروہ کے ہاتھوں دوسرے گروہ کے ظلم و تشدد کی کارروائیوں کو روکنے کا نظام قائم کر دیا ہے۔ اگر مدافعت کا یہ سلسلہ نہ ہوتا تو دنیا میں اللہ کی عبادت کے تمام ذرائع ختم ہو جاتے۔ کسی کم زور گروہ کے عبادت خانے طاقت ور گروہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہتے۔ یہودیوں کے عبادت

خانے منہدم ہو جاتے، عیسائیوں کے گرجے زمین بوس ہو جاتے، ہندوؤں کے مندروں کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور مسلمانوں کی مسجدیں ویرانوں میں بدل جاتیں۔ خدا پرستی کے تمام مقامات کا خاتمہ ہو جاتا۔

یہ چودہ سو سال پہلے کی بات ہے، اس زمانے میں لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اور مواصلات کے اس سلسلے کا تصور بھی نہ تھا جو اب ہے، آزادی فکر و رائے کی بھی یہ صورت حال نہ تھی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ملکوں میں اب بھی یہی معاملہ ہے۔ مسلمانوں کو غیر مسلم محض مسلمان ہونے کی یہ سزا دے رہے ہیں کہ ان کے مکانات مسمار کیا جاتے ہیں، ان کے کاروبار ان سے چھینے جاتے ہیں، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہیں، جس وطن میں وہ صدیوں سے سکونت پذیر ہیں، اس سے ان کو نکل جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان کے بچوں اور عورتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اگر ان مظلوموں اور ستم رسیدہ لوگوں کی طرف سے تھوڑی بہت مدافعت نہ ہو تو معاملہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔

آیئے اس جہاد کی بات کرتے ہیں، جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے اور جو نبی ﷺ کے عہد میں ہوا۔

## جنگ بدر

منکرین اسلام سے مسلمانوں کی پہلی جنگ ۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری کو بدر کے مقام پر ہوئی۔ اس میں مخالفین ایک ہزار کی تعداد میں تھے اور اس زمانے کے مطابق ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح تھے، اور ادھر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے، وہ بھی بے سرو سامان۔ یعنی دشمنان اسلام مسلمانوں سے دوگنا زیادہ تھے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ط فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ط وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ

بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

(آل عمران : ۱۳)

(بلاشبہ تمھارے لیے ان دو گروہوں میں بڑی ہی نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ اس وقت ایک گروہ تو اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا منکرین حق کا تھا جنھیں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان سے وہ دو چند ہیں، اور اللہ جس کو چاہے اپنی مدد سے قوت عطا فرماتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو چشم بیناد رکھتے ہیں، اس واقعے میں بڑی ہی عبرت کا سامان ہے۔)

مطلب یہ کہ جنگ بدر کے میدان میں کافر اور مسلمان ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے تھے اور مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دوگنا زیادہ ہیں، لیکن اللہ نے اپنی نصرت سے مسلمانوں کو قوت عطا فرمائی اور وہ بے سرو سامانی کے باوجود کافروں کے مقابلے میں کامیاب رہے۔ کافروں نے بری طرح شکست کھائی۔ ان کے بڑے بڑے جنگ جو سردار مارے گئے اور بہت سے قید ہوئے۔ یہ شکست ان کے لیے بڑی ذلت انگیز اور عبرت ناک تھی۔

سورہ انفال کی آیت نمبر ۵ سے آیت نمبر ۱۸ تک جنگ بدر کا ذکر ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کافروں کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیا۔ مسلمان قلت تعداد کے باوصف جم کر لڑے اور کافر ان کا سامنا نہ کر سکے اور بری طرح ہزیمت سے دوچار ہوئے۔ ان آیات میں واقعے کی مناسب تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس جنگ کا اصل مقصد قرآن کے الفاظ میں یہ تھا:

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

(انفال : ۸)

(تاکہ اللہ حق کو حق کرکے اور باطل کو باطل کرکے دکھلا دے، اگرچہ مجرم اسے

پسند نہ کریں۔)

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے۔

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ○

(انفال: ۹)

(جب ایسا ہوا تھا کہ تم نے اپنے پروردگار سے فریاد کی تھی کہ ہماری مدد کر اور اس نے تمھاری فریاد سن لی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے جو یکے بعد دیگرے آئیں گے، تمھاری مدد کروں گا۔)

یہ سب جنگ بدر کے واقعات ہیں، جن میں قرآن رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرما رہا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ (انفال: ۱۷)

(سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا، اور اے پیغمبر! جب تم نے میدان جنگ میں مٹھی بھر کر پھینکی تھی تو حقیقت یہ ہے کہ مٹھی تم نے نہیں، اللہ نے پھینکی تھی۔)

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب نبی ﷺ نے میدان جنگ میں مٹھی بھر کے خاک کافروں کی طرف پھینکی تھی۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ یہ سب معاملہ ہماری مرضی اور منشا کے مطابق ہوا تھا۔

اس سے آگے سورہ انفال ہی کی آیت نمبر ۴۱ سے نمبر ۴۴ تک جنگ بدر کا ذکر ہے اور آیت نمبر ۴۱ میں اسے "یوم الفرقان" قرار دیا گیا ہے۔ یعنی کفر اور اسلام کے درمیان وہ فیصلہ کن دن تھا۔ اس دن معاملہ اس آخری نقطے پر پہنچ گیا تھا کہ

لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ط

(انفال: ۴۴)

(جسے ہلاک ہونا ہے‘ وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو‘ اور جو زندہ رہنے والا ہے‘ وہ اتمام حجت کے بعد زندہ رہے۔)

یعنی بات بالکل نکھر جائے اور واضح ہو جائے اور ہار جیت یا موت اور زندگی کے تمام معاملات پوری دلیل کے ساتھ سامنے آجائیں‘ کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے۔

سورہ انفال کی آیت نمبر ۴۸ میں بھی اس جنگ کی طرف اشارہ ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک شخص سراقہ بن مالک بن جعشم نے جنگ بدر سے پہلے مشرکین سے کہا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرو‘ تم کامیاب رہو گے۔ لیکن جنگ شروع ہوئی تو وہ بھاگ گیا تھا اور مشرکین کہتے تھے کہ اس شخص نے ہمیں ہرا دیا۔ مندرجہ ذیل آیت کا شان نزول یہی ہے۔ قرآن نے اسے شیطان قرار دیا ہے‘ جس نے ان کے سامنے حالات کو خوش نما صورت میں پیش کیا۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (انفال: ۴۸)

(پھر جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے ان کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوش نما کرکے دکھا دیے تھے اور کہا تھا: ”آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں“ لیکن جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا‘ اور کہنے لگا‘ مجھے تم سے کچھ سروکار نہیں۔ مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے۔ جو تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔)

## جنگ اُحد

جنگ بدر کے بعد دوسری بڑی جنگ اُحد ہے جو ۷ شوال ۳ ہجری کو احد کے مقام پر لڑی گئی۔ اس کا ذکر سورہ آل عمران میں آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

○ آیت ۱۲۱ تا ۱۲۷۔
○ آیت ۱۴۰ تا ۱۴۳۔
○ آیت ۱۵۲ تا ۱۵۵۔
○ آیت ۱۶۵ تا ۱۷۱۔

قریش مکہ جو جنگ بدر کی شکست کے بعد مسلمانوں کے پہلے سے کہیں زیادہ مخالف ہو گئے تھے اور شدید غصے کی حالت میں تھے، پانچ ہزار کی تعداد میں اسلحہ سے لیس ہو کر حملے کے لیے مدینہ کو روانہ ہوئے۔ ان میں تین ہزار اونٹوں پر اور دو سو گھوڑوں پر سوار تھے۔ سات سو زرہ پوش پیادہ سپاہی تھے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف ایک ہزار تھی، جن میں سے تین سو عبداللہ بن ابی کی دغا بازی سے فوج سے الگ ہو کر واپس اپنے گھروں میں چلے گئے۔ اب سات سو مسلمان، پانچ ہزار دشمنان اسلام کے مقابلے کے لیے احد پہاڑ کی طرف روانہ ہوئے جو مدینہ منورہ سے تین کوس کے فیصلے پر تھا۔

جنگ کے آغاز میں مسلمانوں نے دشمنوں کو شکست دی اور دشمن کے بارہ مشہور علم بردار بہادر مارے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ لیکن مسلمان تیر اندازوں نے اس درے کو چھوڑ دیا جہاں نبی ﷺ نے ان کو کھڑے رہنے کا حکم دیا تھا۔ اس جنگی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے چکر کاٹ کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور گھیرے میں لے کر انھیں شدید نقصان پہنچایا۔ اس حربی لغزش سے مسلمان جیتی ہوئی جنگ ہار گئے اور میدان بدر میں دشمن کو جو ذلت آمیز شکست ہوئی تھی، اس کا انھوں نے بدلہ لے لیا۔ قرآن اس جنگ کے بالکل ابتدائی واقعہ کا ذکر کرتا ہے، جب نبی ﷺ صبح کے وقت گھر سے تشریف لائے اور احد کے میدان میں مسلمان فوجیوں کو لڑائی کے لیے اہم اور موزوں مقامات پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (آل عمران: ۱۲۱)

(اور اے پیغمبر! اس وقت کو یاد کرو' جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور لڑائی کے لیے مسلمانوں کو جابجا مورچوں پر بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔)

جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کی وساطت سے مسلمانوں سے فرماتا ہے کہ تم بدر میں کامیاب رہے تھے' اس شکست سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' اب اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور شکر سے کام لو۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۲۳)

(اور دیکھو! یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان جنگ میں تمھیں فتح مند کیا تھا' حالاں کہ تم بڑی ہی خستہ حالت میں تھے۔ پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم میں اس کی نعمتوں کی قدر پہچاننے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔)

قرآن نے سورہ آل عمران کی ان آیات میں جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے' جنگ احد کی نہایت مناسب اور ضروری تفصیل بیان کر دی ہے اور یہ نبی ﷺ کی حیات مطہرہ کا وہ حصہ ہے' جس سے اس سلسلے کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کا خاص تعلق ہے۔

ان آیات میں مسلماں کی حالت بھی بیان کی گئی ہے' قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کی جنگی تیاریوں اور سرگرمیوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے' مسلمانوں کو ان کی جنگی غلطی سے بھی آگاہ کیا گیا ہے' منافقوں کے کردار کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے' مسلمانوں کی وجہ ہزیمت کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور انھیں اس سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس شکست سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' جو تمھارا نقصان ہوا ہے' اس سے بددل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے خوف اور تقوے کو حرز جان بنانا چاہیے اور دل میں اس کی شکر گزاری کے جذبات پیدا کرنے چاہئیں۔ یہی

مسلمان کی اصل متاع ہے‘ اس سے روگردانی کسی صورت میں نہیں ہونی چاہیے۔

## غزوہ بنو نضیر

مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں جو قبائل آباد تھے‘ ان میں ایک قبیلے کا نام بنو نضیر تھا‘ یہ یہودی قبیلہ تھا اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا معاہدہ تھا۔

بات یہ ہوئی کہ قبیلہ بنو کلاب کے دو آدمیوں کو عمرو بن امیہ ضمیری نے قتل کر دیا تھا۔ بنو نضیر‘ بنو کلاب کے حلیف تھے‘ اس لیے نبی ﷺ ان دونوں مقتولین کی دیت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکر‘ حضرت عمرؓ‘ حضرت علی اور چند اور صحابہ آپؐ کے ساتھ تھے۔ بنو نضیر کے لوگ بہ ظاہر نہایت اچھی طرح سے پیش آئے اور آپؐ کو ایک دیوار کے پاس بٹھایا۔ اس اثنا میں انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ دیوار کے اوپر سے ایک بڑا پتھر آپ پر گرا دیا جائے تاکہ اس کے نیچے دب جائیں۔ اس قبیلے کا ایک شخص عمرو بن جحاش اس کام کے لیے تیار ہوا اور وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ نبی ﷺ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہو گئی اور آپ اسی وقت وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ صحابہ کرام بھی آپ کے بعد رخصت ہو گئے۔ آپؐ نے صحابہ سے بنو نضیر کے ارادے اور مشورے کا حال بیان کیا۔

اس واقعہ کے بعد نبی ﷺ نے بنو نضیر کو پیغام بھیجا کہ دس دن کی مہلت تمھیں دی جاتی ہے‘ اس دوران میں اطراف مدینہ سے چلے جاؤ۔ دس دن کے بعد تمھارا جو شخص یہاں پایا گیا‘ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ آنحضرت ﷺ کے اس سخت پیغام کے بعد وہ جانا چاہتے تھے‘ لیکن منافقین کے سرغنہ عبداللہ بن ابی نے ان سے کہا کہ تم مدینے کی سکونت ہرگز ترک نہ کرو‘ مسلمانوں سے مقابلے کے لیے ہم دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمھاری مدد کریں گے‘ تمھارے قلعے میں آئیں گے اور تمھاری طرف سے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کریں گے۔ ہمارے علاوہ بنو قریظہ اور بنو غطفان کے قبائل بھی تمھاری مدد کو آئیں گے۔ عبداللہ بن ابی کی اس حتمی پیش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو نضیر نے نبی ﷺ کو جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم اپنا مسکن نہیں چھوڑیں گے‘ یہیں رہیں گے‘ آپ جو جی چاہے کر لیں۔

اس جواب کے بعد آنحضرت نے بنو نضیر پر حملے کی تیاری کا حکم دیا۔ آپؐ نے مدینے کا انتظام ابن ام مکتوم کے سپرد کیا۔ حضرت علی کو فوج کا علم عطا فرمایا اور صحابہ کو ساتھ لے کر بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ منافقین اور بنو قریظہ اور بنو غطفان میں سے کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔

محاصرے کے بعد بنو نضیر نے مدینہ کے نواح سے چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ آنحضرت کو ان کے اس فیصلے کی اطلاع پہنچی تو فرمایا کہ جتنا مال و اسباب اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہو' مع اہل و عیال کے لے جاؤ۔ لیکن آلات حرب اور اسلحہ لے جانے کی اجازت نہیں۔ چناں چہ انھوں نے علاقہ خالی کر دیا اور خیبر چلے گئے۔

سامان حرب اور جنگی اسلحہ جو ان سے برآمد ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آیا' حسب ذیل تھا۔

۱۔ پچاس خود۔

۲۔ پچاس درع۔

۳۔ تین سو چالیس تلواریں۔

نواح مدینہ سے بنو نضیر کا اخراج ربیع الاول ۴ ہجری میں ہوا۔

اس واقعہ کا ذکر سورہ حشر کی آیت نمبر ۲ سے آیت نمبر ۶ تک کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ط مَاظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ○ (الحشر: ۲)

(وہی خدا ہے جس نے اہل کتاب کی اس جماعت کو جو انتقام الٰہی کی منکر ہو چکی تھی' اس کے گھروں سے مسلمانوں نے پہلے ہی اجتماع میں نکال باہر کیا۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ نہ نکال سکیں گے' خود انھیں بھی گمان تھا کہ ان کے قلعے انھیں بچا لیں گے۔ آخر اس طرح غضب الٰہی نازل ہوا کہ ان کے وہم و گمان میں

بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں پر ہیبت چھا گئی۔ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں ویران کرنے لگے۔ مسلمانوں کے ہاتھ بھی اس ویرانی میں ان کی مدد کو آئے۔ جن لوگوں کی آنکھیں ہوں، انھیں اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔)

اس سے آگے فرمایا:

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر: ۳، ۴)

(خدا نے ان کی قسمت میں اگر اخراج نہ لکھ دیا ہوتا تو وہ دنیا میں ان کو عذاب دیتا، اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب ہے ہی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی تعلیم سے انھوں نے منہ موڑ لیا، اور جو ایسا کرتا ہوا سے یقین کر لینا چاہیے کہ خدا کا عذاب نہایت سخت ہے۔)

## بدر ثانی

جنگ احد سے واپسی کے وقت ابو سفیان نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ہمارا تمہارا وعدہ رہا کہ آئندہ سال بدر کے مقام پر مقابلہ ہو گا تاکہ اسی جگہ مسلمانوں کو شکست دی جائے جہاں مسلمانوں نے ہم کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ یعنی قصہ زمین بر سر زمین۔۔۔! یہ ابو سفیان کا چیلنج تھا جو نبی ﷺ اور صحابہ نے منظور کیا۔ دوسرے سال ۴ ہجری کے شعبان یا ذی قعدہ میں اس وعدے اور چیلنج کے مطابق آنحضرت ﷺ نے مدینے کا انتظام حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ کے سپرد کیا اور خود مقام بدر کی طرف سے روانہ ہو گئے۔ پندرہ سو صحابہ اور دس گھوڑے آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت علی اس فوج کے علم بردار تھے۔ آنحضرت مقام بدر میں تشریف لائے اور آٹھ روز وہاں مخالفین اسلام کے انتظار میں قیام فرما رہے۔ ادھر ابو سفیان دو ہزار فوجیوں اور پچاس گھوڑوں کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے۔ مکے سے ایک منزل کا فاصلہ طے کر کے ظہران یا عسفان کے مقام تک آئے۔ وہاں سے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کہا کہ یہ سال جنگ کے لیے

موزوں نہیں، چناں چہ سب لوگ واپس چلے گئے۔ وہ قحط کا سال تھا۔

قرآن مجید نے اس واقعے کا ذکر سورہ آل عمران میں کیا ہے۔ فرمایا ایک سال پہلے مسلمان احد کے میدان میں شکست کا زخم کھا چکے تھے۔ لیکن ان کے ارادوں میں اضمحلال پیدا نہیں ہوا، وہ بہ دستور پر عزیمت رہے۔ جوں ہی آنحضرت نے انھیں جنگ کے لیے پکارا اور میدان بدر کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا، فوراً تعمیل ارشاد کے لیے کمربستہ ہو گئے اور بلا تامل آنحضرت ﷺ کی رکاب میں چل پڑے۔ قرآن اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (آل عمران: ۱۷۲)

(جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے باوجودیکہ اس سے پہلے زخم کھا چکے تھے، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں، ان کے لیے اللہ کے حضور بہت بڑا اجر ہے۔)

بعض لوگوں نے مسلمانوں سے کہا کہ دشمن بہت بڑی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے ہیں، جنگی اسلحہ سے لیس ہیں اور حالات خطرناک ہیں اس لیے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ لیکن مسلمانوں نے اللہ پر توکل کیا اور کہا ہمارا مددگار اللہ ہے اور تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ چناں چہ وہ اللہ پر بھروسا کر کے گئے اور خیر و عافیت کے ساتھ واپس آ گئے۔ اس ضمن میں قرآن کے الفاظ پڑھیے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ۔ (آل عمران: ۱۷۳، ۱۷۴)

(وہ لوگ جن میں سے بعض آدمی کہتے تھے کہ تم سے جنگ کرنے کے لیے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ اکٹھا کر لیا ہے، سو تم ان سے ڈرتے رہو، لیکن ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا اور وہ بول اٹھے، ہمارے لیے اللہ کا سہارا کافی ہے اور

جس کا کارساز اللہ ہو، وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے۔ پھر یہ ہوا کہ یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل سے شاد کام ہو کر واپس آگئے، کوئی گزند انھیں نہ چھو سکا۔ وہ اللہ کی خوش نودیوں کی راہ میں گامزن ہوئے اور اللہ بڑا فضل رکھنے والا ہے۔)

آنحضرت کی اس تگ و تاز کو تاریخ اسلامی میں بدر ثانی کی جنگ کہا جاتا ہے جس میں پندرہ سو مسلمان آنحضرت کی قیادت میں مقام بدر میں پہنچے اور آٹھ دن وہاں مقیم رہے۔ دشمن کا انتظار کیا، مگر خود اپنی زبان سے کیے گئے پختہ وعدے کے باوجود وہ نہیں پہنچے، راستے ہی سے واپس مکے چلے گئے۔ یہ واقعہ ۴ ہجری کے شعبان یا ذی قعدہ میں پیش آیا۔

سورہ آل عمران کی آیات ۱۷۲ تا ۱۷۵ کی شان نزول کا تعلق اسی واقعہ سے ہے۔

## جنگ احزاب

قبیلہ بنو نضیر کے یہودیوں کو نبی ﷺ نے اطراف مدینہ سے نکال دیا تھا، وہ خیبر میں چلے گئے تھے اور ان کی جمعیت منتشر ہو گئی تھی، لیکن وہ امن و امان سے نہیں بیٹھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ چناں چہ اس عزم کو کامیابی سے ہم کنار کرنے ے لیے انھوں نے اپنے بیس سرکردہ آدمیوں کو قریش مکہ اور عرب کے مختلف قبائل میں بھیجا تاکہ ان سب کو جمع کر کے متفقہ طور سے مدینے پر حملہ کیا جائے اور اسلام اور مسلمانوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ اس طرح ذی قعدہ ۵ ہجری میں عرب کے بہت سے قبائل دس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔ مسلمانوں نے جب یہ خیال کیا کہ ان کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تو حضرت سلمان فارسی ؓ کے مشورے کے مطابق سات دن کی مسلسل جدوجہد سے شہر کے ارد گرد گہری خندق کھودی گئی، خندق کھودنے والوں میں خود نبی ﷺ بھی شامل تھے۔ اس خندق کی وجہ سے اسے جنگ خندق کہا جاتا ہے اور چوں کہ بہت سے قبائل اکٹھے ہو کر حملہ آور ہوئے تھے اور متعدد حزب اس میں شامل تھے، اس لیے اسے "جنگ احزاب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، سورہ احزاب کا شان نزول یہی واقعہ ہے اور اس میں اس جنگ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

عربوں میں حملہ آور سے بچاؤ کے لیے اور اپنے دفاع کے لیے خندق کھودنے کا رواج نہ تھا

اور وہ اس حفاظتی اور جنگی تکنیک سے آشنا نہ تھے۔ حملہ آور قبائل کی دس ہزار مسلح فوج نے شہر کے باہر پڑاؤ کیا اور جب آگے بڑھ کر خندق کو دیکھا تو نہایت متحیر اور پریشان ہوئے۔ خندق بہت گہری بھی تھی اور چوڑی بھی، جسے عبور کر کے شہر پر حملہ کرنا ممکن نہ تھا۔ کئی دن محاصرہ جاری رہا۔ مدینے کے منافق اگرچہ بہ ظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے لیکن اندرونی طور پر حملہ آوروں کے حامی تھے۔ قرآن کے الفاظ ہیں کہ انھوں نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا۝ (الاحزاب: ۱۲)

(اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں اسلام کے متعلق شک کا مرض تھا، کہنے لگے کہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ کیا وہ محض فریب تھا۔)

یعنی اسلام اور مسلمانوں کی کامرانی کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا تھا، وہ دھوکا تھا، صداقت اور حقانیت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ نہایت سخت اور انتہائی تکلیف دہ وقت تھا۔ قرآن اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝

(الاحزاب: ۱۰، ۱۱)

(یہ وہ وقت تھا جب دشمن کے لشکر تمھارے اوپر کی جانب سے اور تمھارے نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے تھے اور جب آنکھیں پتھرا رہی تھیں اور دل حلق میں چلے آ رہے تھے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔ اس وقت مومن خوب آزمائے گئے اور نہایت سختی کے ساتھ

ہلائے گئے۔)

پھر ایسا ہوا کہ چند روز کے بعد دس ہزار کی اس بہت بڑی فوج میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ہر قبیلہ ایک دوسرے پر طعنہ زنی کرنے لگا۔ اب فوج کے خیمے اکھڑ گئے اور تمام لوگ وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝ (الاحزاب: ۲۵)

(اور اللہ نے کافروں کو ان کے دل کی جلن کے ساتھ واپس لوٹا دیا' وہ اس حملے سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے اور اللہ ایمان داروں کی طرف سے جنگ میں خود ہی کافی ہو گیا۔)

اس کے بعد کیا ہوا؟ اور ان یہودیوں کے ساتھ کیا بیتی جو مشرکین کو مدینے پر حملے کے لیے لائے تھے؟ اس سوال کا جواب قرآن ہی کی زبان سے سنیے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ۔ (الاحزاب: ۲۶)

(اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے مشرکین کی مدد کی تھی' اللہ نے ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔)

یعنی وہ مسلمانوں سے خوف زدہ ہو کر اپنے تمام ٹھکانوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور قرآن بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے ان کی زمینوں اور ان کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۲۷)

(اور اے مسلمانو! تم کو ان کی زمین کا اور ان کے گھروں کا اور ان کے مالوں کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہارے قبضے میں آیا' جس پر تم نے کبھی قدم نہ رکھے

تھے۔۔۔ یاد رکھو! اللہ ہر شے پر قادر ہے۔)

اس جنگ کا ذکر سورہ احزاب کی آیت نمبر۹ سے آیت نمبر۲۷ تک کیا گیا ہے۔

## صلح حدیبیہ

صلح حدیبیہ کا واقعہ ذی قعدہ ۶ ہجری کو پیش آیا اور اسی وقت بیعت رضوان ہوئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپؐ نے اپنے صحابہ کرام کے ساتھ حج بیت اللہ کیا ہے اور بیت اللہ کی کلید آپ کے ہاتھ میں ہے۔ صحابہ میں سے بعض نے حلق کیا، (یعنی سر منڈوایا) ہے اور بعض نے قصر، یعنی سر کے بال کٹوائے ہیں۔۔۔۔۔ آپ نے یہ خواب صحابہ کو سنایا اور عمرے کی تیاری شروع کر دی۔ مہاجرین و انصار کے چودہ سو آدمی آپؐ کے ساتھ ہوئے۔ اعلان کر دیا گیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار اس کے ہاتھ میں ہونی چاہیے، وہ بھی نیام کے اندر ہو۔ تلوار کو عرب اپنا ایک ضروری آلہ سمجھتے تھے جو ہر وقت ہاتھ میں رکھتے تھے۔ قربانی کے جانور ساتھ لیے اور مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کو عمرے کے لیے روانہ ہو گئے۔

ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو قربانی کی ضروری رسوم ادا کیں، قربانی کے اونٹوں کی گردنوں میں نعل باندھ دیے گئے اور کوہانوں کو تھوڑا سا زخمی کر دیا گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قربانی کے اونٹ ہیں۔ یہ کل ستر اونٹ تھے۔

احتیاط کے طور پر آنحضرت نے قبیلہ بنو خزاعہ کے ایک شخص بشر بن سفیان کو جو مسلمان ہو چکا تھا، لیکن اس کی قبولیت اسلام کا قریش کو علم نہ تھا، مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کے ارادۂ عمرے کے بارے میں قریش کا کیا ردعمل ہے۔ آپ کا قافلہ عسفان کے قریب پہنچا تو بشر بن سفیان نے آکر اطلاع دی کہ قریش کے تمام قبائل نے بہ یک زبان یہ کہا ہے کہ ہم کسی صورت بھی محمد کو مکے میں نہیں داخل ہونے دیں گے (ﷺ) انھوں نے آپؐ کے ساتھ لڑائی کی تیاری شروع کر دی ہے۔

عسفان سے چودہ سو مسلمانوں کا قافلہ روانہ ہوا تو غمیم تک آیا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا۔ وہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا، صحابہ کی ایک جماعت نے اس سے پانی

نکال کر پیا تو وہ خالی ہو گیا، لیکن آنحضرت کے اعجاز سے اس میں اس قدر پانی بھر آیا کہ سب کے لیے کفایت کر گیا۔

عرب کے قبیلہ خزاعہ نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن وہ اسلام اور مسلمانوں کے حلیف تھے اور قریش یا دوسرے مخالف اسلام لوگ جس انداز سے مسلمانوں کا تذکرہ کرتے تھے، اس کے وہ خلاف تھے۔ ان کے رئیس کا نام بدیل بن ورقا تھا۔ وہ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد فتح مکہ کے زمانے میں مسلمان ہوا تھا، اسے جب معلوم ہوا کہ آنحضرت حدیبیہ میں مقیم ہیں تو اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کی معیت میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ قریش نے آپ سے لڑائی کے لیے بہت سی فوج تیار کر رکھی ہے، وہ آپؐ کو کعبۃ اللہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

آپؐ نے اس سے فرمایا کہ ہم عمرے کی غرض سے آئے ہیں، قریش سے جا کر کہہ دو کہ لڑائی ہرگز مقصود نہیں، قریش کو پہلے ہی لڑائیوں سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ایک مقررہ مدت کے لیے ہمارے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیں اور ہمیں عمرہ کرنے دیں۔

بدیل نے قریش کو آنحضرت کا یہ پیغام پہنچایا تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر قبیلہ بنو ثقیف کا ایک ذمے دار شخص عروہ بن مسعود ثقفی قریش کی طرف سے آنحضرت کی خدمت میں آیا، جس نے آپؐ سے تفصیل سے بات کی اور آپؐ سے صحابہ کی اطاعت و شیفتگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بات چیت کے اسلوب کے متعلق کانوں سے سنا تو بہت متاثر ہوا اور قریش سے جا کر کہا کہ میں نے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کے دربار دیکھے ہیں مگر جس عقیدت کا اظہار محمد (ﷺ) سے ان کے صحابہ کرتے ہیں، اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ قریش اس کی یہ بات سن کر بگڑ گئے اور اس موضوع پر مزید گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔ لیکن دوسرے قبیلوں کے لوگوں نے اسے بچا لیا۔

اس اثنا میں قریش نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے فوج کا ایک دستہ بھیجا، لیکن مسلمانوں نے ان تمام فوجیوں کو گرفتار کر لیا۔ پھر آنحضرت کے حکم سے انھیں معافی دے دی گئی اور رہا کر دیا

گیا۔ قرآن کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ۔ (الفتح: ۲۴)

(اور وہ خدا ہے جس نے مکے میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمھارا ہاتھ ان سے روک دیا تھا' اس کے بعد کہ تمھیں ان پر غالب کر دیا تھا۔)

اسی اثنا میں نبی ﷺ نے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ لیکن اسلامی لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انھیں مکے میں قتل کر دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو جب یہ بات پہنچی' اس وقت آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ صحابہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سب سے بیعت لی کہ اگر لڑائی تک نوبت پہنچ جائے تو کوئی شخص میدان جنگ سے فرار نہ ہو۔ حضرت عثمان اس وقت موجود نہ تھے۔ اس لیے آپؐ نے اپنا ایک ہاتھ آگے کیا اور فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ اس پر آپؐ نے اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر حضرت عثمان کی بیعت لی۔ قرآن اس بیعت کے متعلق کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (الفتح: ۱۰)

(اے پیغمبر! جو لوگ تمھاری بیعت کر رہے ہیں' وہ درحقیقت اللہ کی بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔)

آگے چل کر اس فرمان میں بات بالکل واضح کر دی۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ (الاحزاب: ۱۸)

(بلاشبہ اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جو درخت کے نیچے آپؐ سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر

اطمینان نازل فرما دیا اور انھیں جلد ہی فتح عطا فرما دی۔)

اس بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔

بعد کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کے قتل کی خبر صحیح نہ تھی۔

قریش کے ایک شخص سہیل بن عمرو تھے۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، اس لیے انھیں "خطیب قریش" کہا جاتا تھا۔ قریش نے اپنا نمائندہ مقرر کر کے انھیں آنحضرت کے پاس حدیبیہ کے مقام پر اس لیے بھیجا کہ وہ اس سال واپس چلے جائیں، مکے کا رخ نہ کریں۔

سہیل نے آنحضرت کے ساتھ کافی دیر سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔ بالآخر چند شرائط پر دونوں کا اتفاق ہو گیا اور طے پایا کہ تمام شرائط ضبط تحریر میں لائی جائیں۔ عرب کے باشندے خطوط کی ابتدا میں "باسمک اللّٰھم" لکھا کرتے تھے۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے الفاظ کا انھیں علم نہ تھا۔ چناں چہ عرب کے پرانے طریقے کے مطابق "باسملک اللّٰھم" سے تحریر کا آغاز کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس معاہدے کی شرائط لکھنے پر مامور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھو! هٰذَا مَا قاضی علیه محمد رسول اللّٰه (یعنی یہ وہ معاہدہ ہے جو اللہ کے رسول محمد نے تسلیم کیا۔)

یہ الفاظ سن کر سہیل نے کہا: یہی تو جھگڑا ہے کہ ہم آپ کو اللہ رسول نہیں تسلیم کرتے۔ اگر آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو یہاں تک نوبت ہی کیوں پہنچتی۔ آپ صرف "محمد بن عبداللہ" لکھوائیں۔ اس اعتراض پر چند باتیں ہوئیں، لیکن بعد ازاں اسی طرح لکھا گیا جو سہیل بن عمرو نے لکھوانا چاہا تھا۔

شرائط صلح مندرجہ ذیل طے پائیں جو معرض تحریر میں لائی گئیں۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں گے۔

۲۔ اگلے سال آئیں گے اور مکے میں صرف تین دن قیام کریں گے، پھر واپس چلے جائیں گے۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہیں آئیں گے، صرف تلوار ساتھ لائیں گے، تلوار بھی نیام میں ہو گی۔

۴۔ اس وقت مکے میں جو مسلمان موجود ہیں، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے

جائیں گے، وہ سب یہیں رہیں گے۔

۵۔ کافروں اور مسلمانوں میں سے مکے کا کوئی شخص مدینے جائے تو اسے وہاں نہیں رکھا جائے گا، واپس مکے بھیج دیا جائے گا۔

۶۔ اگر کوئی مسلمان مکے جائے گا تو اسے واپس مدینے نہیں بھیجا جائے گا۔

۷۔ دس سال تک مسلمانوں اور قریش مکہ میں جنگ نہ ہو گی۔ اس اثنا میں قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ اس معاہدے کے دونوں فریقوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں مل جائیں۔

یہ تمام شرائط بہ ظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں۔۔۔۔۔ اس وقت عجیب اتفاق یہ ہوا کہ سہیل بن عمرو جو کافروں کے نمائندے کی حیثیت سے شرائط معاہدہ لکھوا رہا تھا، اس کے صاحب زادے ابو جندل جو کچھ عرصہ قبل اسلام قبول کر چکے تھے اور مکے میں کافروں کی قید میں تھے اور وہاں ان کی طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا تھے، کسی طرح بھاگ کر حدیبیہ میں اس مقام پر آ گئے جہاں شرائط معاہدہ لکھی جا رہی تھیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ سب کے سامنے آ کر گر پڑے۔

یہ نہایت نازک موقع تھا۔ سہیل نے آنحضرت سے مخاطب ہو کر کہا۔

محمد! شرائط معاہدہ کی تعمیل کا یہ پہلا امتحان ہے۔ شرائط کے مطابق ابو جندل کو میرے حوالے کرو۔

آنحضرت نے فرمایا: ابھی معاہدہ تحریر میں نہیں آیا۔

سہیل نے کہا: اگر ابو جندل کو واپس نہیں کیا جاتا تو ہم صلح نہیں کریں گے۔

آنحضرت نے فرمایا: ابو جندل کو ہمارے پاس رہنے دو۔

سہیل نے کہا: بالکل نہیں۔ اسے میرے سپرد کرنا پڑے گا۔

آخر آنحضرت نے سہیل کی یہ بات مان لی اور ابو جندل کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔

ابو جندل کو کافروں نے اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر مار پیٹ کے بہت سے نشان پڑ گئے تھے اور وہ شدید زخمی حالت میں تھے۔ لوگوں کو انھوں نے زخموں کے نشان دکھائے۔

ابو جندل اس وقت ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت تکلیف میں تھے۔ انھوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فریاد کی۔

> "میرے مسلمان بھائیو! کیا آپ مجھے پھر اسی پہلی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ آپ مجھے دوبارہ کافروں کے سپرد کیوں کرتے ہیں؟"

ان کے یہ چند الفاظ نہایت دردناک تھے جو ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔ تمام مسلمان یہ الفاظ سن کر تڑپ اٹھے۔ حضرت عمر فاروق ضبط نہ کر سکے اور نبی ﷺ کی خدمت میں آئے اور بولے!

یا رسول اللہ! کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟

فرمایا: پیغمبر برحق ہوں۔۔۔!

کہا: کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟

ارشاد ہوا: ہم حق پر ہیں۔

کہا: اگر حق پر ہیں تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟

فرمایا: میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ خدا میری مدد کرے گا۔

کہا: کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ کا طواف کریں گے؟

فرمایا: میں نے کہا تھا، لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔

اس کے بعد حضرت عمر وہاں سے اٹھے اور حضرت ابوبکر کے پاس گئے۔ ان سے بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔

حضرت ابوبکر نے جواب دیا: وہ اللہ کے پیغمبر ہیں، جو کچھ کرتے ہیں، اللہ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں۔

حضرت عمر کے یہ کلمات نہایت سخت تھے، جو انھوں نے آنحضرت سے کہے۔ اس کا انھیں تمام عمر افسوس رہا۔ بہرحال حضرت ابو جندل کو اسی طرح پاؤں میں بیڑیاں ڈالے ہوئے چودہ سو صحابہ کے سامنے ان کے کافر باپ کے حوالے کر دیا گیا۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ آنحضرت نے

ان کو رخصت کرتے وقت فرمایا:

**یا ابا جندل! اصبروا حتسب فان اللّٰہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا و مخرجًا انا قد عقدنا بیننا وبین القوم صلحا وانا لا نغدر بھم۔**

(ابو جندل! صبر اور ضبط سے کام لو' اللہ تمھارے لیے اور تمھارے دیگر ساتھی مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ اب ہمارا ان سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ ہم ان سے بد عہدی نہیں کر سکتے۔)

اس کے بعد آنحضرت اور صحابہ نے وہیں قربانیاں کیں۔ وہیں بال منڈوائے اور احرام اتارے۔ تین دن وہاں قیام کیا اور پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں سورہ فتح نازل ہوئی۔

**اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۟ۙ** (الفتح:۱)

(اے پیغمبر! ہم نے آپ کو مکمل فتح دی ہے۔)

پھر فرمایا:

**وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۟** (الفتح:۳)

(اور اللہ تمھاری بے حد نصرت فرمائے گا۔)

اللہ نے صلح حدیبیہ کو مسلمانوں کی فتح و نصرت سے تعبیر فرمایا اور بلاشبہ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے فتح مندی اور نصرت خداوندی کے دروازے کھل گئے۔

اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

○ معاہدے کے مطابق تجارت اور کاروباری سلسلے میں یا اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے کے لیے مکہ کے کافر مدینہ منورہ جاتے اور مسلمانوں سے ملتے' ان کی مہمان نوازی کا انداز دیکھتے اور ان کی باتیں سنتے' ان کی اخلاقی حالت ان کے سامنے آتی اور صاف ستھری زندگی کا ملاحظہ کرتے تو اس سے نہایت متاثر ہوتے اور اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ان کے دلوں میں کدورت اور بغض کے جو جراثیم پائے جاتے تھے' ان

میں کمی پیدا ہوتی۔ بلکہ ان کے دل صاف ہو جاتے اور وہ اسلام قبول کر لیتے۔

- جو مسلمان مکہ مکرمہ میں رہ رہے تھے اور کافروں کے ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، مدینے آنے جانے والے لوگ مسلمانوں کے اخلاق سے اثر پذیر ہو کر ان کے ساتھ بھی نرمی کا برتاؤ روا رکھتے اور دل میں خیال کرتے کہ مسلمان ہماری عزت کرتے ہیں تو ہم انھیں سزا کیوں دیں۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک کثرت کے ساتھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔

- یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ صلح حدیبیہ کے نتیجے میں جو مسلمان مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے، ان میں ایک حضرت عتبہ بن اسید تھے۔ وہ مکے سے بھاگ کر مدینے آ گئے۔ قریش مکہ نے آنحضرت کی خدمت میں دو آدمی بھیجے کہ معاہدے کے مطابق ہمارے آدمی (عتبہ) کو ان دو آدمیوں کے ساتھ مکے بھیجا جائے۔ آنحضرت نے عتبہ سے جانے کا حکم دیا تو اس نے عرض کیا کہ آپ مجھے کافروں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے اسلام ترک کر کے کفر اختیار کرنے پر مجبور کریں گے۔ آپ نے فرمایا اللہ کوئی بہتر صورت پیدا کرے گا، اب تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ چناں چہ عتبہ مجبوراً ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ لیکن ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو عتبہ نے ان دو میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا جو بچ گیا تھا، وہ واپس مدینے آنحضرت کی خدمت میں پہنچا، عتبہ کے ہاتھوں اپنے ساتھی کے قتل کا واقعہ بیان کیا اور ان کی شکایت کی۔ اتنے میں عتبہ بھی پہنچ گئے اور انھوں نے آنحضرت سے عرض کی کہ آپ نے معاہدے کے مطابق مجھے واپس بھیج دیا تھا، اس لیے آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ مدینے سے چلے گئے اور عیص کے مقام میں جو سمندر کے کنارے واقع تھا، سکونت اختیار کر لی۔ مکے کے ستم رسیدہ مسلمانوں کو جب اس ٹھکانے کا پتا چلا تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح بھاگ کر وہاں جانے لگے۔ اس طرح چند روز میں مسلمانوں کی وہاں اچھی خاصی جمعیت ہو گئی۔

ان لوگوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا جو تجارتی قافلہ شام کے ملک میں جاتا اسے روک لیتے‘ ان کے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ یہی تھی۔ اس سے جو مال ہاتھ آتا‘ وہ ان کی گزر بسر کا ذریعہ بنتا۔

قریش اس صورت حال سے نہایت پریشان ہوئے اور انھوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں تحریری طور پر عرض کیا کہ معاہدے کی اس شق نے ہمیں پریشانی میں ڈال دیا ہے‘ اس لیے اسے ختم کر دیا جائے‘ اب مکے کا کوئی مسلمان مدینے جانا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے جائے‘ ہم اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کریں گے۔

اس شق کے خاتمے کے بعد نبی ﷺ نے اس قسم کے پریشان حال اور بے وطن مسلمانوں کو پیغام بھجوایا کہ وہ مدینے آجائیں‘ چناں چہ حضرت ابو جندل اور ان کے ساتھی مدینے آکر آباد ہو گئے اور قریش کی تجارتی راہ جو مخدوش ہو گئی تھی‘ پہلے کی طرح کھل گئی‘ اس طرح صلح حدیبیہ کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے فتح کی نوید لے کر آیا اور قرآن کی سورہ فتح کا شان نزول یہی ہے۔ یہ آنحضرت کی حیات مبارکہ کا نہایت اہم حصہ ہے جو قرآن نے بیان کیا۔

## فتح مکہ

۸ ہجری کے ماہ رمضان میں مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اس کی پیشین گوئی سورہ "الفتح" میں کی گئی ہے۔

یہاں فتح مکہ کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔

۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر نبی ﷺ کا قریش سے جو معاہدہ ہوا تھا‘ اس کی ایک شق یہ تھی کہ دس سال تک دونوں فریقوں میں جنگ نہ ہو گی۔ اس اثنا میں عرب کے تمام قبائل کو اختیار ہو گا کہ جس فریق کے مناسب سمجھیں‘ حلیف بن جائیں۔ جس قبیلے کے لوگ قریش سے تعلقات استوار کرنا چاہیں‘ وہ ان سے جا ملیں اور جن کا ارادہ مسلمانوں سے مراسم پیدا کرنا اور بڑھانا ہو‘ وہ ان سے رسم و راہ پیدا کر لیں۔ اس سلسلے میں کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

معاہدے کی اس شق کی روشنی میں قبیلہ بنو خزاعہ نے نبی ﷺ سے اتحاد کرلیا اور قبیلہ بنو بکر نے اپنے آپ کو قریش کا حلیف بنالیا۔ بنو خزاعہ کا رجحان اس سے پہلے بھی مسلمانوں کی طرف تھا، بلکہ آنحضرت کی بعثت سے بھی پہلے سے وہ اس خاندان سے دوستانہ علائق رکھتے تھے۔ اب اس میں مزید استحکام پیدا ہو گیا تھا۔

حدیبیہ کے اس معاہدے پر ابھی دو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ بنو بکر نے قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اپنے حلیف بنو بکر کی اسلحہ دے کر امداد کی بلکہ قریش کے متعدد ارکان نے بنو بکر کے ساتھ مل کر بنو خزاعہ پر حملے بھی کیے اور انھیں بے حد جانی نقصان پہنچایا۔

بنو خزاعہ کے لوگوں نے ان سے امان طلب کی اور بھاگ کر بیت اللہ میں پناہ لی، لیکن انھیں ہر جگہ اور ہر حالت میں قتل کیا گیا۔ یہ نہایت مظلوم لوگ تھے۔ انھوں نے انتہائی لجاجت کے ساتھ "اِلٰھک، اِلٰھک" کہنا شروع کیا (یعنی خدا کے واسطے، خدا کے واسطے ہمیں قتل نہ کرو) یہ ان کی رحم کی اپیل تھی۔ لیکن یہ ظالم اس کا جواب ان الفاظ میں دیتے تھے۔

**"لَا اِلٰہ الیوم"**

(آج کوئی خدا نہیں اور کوئی رحم کا تصور نہیں۔)

بنو خزاعہ کے چالیس آدمی جو کسی طرح بچ گئے تھے، بھاگ کر نبی ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچے اور آپؐ سے اپنی مظلومیت کی داستان بیان کی۔

آپؐ مسجد نبوی میں صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک اشعار کی صورت میں ایک دردناک آواز بلند ہوئی اور آپؐ کے پردۂ سماع سے ٹکرائی۔ وہ بنو خزاعہ کے عمرو بن سالم خزاعی کی آواز تھی جو مسجد نبوی میں آپؐ کے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

**یارب انی ناشد محمدا حلفنا وحلف ابیه الا ملدا**
**قد کنتم ولدا وکنا والدا ثمة اسلمنا ولم ننزع یدا**
**فانصر۔ هداک اللّٰه نصرا ایدا وادع عباداللّٰه یاتوا مددا**
**فیهم رسول اللّٰه قد تجردا ابیض مثل البدر یسمو صعدا**
**ان سیم خسفا وجهه تربدا فی فیلق کالبحر یجری مزبدا**

ان قريشا اخلفوك الموعدا ونقضوا ميثاقك الموكدا
وجعلوا في كداء رصدا وزعموا ان لست ادعو احدا
وهم اذل واقل عددا هم بيتونا بالو تير هجدا
وقتلونا ركعا وسجدا

اب ان اشعار کا ترجمہ سنیئے۔

اے پروردگار! میں محمد ﷺ سے ان کے عہد اور ان کے والد کے قدیم عہد کی دہائی دے رہا ہوں۔

آپ لوگ اولاد تھے اور ہم جننے والے تھے۔ پھر ہم نے فرماں برداری اختیار کی اور کبھی اس سے ہاتھ نہ کھینچا۔

اللہ آپ کو ہدایت دے' آپ پوری مدد کیجیے' اللہ کے بندوں کو پکاریے' وہ مدد کو آئیں گے۔

ان میں اللہ کے رسول ہوں گے' ہتھیار باندھے ہوئے' چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوئے اور خوب صورت۔

اگر ان پر ظلم کیا جائے اور ان کی توہین کی جائے تو چہرہ تمتا اٹھتا ہے۔ آپ ایک ایسے لشکر جرار کے ساتھ آئیں گے جو جھاگ سے بھرپور سمندر کی طرح متلاطم ہو گا۔

یقیناً قریش نے آپ کے ساتھ کیے گئے عہد کی خلاف ورزی کی ہے اور پختہ وعدہ توڑ ڈالا ہے۔

انھوں نے میرے لیے کدا میں گھات لگائی اور یہ خیال کیا کہ میں کسی کو مدد کے لیے نہیں پکاروں گا۔

وہ بہت ذلیل ہیں اور تعداد میں کم ہیں۔ انھوں نے وتیر پر رات کو حملہ کیا۔۔۔۔۔۔ اور ہمیں رکوع و سجود کی حالت میں قتل کیا۔ (یعنی ہم مسلمان تھے اور ہمیں قتل کیا گیا۔)

اشعار اور واقعات کی تفصیل سن کر نبی ﷺ کو نہایت تکلیف ہوئی۔ جیسا کہ دوسرے شعر میں اشارہ کیا گیا ہے' بنو خزاعہ اور بنو ہاشم کے درمیان عبدالمطلب کے زمانے سے ایک دوسرے کی امداد کا معاہدہ قائم تھا اور اس میں کبھی کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ دونوں قبیلے باہم بہت بڑے

حلیف تھے۔

آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں۔

۱۔ مقتولین کا خون بہا دیا جائے۔
۲۔ قریش بنو بکر کی حمایت ترک کر دیں۔
۳۔ اعلان کر دیا جائے کہ معاہدہ ٹوٹ گیا۔

مکہ میں قریش کی مجلس میں یہ شرائط سنائی گئیں تو قریش کے ایک شخص قرط بن عمر نے کہا کہ ہمیں صرف آخری شرط منظور ہے۔ یعنی معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قاصد تو یہ الفاظ سن کر واپس مدینہ منورہ کو روانہ ہو گیا، لیکن قریش کو بہت افسوس ہوا، انھوں نے سوچا کہ ہمیں قاصد سے معاہدہ توڑنے کی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ معاہدہ بہ ہر صورت برقرار رہنا چاہیے تھا۔ انھوں نے فوری طور پر ابو سفیان کو اپنا نمائندہ مقرر کر کے آنحضرت کی خدمت میں مدینہ کی طرف روانہ کیا۔ لیکن اب بات ختم ہو چکی تھی، جس کی تفصیل تاریخ اسلامی اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔

قاصد سے معاہدہ ٹوٹنے کے الفاظ سن کر نبی ﷺ دس ہزار صحابہ کی جمعیت کے ساتھ ۸ ہجری کے ۱۰۔ رمضان المبارک کو مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے اور ۲۰۔ رمضان کو سورہ فتح کی تلاوت کرتے ہوئے مکے میں داخل ہوئے۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا۔

(ہم نے آپ کو مکمل فتح سے نوازا۔)

آپ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو بت گراتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

(بنی اسرائیل: ۸۱)

(حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا۔ باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر جائے۔)

اس کے ساتھ ہی فرماتے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ○ (سبا:۴۹)

(دین حق آپہنچا اور باطل کا قصہ ختم ہوا، وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئے گا۔)

فتح مکہ سورہ فتح کی شان نزول میں شامل ہے۔

نبی ﷺ پندرہ دن مکہ مکرمہ میں اقامت فرما رہے۔

## غزوۂ حنین

ہفتے کے دن ۶۔ شوال ۸ ہجری کو آنحضرت مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت بارہ ہزار کی فوج آپؐ کے ساتھ تھی۔ ان میں دس ہزار وہ مہاجرین و انصار صحابہ تھے جو مدینہ منورہ سے آپ کی رکاب میں مکہ میں آئے تھے اور دو ہزار وہ تھے جو مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتے تھے اور آپؐ کے ساتھ روانہ ہو گئے تھے۔ یہ زیادہ تر نو مسلم تھے۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں نے جو نہایت بہادر اور جنگ جو تھے، باہم مشورہ کر کے مسلمانوں سے لڑنے اور انھیں شکست دینے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی تکمیل کے لیے انھوں نے بنو مضر اور بنو ہلال کے قبیلوں کو بھی اپنا معاون و ہم نوا بنا لیا اور کئی ہزار بہادروں کے ساتھ مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے اور وادی حنین میں پڑاؤ کیا۔

نبی ﷺ کو بھی ان کے اس عزم و ارادے کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور مسلمانوں کے دلوں میں قدرتی طور پر اپنی کثرت کا خیال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ آپؐ نے بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ حنین کا قصد کیا۔ لیکن آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دشمن نے ایک تنگ اور دشوار گزار درے میں مورچے قائم کر کے اپنے تیر اندازوں کو وہاں بٹھا دیا تھا۔ ان کا کمانڈر مالک بن عوف تھا۔ اسلامی فوج منگل اور بدھ کی درمیانی رات ۱۰ شوال کو حنین پہنچی۔ اس وقت ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انھیں کچھ پتا نہ تھا کہ دشمن نے اس مقام پر قبضہ کر رکھا ہے اور حملے کے لیے ہمارے انتظار میں ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے پاس زیادہ اسلحہ بھی نہ تھا۔ جوں ہی اسلامی فوج کا دستہ شب کے اندھیرے میں تنگ و تاریک درے میں داخل ہوا، دشمن نے ان پر تیروں کو بوچھاڑ کر دی۔ یہ اچانک حملہ تھا جس کا مسلمانوں کو وہم و خیال بھی نہ تھا۔

تیر اندازی کے ساتھ ہی دوسری طرف دشمن فوج نے ان پر تیزی کے ساتھ تلوار کے وار کرنا شروع کر دیے۔ یہ تمام واقعہ اس درجہ آناً فاناً ہوا کہ مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور سراسیمگی کے عالم میں ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ بہ ظاہر یہ بہت بڑی شکست تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے جلد ہی فتح و نصرت میں بدل دیا۔ قرآن اس کا ذکر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں کرتا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ○ (التوبہ: ۲۵)

> (یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کر چکا ہے، اور جنگ حنین کے موقعے پر بھی تمھاری مدد کی جب کہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے۔ وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین تمام وسعت کے باوجود تمھارے لیے تنگ ہو گئی۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔)

یہ نہایت نازک وقت تھا، فتح مکہ پر ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ حنین کے میدان میں دشمن کے مقابلے میں مسلمان شکست کھا گئے۔ اس شکست کے کیا وجوہ و اسباب تھے، اس کا تذکرہ حدیث و تاریخ کی کتابوں میں پوری تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن ان سطور میں ہمارا تعلق صرف قرآن کی روشنی میں آنحضرت سے متعلق واقعات بیان کرنا ہے، اس لیے ہم قرآن کے حوالے سے یہ عرض کریں گے کہ اس شکست کی اصل وجہ مسلمانوں کا اپنی کثرت تعداد پر اظہار عجب و غرور تھا۔ قرآن کہتا ہے۔

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (التوبہ: ۲۵)

یعنی یہ وہ وقت تھا جب تمھارے ذہن میں اپنی تعداد کے بڑھ جانے کا غرہ پیدا ہو گیا تھا اور تم یہ سوچنے لگے تھے کہ عددی اعتبار سے ہم دشمن سے کئی زیادہ

ہیں، اب ہم شکست و ہزیمت سے دوچار نہیں ہو سکتے۔

لیکن اللہ نے کرم فرمایا اور اس کی نظر رحمت کا کرشمہ سامنے آیا کہ اس شدید اضطراب کے فوراً بعد یہ شکست، واضح فتح میں بدل گئی اور اس تھوڑی دیر کی تکلیف نے جس نے پھیل کر آنحضرت سمیت تمام مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، ختم ہو گئی۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۝ (التوبہ: ۲۶)

(پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمھیں نظر نہیں آتی تھیں، اور ان لوگوں کو عذاب سے دوچار کیا، جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور یہی جزا ہے ان لوگوں کی جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔)

یعنی اللہ نے مسلمانوں کی مدد کی، ان کو ذہنی اور قلبی سکون کی نعمت سے نوازا اور وہ منکرین حق کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ میدان ان کے ہاتھ میں آیا اور مخالف فوجیں بھاگ گئیں۔

کثرت تعداد بہت اچھی چیز ہے اور اس سے فائدہ پہنچتا ہے، لیکن اس پر اترانا اور کامل بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہر قسم کے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دینا چاہیے اور یہ ذہن میں رکھنا چاہیے

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (البقرہ: ۲۴۹)

(کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آگئیں۔)

## جنگ تبوک

عہد نبوت میں اہل روم کی حکومت دنیا بھر کی سب سے بڑی اور طاقت ور حکومت تھی۔ اس کے بادشاہ کو قیصر روم کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ دوسری طاقت ور حکومت ایران کی تھی، جس کا

حکمران کسریٰ ایران کے لقب سے معروف تھا۔

۹ ہجری کا واقعہ ہے کہ ملک شام سے ایک قافلہ آیا، جس نے اہل مدینہ کو اطلاع دی کہ قیصر روم کی فوجیں مدینے پر حملہ کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو رہی ہیں۔ اس سے کچھ عرصہ پیشتر قیصر کی فوج ایک زبردست لڑائی میں ایران کو شکست دے چکی تھی، اس لیے پوری دنیا میں قیصر کی فوجی طاقت کی دھوم تھی۔

یہ خبر سن کر نبی ﷺ نے خیال فرمایا کہ حملہ آور فوج کو عرب کی سرزمین میں داخل نہ ہونے دیا جائے، اس علاقے سے باہر ہی اس کا مقابلہ کیا جائے۔ چناں چہ آپؐ نے تمام قبائل عرب اور قرب و جوار کی علاقوں کو جنگ کی تیاری کے لیے حکم دیا۔ وہ سخت گرمی کا زمانہ تھا اور مسلمان زیادہ تر بے سرو سامان تھے۔ بعض لوگ تو انتہائی غربت کی حالت میں تھے۔ نبی ﷺ نے جنگ کے لیے لوگوں سے چندہ دینے کا اعلان فرمایا۔ اونٹ، گھوڑے اور خچر وغیرہ دینے کی اپیل بھی کی۔ چناں چہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب سے زیادہ مدد دی، اونٹ اور گھوڑے بھی دیے اور چاندی وغیرہ بھی دی۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی اس مد میں بہت کچھ جمع کرایا۔ یہ مسلمانوں کی عسرت کا زمانہ تھا، اس لیے اسے "جیش عسرت" بھی کہا جاتا ہے۔

اس جنگ کا ذکر سورہ توبہ کی آیت نمبر ۴۲ سے ۵۹ تک، ۸۱ سے ۸۳ تک اور ۹۰ سے ۹۶ تک کیا گیا ہے۔ ان آیات میں قرآن نے اپنے اندازِ خاص سے جنگ سے متعلق اہم واقعات کی نشان دہی کی ہے۔

منافقین کی یہ حالت تھی کہ زیادہ چندہ دینے والوں کو ریاکار قرار دیتے تھے اور جو لوگ اپنی محنت مزدوری سے کما کر تھوڑا دیتے تھے، ان کا تمسخر اڑاتے تھے کہ یہ چند کھجوروں سے سامان جنگ جمع کر کے قیصر روم کو فتح کرنے چلے ہیں۔ قرآن ان کے اس انداز کلام کے بارے میں کہتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ
وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط (التوبہ: ۷۹)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ خوش دلی کے ساتھ خیرات کرنے والے

مومنوں پر ریاکاری کا عیب لگاتے ہیں اور جن مومنوں کو اپنی محنت مشقت کی کمائی کے سوا کچھ میسر نہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔)

جب جنگ کے لیے اعلان ہوا، اور لسان نبوت سے نفیر عام کی صدا مسلمانوں کے کانوں میں پڑی تو ان میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جو آنحضرت کی رکاب میں جنگ میں جانے کے لیے بے تاب تھے، مگر ان کے پاس نہ سواری تھی اور نہ تھوڑا بہت سامان جنگ تھا۔ وہ لوگ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوتے تھے کہ ان کے لیے سواری کا انتظام فرمایا جائے تاکہ وہ جنگ میں شامل ہو سکیں۔ سفر بہت دور دراز کا تھا اور نہایت مشکل بھی تھا۔ آنحضرت انھیں سواری فراہم کرنے سے معذرت کرتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

إِذَا مَآ أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ○

(التوبہ: ۹۲)

(ان کا حال یہ تھا کہ وہ تیرے پاس آتے کہ ان کے لیے سواری بہم پہنچا دیں، تو جب آپ ان سے کہتے کہ میرے پاس تمھارے لیے کوئی سواری نہیں ہے تو وہ اس طرح بے بس ہو کر لوٹ جاتے کہ ان کی آنکھیں اس افسوس کی وجہ سے اشک بار ہوتیں کہ اس راہ میں خرچ کرنے کے لیے انھیں کچھ بھی میسر نہیں۔)

اندازہ کیجیے۔ مسلمانوں کا جذبہ جہاد کس درجے تیز تھا اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کے لیے وہ دل میں کس قدر شوق اور تڑپ رکھتے تھے۔ وہ ہر آن یہ خدمت سرانجام دینے کے لیے تیار رہتے اور اس راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ بڑھ کر قدم رکھتے، ان کا کردار نہایت سچا اور صحیح تھا۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی وہ میدان وغا میں گامزن رہتے تھے۔

اس زمانے میں کوئی سرکاری فوج نہ تھی، نہ رضا کاروں کی کوئی تنظیم تھی، نہ فوجیوں کے مصارف کے لیے حکومت کے پاس کوئی خاص انتظام یا خزانہ تھا۔ سارا معاشرہ فوجی اور رضا کار تھا

اور ملکی دفاع کے لیے سب پر برابر کے فرائض عائد ہوتے تھے۔ فوج کا ہر شخص اپنا بوجھ خود برداشت کرتا تھا، خرچ بھی اپنا، زاد راہ بھی اپنا، سواری بھی اپنی، بلکہ حکم یہ تھا کہ اگر کوئی فوجی مقدرت رکھتا ہو تو دوسرے کی بھی مدد کرے۔ ان حالات میں قرآن کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اتنا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس پر کوئی الزام: نہیں، وہ بے شک جنگ میں شریک نہ ہو۔

جن لوگوں کو شرکت جہاد سے مستثنیٰ کیا گیا، ان کا ذکر قرآن میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلاَ عَلَى الْمَرْضٰى وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَ يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَاعَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ط (التوبہ: ۹۱)

(ناتوانوں پر، بیماروں پر اور ایسے لوگوں پر جنھیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں، کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں کوشاں رہیں۔ یاد رہے! نیک عمل لوگوں پر الزام کی کوئی وجہ نہیں۔)

غرض ۹ ہجری کے رجب کے مہینے میں نبی ﷺ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ منورہ سے تبوک کو روانہ ہوئے۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ آپ بہت سی مشکل منزلوں سے گزرتے ہوئے تبوک پہنچے۔ راستے میں وہ عبرت ناک مقامات بھی آئے، جن میں سے بعض کا قرآن میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً قوم ثمود کے مکانات آئے جو پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ اس مقام پر قوم ثمود کی نافرمانی کے باعث چوں کہ عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا، لہٰذا آنحضرت نے حکم دیا کہ کوئی شخص نہ یہاں قیام کرے، نہ پانی پیئے اور نہ یہاں کی کسی چیز کو استعمال میں لائے۔

نبی ﷺ وہاں بیس دن قیام فرما رہے، لیکن دشمن نہ وہاں تھا اور نہ مقابلے میں آیا۔۔۔۔۔

اس اثنا میں آنحضرت کی خدمت میں مختلف مقامات کے بہت سے قبائل کے سرکردہ لوگ حاضر ہوئے اور صلح و آشتی کے معاہدے کیے۔ تبوک سے آپ مدینے تشریف لائے۔

## مسجد ضرار

جنگ تبوک کے سلسلے کا ایک نہایت اہم واقعہ اس مسجد کی تعمیر کا ہے، جسے تاریخ اسلامی میں "مسجد ضرار" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے "قباء" کے مقام میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ یہاں آپ کے حکم سے ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی، جو مدینہ میں دورِ اسلام کی پہلی مسجد تھی اور وہ "مسجد قباء" کے نام سے مشہور ہوئی۔

بعض منافقوں نے جن کی تعداد روایات میں بارہ بتائی جاتی ہے، مسجد قبا کے قریب ایک مسجد تعمیر کی۔ نبی ﷺ جب جنگ تبوک کی غرض سے مدینہ سے روانہ ہونے لگے تو منافقوں نے آپ سے عرض کیا کہ کسی دن اس مسجد میں نماز پڑھا دیجیے۔

آپ نے فرمایا، اب تو میں سفر پر جا رہا ہوں۔ واپس آکر ہی اس سلسلے میں کچھ کہا جا سکے گا۔

آپ واپس تشریف لائے تو وہ آیات نازل ہوئیں، جن میں آپ کو اللہ نے ان مقاصد سے مطلع فرمایا جو مسجد کی تعمیر میں منافقوں کے پیش نظر تھے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (التوبہ.۱۰۷)

(اور وہ منافق جنھوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنائی کہ نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مومنوں میں اختلاف ڈالیں اور ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کر چکے ہیں۔ وہ لوگ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مقصد فقط بھلائی ہے، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنی قسموں میں جھوٹے ہیں۔)

انھوں نے یہی کہا تھا کہ ہر شخص کا مسجد قبا میں جانا مشکل ہے، کوئی بوڑھا ہے، کوئی بیمار ہے، کوئی مریض ہے، کوئی معذور ہے اور چلنے پھرنے سے عاجز ہے، لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ایک

اور مسجد تعمیر کی جائے تاکہ اس کے قرب و جوار کے لوگ آسانی سے اس مسجد میں آکر نماز پڑھ سکیں۔ یہ بات انھوں نے قسمیں کھا کر کہی۔ لیکن اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ اپنی قسموں میں جھوٹے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر سے ان کے نزدیک مسلمانوں کی بھلائی مقصود نہیں، بلکہ اس کی تہہ میں چار چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا۔

۲۔ کفر کرنا۔

۳۔ مومنوں میں تفرقہ ڈالنا۔

۴۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسرپیکار رہے ہیں، ان کے لیے ایک کمین گاہ تیار کرنا۔ تاکہ وہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتے اور انھیں اذیتیں پہنچاتے رہیں۔

فرمایا ان غلط مقاصد کی وجہ سے اے پیغمبر! اس مسجد کا ہرگز کبھی رخ نہ کرنا۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (التوبہ: ۱۰۸)

(تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا، تمھارے کھڑے ہونے کی اصل حق دار وہی مسجد ہے، جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہ لوگ آتے ہیں جو پاک و صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ پاک و صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔)

اللہ کے نزدیک اصل شے دل کی پاکیزگی، ضمیر کی صفائی، ذہن و فکر کی طہارت اور تقویٰ ہے، اور مسجد قبا میں آنے جانے والے انھی اوصاف کے حامل ہیں، لہٰذا بارگاہ خداوندی میں اصل قدر و قیمت انھی لوگوں کی ہے اور یہی لوگ اللہ کے دربار میں فضل و کمال کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے آنحضرت سے فرمایا:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ

بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ (التوبہ: ۱۰۹)

(کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوش نودی پر رکھی یا وہ جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ اپنے مکین سمیت آتش دوزخ میں جا گری؟)

اس کے بعد نبی ﷺ کے حکم سے یہ مسجد گرا دی گئی تھی۔

## متخلفین

جنگ تبوک کا زمانہ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا' سخت گرمی اور تکلیف کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی مالی حالت بھی اس وقت بہت کم زور تھی۔ نبی ﷺ جنگ سے واپس تشریف لائے تو حسب معمول پہلے مسجد میں گئے اور دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی وقت وہ لوگ حاضر خدمت ہونا شروع ہو گئے جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان کی تعداد ۸۰ سے زیادہ تھی۔ ان لوگوں نے جنگ میں عدم شرکت کے مختلف عذر پیش کیے اور آنحضرت نے ان کے عذر قبول فرمائے۔ ان لوگوں کو جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے اور گھروں میں رہ گئے تھے "متخلفین" کہا جاتا ہے۔ قرآن آنحضرت سے کہتا ہے کہ یہ آپ کے پاس آئیں گے اور شریک سفر نہ ہونے پر معذرت کریں گے اور ان کی کوشش ہو گی کہ معذرت کا انداز ایسا اختیار کریں کہ آپ سن کر اسے صحیح تسلیم کر لیں اور مطمئن ہو جائیں۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ (التوبہ: ۹۶)

(یہ آپ کے سامنے قسمیں کھائیں گے تا کہ آپ ان سے راضی ہو جائیں۔)

متخلفین میں تین آدمی وہ تھے' جن کا معاملہ سب سے الگ تھا' اسی لیے قرآن نے ان کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔ وہ تھے:

۱۔ کعب بن مالک۔

۲۔ ہلال بن امیہ۔

۳۔ مرارہ بن ربیع۔

کعب بن مالک کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ ان تہتر سابقین انصار میں سے تھے' جنھوں نے عقبہ ثانیہ میں آنحضرت کی بیعت کا شرف حاصل کیا تھا' اور ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع دونوں بدری تھے۔ یعنی ان جاں نثاروں میں سے تھے' جو جنگ بدر میں شامل ہوئے تھے۔ ان تینوں سے لغزش ہوئی اور جنگ تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ لوگ آنحضرت کی خدمت میں پیش ہو کر عذر بیان کرتے رہے اور آنحضرت معاف فرماتے رہے۔ لیکن ان تینوں نے کوئی عذر نہیں پیش کیا اور صاف لفظوں میں تسلیم کر لیا کہ ان سے سستی ہوئی اور شرکت جنگ کی سعادت سے محروم رہے۔

آپ نے ان سے فرمایا: اچھا تم اپنے بارے میں اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔

اب یہ اللہ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں اور لوگوں نے ان سے میل جول بند کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر کے افراد اور بیویوں کا بھی ان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ گلی محلے اور شہر میں ان کا معاملہ بالکل اجنبیوں کا سا تھا۔ حالاں کہ یہ اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی مالی حالت بھی اچھی تھی۔ پچاس دن اسی حالت مقاطعہ میں گزر گئے اور یہ عرصہ انھوں نے نہایت پریشانی کی حالت میں گزارا۔ ٹھیک پچاسویں دن اللہ کی طرف سے انھیں یہ نوید سنائی گئی اور اللہ کا حکم نازل ہوا۔

**وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ اِلَّآ اِلَيْهِ ط ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○**

(التوبہ: ۱۱۸)

(اور ان تین شخصوں پر بھی اللہ کی رحمت ہوئی' جو چھوڑ دیے گئے تھے' جب کہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے لیے تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنے آپ سے تنگ آ گئے تھے اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی' پناہ صرف اسی کے دامن میں ہے۔ پس اللہ کا کرم ان پر لوٹ آیا تاکہ وہ توبہ کریں۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے توبہ قبول کرنے والا'

بہت ہی رحمت والا ہے۔)

اس واقعہ سے پتا چلا کہ ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدمت حق کو اپنا شب و روز کا معمول قرار دیے رکھے۔ اس سے ہرگز تساہل نہ کرے۔ تساہل سے کام لینا اللہ کی بارگاہ میں بہت بڑا جرم ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہے۔

نیز معلوم ہوا کہ اسلامی احکام کے سلسلے میں کسی سے کوئی رعایت نہیں کرنی چاہیے۔

اس واقعہ کا تعلق بھی سیرت نبوی کے اس حصے سے ہے جو قرآن میں بیان فرمایا گیا ہے۔

* * *

## (۴۷)

# عہد نبوت کی جنگیں

نبی ﷺ کے عہد نبوت کے تیرہ سال مکرمہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ منورہ میں گزرے۔ اللہ کی طرف سے جہاد کی اجازت مدینہ شریف میں ہوئی۔ آپ کی حیات مطہرہ میں چھوٹی بڑی ۸۲ جنگیں ہوئیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں نہ کسی فریق کا نقصان ہوا' نہ کسی کو فائدہ پہنچا۔ بس حملے یا چھیڑ چھاڑ کی کسی نے اطلاع دی' اصل صورت حال معلوم کرنے کے لیے باہر گئے اور آگئے۔

آنحضرت کے دور کے جہاد کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ جن معرکوں میں خود آپؐ نے شرکت کی' انھیں "غزوہ" کہا جاتا ہے اور جن میں آپؐ شریک نہیں ہوئے' وہ "سریہ" کے نام سے موسوم ہیں۔ آپ نے انیس جنگوں میں شرکت فرمائی اور وہ غزوہ کہلائیں۔ باقی چھوٹی موٹی تریسٹھ جنگیں ہوئیں' جن میں صحابہ نے (تھوڑی یا زیادہ تعداد میں) شرکت کی' انھیں "سرایا" کہا گیا۔

دس سال کی ان تمام ۸۲ جنگوں میں (جن میں سے اکثر کو جنگ کہنا لفظ "جنگ" کا مضحکہ اڑانا ہے) دونوں فریقوں کا جانی نقصان کیا ہوا؟ کل نو سو اٹھارہ آدمی قتل اور ایک سو ستائیس زخمی ہوئے۔۔۔ کافروں کے ۶۵۶۵ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوئے۔ ان میں بھی زیادہ تر تعداد جو چھ ہزار تک پہنچتی ہے' جنگ حنین کے لوگوں کی ہے جو مسلمانوں کی قید میں آئے۔ ان قیدیوں کا معاملہ بھی یہ ہوا کہ ان میں سے ۶۳۴۷ کو نبی ﷺ نے رہا کر دیا تھا۔ دو بعض جرائم کی پاداش میں قتل کر دیے گئے تھے۔ باقی ۲۱۵ قیدی ایسے رہ جاتے ہیں' جن کے متعلق کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

ان جنگوں میں وہ اٹھ جنگیں بھی شامل ہیں' جن کا ذکر قرآن حکیم میں کیا گیا ہے اور ان کے متعلق ضروری واقعات گزشتہ سطور میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

اب آیئے ان لوگوں کی طرف جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے بے شمار غیر مسلموں کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے، ملاحظہ کیجیے۔

## پہلی جنگ عظیم

۴۔ اگست ۱۹۱۴ کا واقعہ ہے کہ لوگوں کو جنگ کا شعلہ وسط یورپ میں چمکتا ہوا دکھائی دیا اور پھر چند ہی روز میں وہ بہت بڑی آگ کی شکل اختیار کر گیا جس نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ہوا یہ کہ آسٹریا کا ولی عہد ۲۱۔ مئی ۱۹۱۴ کو سرویا میں قتل کر دیا گیا۔ آسٹریا نے اس کے نتیجے میں سرویا کو اتنی سخت شرائط پیش کیں کہ سرویا نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آسٹریا نے طیش میں آکر سرویا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ روس نے سرویا کی حمایت کی۔ روس کا فرانس کے ساتھ کئی برس پہلے ایک معاہدہ ہوا تھا، فرانس اس معاہدے کی بنا پر روس کا حامی بن کر سامنے آگیا۔ اس پر کچھ دن گزرے تھے کہ جرمنی نے فرانس پر حملے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے اپنی فوجیں بلجیم سے گزارنا چاہیں، بلجیم نے جرمنی کی فوجوں کو اپنا ملک استعمال کرنے اور راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ سے جرمنی نے بلجیم پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے بلجیم کی حمایت کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اپنی فوجیں فرانس کی طرف روانہ کر دیں۔ بس پھر کیا تھا، بہت جلد زبردست جنگ شروع ہو گئی، جسے یورپ کی جنگی تاریخ میں پہلی عالم گیر جنگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس دور کے واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور ترکی کی فوجیں ایک محاذ پر کھڑی تھیں ــــــ روس، فرانس، بلجیئم، برطانیہ، اٹلی، رومانیہ، سرویا، پرتگال، یونان اور امریکہ کے عساکر اس کے بالمقابل دوسرے محاذ پر کھڑے تھے۔ جرمنی سامان جنگ کے اعتبار سے تمام ملکوں سے آگے تھا، اس لیے ۱۹۱۷ء تک وہ اور اس کی حلیف طاقتیں میدان مارتی رہیں۔ اس اثنا میں سرویا، بلجیئم اور رومانیہ پر جرمن فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ فرانس کے مشرقی حصے اور اٹلی کے شمال مشرقی حصے بھی جرمن فوجوں کے تسلط میں آگئے۔ ادھر روس میں انقلاب بپا ہو گیا اور اس کی حکومت بدل گئی۔ نئی حکومت نے جرمنی کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ حالات ایسے پیدا

ہو گئے تھے کہ اندازہ ہوتا تھا جرمن فوجیں فرانس پر قبضہ کر لیں گی۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں امریکہ جنگ میں کود پڑا اور جنگ کی تمام صورت حال بدل گئی۔ امریکہ کی فوجیں بالکل تازہ دم تھیں اور سامان جنگ بھی ان کے پاس بہت بڑی مقدار میں تھا' جس کا جرمن فوجیں مقابلہ نہ کر سکیں۔ بالآخر یہ ہوا کہ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور اس اس کے ساتھیوں نے حریف کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ اس نے برطانیہ کی مالی اور فوجی اعتبار سے بے پناہ مدد کی۔ تنہا ہندوستان کی فوج کم و بیش دس لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ برطانیہ کی حمایت میں شام' فلسطین' فرانس' عراق' عرب اور مشرقی افریقہ کے میدانوں میں دشمن کے مقابلے میں نہایت بہادری سے لڑے۔ ان میں چھتیس ہزار افراد مارے گئے اور ستر ہزار زخمی ہوئے۔ یہ ایک سرسری سا اندازہ ہے۔

## یورپ وغیرہ کے مقتولین

اب آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں یورپ اور دیگر ممالک کے لوگ کتنی بڑی تعداد میں مارے گئے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار ہم حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی تصنیف رحمتہ للعالمین کی جلد دوم (ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور' مطبوعہ ۱۹۶۲ء) کے صفحہ ۲۲۰' ۲۲۱ کے حاشیے سے نقل کر رہے ہیں۔ اس کے لیے حضرت قاضی صاحب نے ۱۷۔ اپریل ۱۹۱۶ء کے اخبار "ہمدم" کا حوالہ دیا ہے۔

۱۔ روس سترہ لاکھ۔

۲۔ جرمنی سولہ لاکھ۔

۳۔ فرانس تیرہ لاکھ ستر ہزار۔

۴۔ اٹلی چار لاکھ ساٹھ ہزار۔

۵۔ آسٹریا آٹھ لاکھ۔

۶۔ برطانیہ سات لاکھ چھے ہزار۔

۷۔ ترکی دو لاکھ پچاس ہزار۔

۸۔ بلجیئم ایک لاکھ دو ہزار۔

۹۔ بلغاریہ ایک لاکھ۔

۱۰۔ رومانیہ ایک لاکھ۔

۱۱۔ سرویا ایک لاکھ۔

۱۲۔ امریکہ پچاس ہزار۔

یہ اعداد و شمار درج کرنے کے بعد قاضی صاحب لکھتے ہیں:

مضمون نگار کو شک ہے کہ انگلستان اور فرانس کی تعداد میں ہندوستان اور فرانس کی نو آبادیوں کے مقتولین کی تعداد بھی شامل ہے یا نہیں۔ مگر اسے یہ اصرار ہے کہ زخمیوں، اسیروں اور گم شدگان کی تعداد مذکورہ بالا اعداد میں شامل نہیں۔

یہ جنگ پانچ سال جاری رہی تھی اور پانچ سال میں اتنے لوگ مروا دیے گئے جب کہ جنگ نہ مذہبی تھی، نہ دینی۔ معلوم نہیں یہ لوگ کس منہ سے اسلامی جہاد پر اعتراض کرتے ہیں۔

افسوس ہے دوسری جنگ عظیم کے مقتولین کی تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ جنگ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی اور جون ۱۹۴۵ میں اختتام کو پہنچی تھی۔۔۔۔۔ لیکن صحیح تعداد کا علم نہ ہونے کے باوجود اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مقتولین کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس جنگ میں اتحادیوں نے جاپان پر ہائیڈروجن بم پھینکے تھے، جس کے اثرات اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے بے شمار لوگ تباہ ہو گئے تھے۔

* * *

## (۲۸)

# واقعۂ اِفک

۵ یا ۶ ہجری کے شعبان کا مہینہ تھا کہ غزوۂ بنی مصطلق کا واقعہ پیش آیا۔ یہ کوئی زیادہ اہم غزوہ نہ تھا۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کے سردار کا نام حارث بن ابی ضرار تھا۔ نبی ﷺ کو اطلاع ملی کہ حارث بن ضرار اپنے قبیلے کے لوگوں اور بعض دوسرے عرب قبیلوں کی رکاب میں جنگ کے لیے آرہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تحقیق کے لیے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ وہ حارث بن ابی ضرار سے ملے اور واپس آکر آنحضرت ﷺ کو تمام حالات سے مطلع کیا۔

## غزوے میں منافقین کی شرکت

اس کے بعد ۵ ہجری یا ۶ ہجری کے شعبان کی ۶ تاریخ کو خود آنحضرت ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بنو مصطلق کی طرف روانہ ہوئے۔ منافقین کا ایک گروہ بھی آپؐ کے ہمراہ جنگ کے لیے چل پڑا۔ حارث بن ابی ضرار اور ان کے ساتھیوں کو آپؐ کی روانگی کا علم ہوا تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور ادھر ادھر بکھر گئے۔ آپؐ چشمہ مریسیع کے قریب پہنچے تو بنو مصطلق کے لوگوں نے آپؐ سے جنگ کا فیصلہ کرلیا۔ آپؐ نے صحابہ کی رفاقت میں اس قبیلے پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوئے۔

منافقین کا سرغنہ عبداللہ بن ابی بھی آپ کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں جو واقعات پیش آئے ان میں ''افک'' کا واقعہ انتہائی اذیت ناک ہے، جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور آنحضرت کی سیرت مقدسہ سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

## واقعہ کا پس منظر

وہ واقعہ یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس غزوے میں نبی ﷺ کے ہمراہ تھیں اور اپنی بہن سے عاریتہ ہار لے گئی تھیں۔ غزوے سے واپسی کے وقت فوج نے ایک

جگہ قیام کیا۔ حضرت عائشہ رفع حاجت کے لیے گئیں تو اتفاق سے ہار گر گیا۔ پتا چلا تو اسی وقت وہاں گئیں، جہاں ہار گرنے کا شبہہ ہوا تھا۔ اس اثنا میں قافلے کو وہاں سے چلنے کا اعلان ہو گیا۔ جو صحابہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہودج اٹھا کر اونٹ پر لادا کرتے تھے، وہ آئے اور ہودج اونٹ پر لاد دیا۔ حضرت عائشہ دبلی پتلی تھیں، ان کا زیادہ وزن نہ تھا، انھوں نے سمجھا کہ وہ ہودج ہی میں ہیں، حضرت عائشہ کو ہار ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگ گئی تھی، وہ آئیں تو قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھ گئیں، انھیں خیال تھا کہ جب آنحضرت اور آپ کے رفقا کو میری عدم موجودگی کا پتا چلے گا تو تلاش کے لیے یہیں آئیں گے۔ بیٹھے بیٹھے ان پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گئیں۔

آنحضرت کے صحابی حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ جو قافلے سے بہت پیچھے تھے، وہ وہاں آئے تو انھوں نے حضرت عائشہ کو پہچان لیا، اس لیے کہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے انھوں نے ان کو دیکھا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر انھوں نے کہا: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ یہ آنحضرت کی زوجۂ محترمہ؟ یہ الفاظ سنتے ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔ حضرت صفوان نے ان کے قریب اونٹنی بٹھا دی اور وہ اس پر سوار ہو گئیں۔ حضرت صفوان نے اونٹنی کی نکیل پکڑی اور چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ جہاں فوج نے پڑاؤ کیا تھا، دوپہر کے وقت وہاں پہنچ گئے۔

## منافقین کی باتیں

منافقوں کا سرغنہ عبداللہ بن ابی بھی اس فوج میں شامل تھا۔ اس نے جب یہ صورت حال دیکھی تو مختلف قسم کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ مدینے آ کر وہ اور اس کے ساتھی اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگے۔ آنحضرت خاموش تھے، کسی بات کا کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ کافی دن گزر گئے، اس دوران میں اللہ کی طرف سے کوئی وحی بھی نازل نہ ہوئی۔

## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ

آپ ؐ نے اس واقعہ کے سلسلے میں بعض صحابہ سے مشورہ کیا جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ انھوں نے اشارے کنائے میں حضرت عائشہ سے علیحدگی اختیار کرنے اور کسی دوسری

خاتون سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن حضرت اسامہ بنٹھ اور بعض دیگر صحابہ نے عرض کیا کہ علیحدگی نہیں اختیار کرنی چاہیے اور باتیں بنانے والوں کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

## حضرت عائشہ کی بیماری

دوسری طرف حضرت عائشہ کا یہ حال تھا کہ وہ غزوہ سے واپس آتے ہی بیمار پڑ گئیں اور مسلسل ایک مہینہ بیمار رہیں۔ انھیں اس تہمت کا علم نہ تھا۔ البتہ یہ بات ان کے ذہن میں آتی تھی کہ اس سے قبل اگر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتیں تو آنحضرت ﷺ بار بار پوچھتے تھے، لیکن اس بیماری کے دنوں میں زیادہ توجہ نہیں فرمائی، معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔

## حضرت عائشہ کی حالت

کچھ دنوں کے بعد بیماری ختم ہوئی اور وہ صحت یاب ہوئیں تو ایک رات ام مسطح کے ساتھ رفع حاجت کے لیے باہر گئیں۔ چلتے چلتے ام مسطح کا پاؤں ان کی چادر میں پھنس گیا اور وہ پھسل گئیں۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے بیٹے مسطح کو بد دعا دی۔ حضرت عائشہ نے انھیں اس سے روکا اور کہا کہ آپ اسے بد دعا نہ دیں۔

اب انھوں نے حضرت عائشہ کو پورا واقعہ سنایا اور بتایا کہ اس کو پھیلانے والوں میں مسطح بھی شامل ہے۔ مسطح کے علاوہ حضرت حسان بن ثابت بھی ان لوگوں کے ہم نوا تھے۔ حضرت حمنہ بنت جحش کا شمار بھی انہی میں ہوتا تھا۔

حضرت عائشہ کو یہ واقعہ سن کر ظاہر ہے کہ نہایت صدمہ پہنچا اور انتہائی مغموم ہوئیں۔ واپس آئیں تو آنحضرت سے اجازت لے کر اپنے والدین کے گھر چلی گئیں تاکہ معاملے کی اصل تفصیل سے مطلع ہو سکیں۔ جب انھیں تفصیل سنائی گئی تو بے اختیار رونے لگیں اور دو راتیں اور ایک دن یہی کیفیت رہی۔۔ وہ اسی کیفیت میں مبتلا تھیں کہ نبی ﷺ تشریف لائے اور خطبہ پڑھ کر فرمایا۔

## آنحضرت ﷺ کی حضرت عائشہ کی گفتگو

عائشہ! مجھ تک تمہارے متعلق یہ بات پہنچی ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو اللہ بہت جلد تمہاری برأت فرمادے گا اور اگر تم کسی گناہ کی مرتکب ہوگئی ہو تو اللہ کے حضور توبہ کرو اور بخشش کی دعا مانگو۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا اور مغفرت کے طالبوں کی مغفرت فرماتا ہے۔

اس وقت حضرت عائشہ کے آنسو بالکل تھم گئے تھے۔ انھوں نے اپنے والدین سے کہا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کا جواب دیں۔ لیکن انھوں نے جواب نہیں دیا۔ حضرت عائشہ نے خود ہی جواب دیا اور کہا۔

میں جانتی ہوں کہ یہ بات مسلسل سنتے سنتے آپ لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گئی ہے اور آپ نے اسے صحیح سمجھ لیا ہے، اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ میں اس سے قطعی طور سے بری ہوں۔۔۔۔ اور اللہ کو خوب علم ہے کہ میں بری ہوں۔۔۔۔ تو آپ میری بات کو مبنی بر صحت نہیں قرار دیں گے اور اگر میں کہوں کہ میں مرتکب معصیت ہوں۔۔۔۔ اور اللہ کو خوب علم ہے کہ میں مرتکب معصیت نہیں ہوں۔۔۔۔ تو آپ لوگ اسے صحیح مان لیں گے۔ ان حالات میں میری اور آپ لوگوں کی کیفیت وہی ہے جس کا اظہار حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان الفاظ میں کیا تھا۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ (یوسف: ۱۸)

(صبر سے کام لینا ہی بہتر ہے اور آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ کی مدد مطلوب ہے۔)

یہ الفاظ کہہ کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا[۱] وہاں سے اٹھیں اور دوسری طرف جا کر لیٹ گئیں۔ اب اللہ کی مدد آتی ہے جس کی حضرت عائشہ نے اللہ سے التجا کی تھی۔

## بارگاہ الٰہی سے حضرت عائشہ کی برأت

اسی وقت رسول اللہ ﷺ پر وہی کیفیت اور شدت طاری ہوگئی جس کا ظہور نزول وحی کے وقت ہوا کرتا تھا۔ وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو آنحضرت ﷺ مسکرا رہے تھے۔ اس کے بعد پہلی بات ج

لسان نبوت سے ادا ہوئی، یہ تھی

"عائشہ! اللہ نے آپ کی برأت کا اعلان فرما دیا۔"

اب نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ نے کہا:

"عائشہ! آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آؤ اور آپ ؐ کا شکریہ ادا کرو۔"

جواب دیا: میں اس پر اللہ کی حمد بیان کروں گی جس نے مجھے بری فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے تو مجھے بری نہیں کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں سورہ نور کی (آیت نمبر ۱۱ سے آیت نمبر ۲۰ تک) دس آیتیں نازل ہوئیں۔ پہلی آیت یہ ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ط لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ
ط بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ط لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ج
وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (نور: ۱۱)

(جن لوگوں نے ایک جھوٹی بات تراش لی وہ تم ہی میں کا ایک گروہ ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ تمہارے لیے برا ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ بہتر ہی ہوا۔ ان میں سے ہر ایک وہ نتیجہ ضرور پائے گا جو اپنی گناہ کی کمائی سے اس کے حصے میں آیا۔ ان لوگوں میں سے جس کسی نے اس جھوٹے معاملے میں نمایاں طور سے حصہ لیا اور اسے پھیلایا ہے، اس کے لیے بڑا ہی سخت عذاب ہے۔)

قرآن نے اس الزام تراشی کو "افک" (یعنی جھوٹ اور الزام تراشی) سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا سیرت نبوی کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات میں اسی لفظ سے یہ واقعہ مشہور ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک خاص گروہ نے اسے پھیلایا ہے اور وہ گروہ یہی کہتا ہے کہ اس کا تعلق مسلمانوں میں سے ہے، عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ۔ لیکن دراصل یہ منافقوں کا گروہ ہے اور اس کا سرغنہ عبد اللہ بن ابی ہے جس کے متعلق قرآن وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ۔ کے الفاظ استعمال کرتا ہے

اس سے اگلی آیت میں قرآن مسلمانوں سے سختی کے ساتھ کہتا ہے کہ تم نے یہ بات سنتے ہی

کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ قطعاً جھوٹی بات ہے۔ تمھیں اسی وقت اس کی تکذیب کر دینی چاہیے تھی‘ جب یہ بات تمھارے کانوں میں پڑی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔ (نور: ۱۲)

(جب تم نے ایسی (بے ہودہ) بات سنی تو کیوں اس حقیقت کی طرف تمھارا ذہن نہیں گیا کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایک دوسرے کے بارے میں نیک گمان رکھنا چاہیے۔ تم نے کیوں یہ نہ کہا کہ یہ بالکل گھڑی ہوئی جھوٹی بات ہے۔)

قرآن کہتا ہے کہ تم نے یہ بہت بڑا بہتان باندھا ہے‘ اگر اللہ کا فضل تمھارے شامل حال نہ ہوتا اور اس کی رحمت تم پر سایہ فگن نہ ہوتی تو اس بہتان کے نتیجے میں تمھیں شدید عذاب سے دوچار ہونا پڑتا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (نور: ۱۴)

(اگر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل تم کو میسر نہ آتا اور اس کی رحمت کی چادر تم پر تنی نہ ہوتی تو جس جرم کا تم نے ارتکاب کیا تھا اس کی وجہ سے تمھیں لازماً شدید عذاب میں مبتلا کیا جاتا۔)

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ تمھیں اس بات کی سنتے ہی تردید کر دینا چاہیے تھی اور اس کے متعلق زبان سے کوئی لفظ بھی نہیں کہنا چاہیے تھا۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمْ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○ (نور: ۱۶)

(جب تم نے ایسی غلط بات سنی تھی تو کیوں نہ بول اٹھے کہ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ایسی بات منہ سے نکالیں۔ خدایا! تو ہی پاک ہے۔ یہ تو بڑا ہی سخت بہتان

ہے۔)

اللہ تنبیہہ کرتا ہے کہ آئندہ ایسی بات ہرگز نہ کرنا۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (نور: ۱۷)

(اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے' اگر تم ایمان دار ہو تو پھر کبھی اس قسم کی بات نہ کرنا۔)

سورہ نور کی دس آیتوں میں یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بہتان طرازی کرنے والوں کو سخت سرزنش کی گئی ہے' اس لیے کہ ایک تو انھوں نے خاندان نبوت کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے دنیائے انسانیت کے سب سے بڑے گھر میں اختلاف پیدا کرنے اور ان کی معاشرتی زندگی کو ہدف طعن بنانے کے جرم کا ارتکاب کیا۔۔۔ لیکن جب اللہ نے معاملہ صاف کر دیا اور بارگاہ قدس سے حقیقت حال کو منقح فرما دیا گیا تو بعض حضرات نے ان لوگوں کی مالی مدد سے ہاتھ کھینچ لینے کا ارادہ کیا جو منافقین کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان کے ہم نوا ہو گئے تھے۔

وہ غریب اور تنگ دست لوگ تھے اور اسلام میں نہایت پختہ اور اس کے احکام کی بجا آوری میں انتہائی سخت تھے۔ بعض مال دار صحابہ ان کی کفالت کے کرتے تھے۔ لیکن اس واقعے کے بعد وہ ان کی کفالت سے دست کش ہونے کے مسئلہ پر غور کر رہے تھے۔ ان میں ایک حضرت مسطح بن اثاثہ بھی تھے' جن کی کفالت کی ذمے داری خود حضرت عائشہ صدیقہ کے والد مکرم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لے رکھی تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ ان تنگ دست صحابہ کی مدد کر رہے ہیں' وہ مدد کا سلسلہ جاری رکھیں اور انھوں نے جس جرم کا ارتکاب کیا ہے اس کی یہ سزا انھیں نہ دیں۔ اللہ کا کرم ملاحظہ ہو' وہ فرماتا ہے۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا
اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (نور: ۲۰)

(اور تم میں جو لوگ مال دار اور صاحب حیثیت ہیں' وہ رشتے داروں' مسکینوں

اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کی مدد سے اپنا ہاتھ نہ کھینچیں۔ انھیں چاہیے کہ ان کی غلطیاں معاف کر دیں اور ان سے درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھارے گناہ بخش دے؟ اللہ تو بڑا ہی بخشنے والا، رحمت والا ہے۔)

ایک مہینے کے بعد معاملہ صاف ہو گیا اور تمام غلط فہمیاں ختم ہو گئیں۔ عبداللہ بن ابی خاص طور سے انتہائی ذلیل ہوا۔ کوئی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ خود اس کے قریبی رشتے دار اس سے دور ہٹ گئے تھے۔

* * *

## (۲۹)

# منافقین کا گروہ

قرآن نے جہاں عہد نبوت کے مذاہب میں شرک و کفر' یہود و نصاریٰ اور صابئین کا ذکر کیا ہے' وہاں منافقین کا تذکرہ بھی تفصیل سے فرمایا ہے اور ان کی عادات و خصائل کی وضاحت کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ نفاق کیا ہے؟ منافق کون تھے اور یہ گروہ کس قسم کے اعمال و کردار کا حامل تھا؟

ہمارا یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے اور یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے علم میں آتی ہے کہ فکری اور عملی اعتبار سے دنیا میں تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

ایک وہ جو استعداد و صالحیت کے تمام اوصاف سے موصوف ہیں اور خیر کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتے اور ہر آن ان پر سرگرم عمل رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسرے وہ جو کسی اچھی بات کو نہیں مانتے اور ان کے سامنے اگر کوئی امر خیر پیش کیا جائے اور اس پر عمل کی تلقین کی جائے تو ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔

تیسرے وہ جو اچھی بات کانوں سے سنتے اور زبان سے اس کی اچھائی اقرار بھی کر لیتے ہیں لیکن ان کے دل اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی ذہنی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جرأت کر کے نہ اس پر عمل کرنے سے انکار کرتے ہیں اور نہ عزم و ہمت سے کام لے کر اس پر عمل کی دیواریں استوار کرتے ہیں۔ وہ کم ہمت اور ڈھلمل یقین لوگ ہیں' قرآن ان کے لیے "مذبذبین" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ (النساء: ۱۴۳)

(یعنی وہ کفر اور اسلام کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں' نہ پورے اس طرف ہیں اور نہ اس طرف۔)

وہ عزم و یقین اور حزم و ہمت سے عاری لوگ ہیں اور اسلام کا نام لے کر مسلمانوں کو دھوکا

دیتے ہیں۔ بے شک وہ نماز پڑھتے ہیں' لیکن ان کی نماز اللہ کی یاد سے خالی ہے' اس میں خشوع و خضوع نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ قرآن ان کی نماز کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ۝ (النساء: ۱۴۲)

(منافق خدا کو دھوکا دیتے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا نے انھیں دھوکا دینے میں بے بس کر رکھا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو نہایت سستی اور کاہلی کی کیفیت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور اس میں اللہ کا برائے نام ہی ذکر کرتے ہیں۔)

یعنی یہ لوگ اس قسم کا کردار ادا کرکے اپنی دانست میں یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اللہ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ حالاں کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ خود دھوکے میں مبتلا ہیں اور اللہ نے ان کے دھوکے میں انھیں مغلوب و بے بس کردیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک بات کو قبول کرنے کے لیے زبان سے اقرار تو کرلیا ہے' لیکن قبولیت حق سے ان کی روح خالی ہے۔ قدم عمل کے میدان میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹتے ہیں---- نہ اللہ ان کے اس عمل فریب کو قبول کرتا ہے' نہ اس کے رسول ﷺ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہے اور نہ مسلمان اسے کوئی مقام دینے کو تیار ہیں۔ بلکہ خود منکرین اسلام اور کافروں کے نزدیک بھی ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

ان کی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس جاتے ہیں تو انھیں کہتے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں اور کافروں سے ملتے ہیں تو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ ان کی اس ذہنی اور عملی کیفیت کا ذکر قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا

إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ (البقرہ: ۱۴)

(اور جب یہ لوگ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں، لیکن جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ہمارا اظہار ایمان تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم تمسخر کرتے ہیں۔)

اس کردار کے حامل لوگوں کو معاشرے کا کوئی شخص قابل اعتماد نہیں قرار دیتا۔ معاشرے میں اسی شخص کو لائق اعتماد سمجھا جاتا ہے جو اگرچہ کسی طرف ہو لیکن مضبوط موقف رکھتا ہو، تذبذب کے مرض سے جس کا ذہن صاف ہو۔ لیکن ان کا یہ حال ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۱)

(اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، حالاں کہ وہ خود ہی دھوکے میں مبتلا ہیں، لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔)

یہاں یہ یاد رہے کہ منافقوں کا گروہ عہد نبوت میں کافروں کا کوئی خاص گروہ نہ تھا، بلکہ بہ ظاہر یہ لوگ مسلمان تھے، انھوں نے اسلام قبول کیا تھا، مسلمان معاشرے سے ان کا تعلق تھا، لوگ انھیں مسلمان ہی سمجھتے تھے، مسلمانوں کی طرح یہ نماز پڑھتے، روزے رکھتے اور مسجدوں میں آتے جاتے تھے، ان کی بیویاں، ان کی اولاد اور رشتے دار سب لوگ انھیں مسلمان ہی سمجھتے تھے، بعض دفعہ جنگ و جہاد میں بھی مسلمانوں کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ مسلمان نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کے دل میں کھوٹ ہے، اپنے اسلام کا انھوں نے اعلان تو بے شک کر دیا ہے، لیکن اسلام کی حقانیت ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوئی اور اس کی صداقت ان کے حلق سے نیچے اتر کر ان کے دلوں کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوئی۔ وہ اخلاص سے محروم اور عمل سے تہی دامن تھے۔ وہ نماز پڑھتے تھے، مگر نہایت سستی اور بے دلی سے، وہ قرآن مجید سنتے تھے، مگر اس کے کسی حصے سے متاثر نہ تھے، وہ خیرات بھی کرتے تھے، مگر محض دکھلاوے کے لیے یا

مجبوری کے عالم میں۔ وہ جنگ میں شریک ہوتے تھے مگر اپنے فائدے کے لیے اور اس خیال سے کہ انھیں مال غنیمت ہاتھ آئے گا۔ ایسا بھی ہوا کہ سفر میں گئے' ان کے ساتھ مسلمان بھی ہیں اور وہاں کسی وجہ سے مسلمانوں کی مخالفت کی اور کہا کہ واپس مدینے جا کر ہم انھیں اپنے شہر سے نکال دیں گے۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(المنافقون: ۸)

(کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ حالاں کہ عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے' لیکن منافق یہ بات نہیں جانتے۔)

ان کی عادت یہ ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ تم نے فلاں فلاں موقع پر مسلمانوں کے خلاف یہ کہا تو صاف انکار کر دیتے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے تو ایسا نہیں کہا۔ قسموں کو انھوں نے اپنے بچاؤ کا ذریعہ بنا کر رکھا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهُمْ سَآءَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (المنافقون: ۲)

(انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔ اس طرح یہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ بے شک یہ برے کام ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔)

منافقوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دیا اور ہر موقعے پر ان سے فریب کیا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ جنگ احد کے موقع پر منافقین کا سرغنہ عبداللہ بن ابی مسلمانوں کی حمایت کے لیے نبی ﷺ کے ساتھ مدینے سے نکلا اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا' لیکن راستے میں نیت بدل گئی اور اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔

۲۔ غزوۂ خندق کے موقع پر یہ لوگ اپنے گروہ کے باشندگان مدینہ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے اور کہتے رہے کہ اب ہم لوگ شہر میں محصور ہو گئے ہیں، بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ مسلمان کہلانے والے خود بھی مریں گے ہمیں بھی ماریں گے۔

۳۔ عرب منہ بولے بیٹے (متبنیٰ) کو اپنے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ حضرت زید بن حارثہ ؓ سے نبی ﷺ کا معاملہ اسی قسم کا تھا، لیکن قرآن نے اسے غلط قرار دے دیا تو آپؐ نے زید کی مطلقہ بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا، اس پر منافقوں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ قرآن نے ان کے اس ہنگامے کی سختی سے تردید کی اور فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (الاحزاب:۱)

(اے پیغمبر! اللہ سے ڈرو، کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانو، یقیناً اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے۔)

اس آیت سے پتا چلا کہ اس ہنگامہ آرائی میں کافروں اور منافقوں کا ایک ہی نقطہ نظر تھا اور دونوں گروہ اس معاملے میں آنحضرت کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔

۴۔ غزوۂ بنی مصطلق کے زمانے میں ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف نہایت بد زبانی کی اور کہا کہ واپس مدینے جا کر مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا، جیسا کہ سورہ المنافقون کی آیت نمبر۸ میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ اسی جنگ میں واقعہ افک پیش آیا، اس وقت بھی منافقوں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف نہایت نازیبا الفاظ کہے۔ یہ سب باتیں عبداللہ بن ابی کی انگیخت پر کہی گئیں۔

۶۔ جنگ تبوک کے زمانے میں منافقین نے مسلمانوں کے خلاف بے حد تکلیف دہ پروپیگنڈا کیا۔

۷۔ مسجد قبا کے مقابلے میں ایک مسجد بنائی، جس نے اسلامی تاریخ میں مسجد ضرار کے نام

سے شہرت پائی۔ مسجد ضرار بعد میں نبی ﷺ کے حکم سے منہدم کر دی گئی۔

جنگ تبوک کے بعد عبداللہ بن ابی نے وفات پائی۔

اس شخص نے نبی ﷺ اور مسلمانوں کو انتہائی پریشانی میں مبتلا کیا' لیکن آپؐ نے اور مسلمانوں نے ہمیشہ صبر سے کام لیا۔ بعض صحابہ کرام نے آنحضرت نے عرض کیا کہ اسے قتل کر دیا جائے تو آپ نے روک دیا اور فرمایا لوگ کہیں گے محمد (ﷺ) نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔

اس کی وفات کے بعد آنحضرت نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے روکنے کے باوجود اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ بعد میں وحی نازل ہوئی' جس میں حضرت عمر فاروق کی رائے کی تائید کی گئی تھی اور منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے آپؐ کو روک دیا گیا تھا۔

منافقوں کا ذکر قرآن کے متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔ سورہ البقرہ کے شروع میں' سورۂ آل عمران کے بعض مقامات میں' انفال میں' توبہ میں' احزاب میں۔۔۔۔ المنافقون کے نام سے قرآن میں پوری سورہ نازل کی گئی۔ اور بھی مقامات میں ان کی نفسیات کے متعلق اہم اشارے کیے گئے ہیں۔

قومی اور جماعتی زندگی میں وہ لوگ نہایت ضرر رسانی کا باعث بنتے ہیں جو تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہوتے ہیں۔

کسی دینی اور دنیوی معاملے میں اس ذہنیت کے لوگوں کے سامنے کوئی راز کی بات نہیں کی جا سکتی' کسی اہم معاملے میں اس قسم کے افراد کو شریک مشورہ نہیں کیا جا سکتا' کوئی ذمہ داری کا کام ان کے سپرد نہیں کیا جا سکتا' کسی خاص مسئلے میں انھیں پیغام رسانی کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔۔۔ کسی سفارتی عہدے پر انھیں متعین نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص محض اپنے مفاد کو سامنے رکھتا ہو' دوسرے کی کوئی اہمیت اس کے پیش نگاہ نہ ہو' معاشرے کا کوئی آدمی اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کسی لالچ میں آ کر کب راز اگل دے اور معاملہ کچھ کا کچھ ہو جائے۔

جن لوگوں کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو، رسول سے جن کا کوئی تعلق نہ ہو، اسلام اور اسلامی معاشرے کا کوئی احترام نہ ہو، جو دوسرے تمام مفادات پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہوں، انھیں کس طرح لائق اعتماد گردانا جا سکتا ہے۔ قرآن اس قماش کے لوگوں کو "منافق" قرار دیتا ہے۔۔۔ اور منافق عمل و کردار کی تمام خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔

عہد نبوت کا یہ ایک بہت بڑا گروہ تھا جس کا قرآن نے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو انھوں نے جن پریشانیوں سے دوچار کیا اس کی وضاحت کی ہے۔ ان سطور میں قرآن کی روشنی میں ہم نے ان کے کردار کے متعلق چند ارشادات کر دیے ہیں۔

* * *

# آنحضرت ﷺ کی دنیوی زندگی کا آخری سال

## (۳۰)

حج اسلامی عبادات کا چوتھا رکن ہے' جو اللہ کی توحید کے اولین مرکز مکہ مکرمہ میں کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں پر یہ ۹ ہجری میں فرض ہوا' جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً (آل عمران: ۹۷)

(اور جو لوگ بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان پر حج فرض ہو گیا۔)

اسی سال نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحجاج مقرر کر کے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے بھیجا۔ ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۂ توبہ کا اعلان کرنے کے غرض سے روانہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کرایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورہ توبہ کی ابتدائی چالیس آیات' ان کے احکام کے ساتھ پڑھ کر لوگوں کی سنائیں

### آنحضرت ﷺ کا حج:

۱۰ ہجری میں خود نبی کریم ﷺ نے عزم حج فرمایا اور مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو اطلاع بھجوادی گئی کہ آنحضرت ﷺ اس سال حج کے لیے روانہ ہوں گے۔ چنانچہ بہت سے لوگ مدینہ منورہ میں جمع ہوگئے اور آپ اس عظیم الشان جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ راستے میں بھی کثیر تعداد میں لوگ آپ کے شریک سفر ہوئے۔

مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو آپ نے احرام باندھا اور **لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک۔ ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک** ۔ کا ترانہ بلند کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر ذی طویٰ میں

قیام فرما کر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر صفا اور مروہ کے پہاڑوں پر تشریف لے گئے۔ ان کی چوٹیوں پر چڑھے اور بیت اللہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

**لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر۔ لا الہ الا اللّٰہ وحدہ انجز وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ۔**

(اللہ سے سوا کوئی معبود نہیں' وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں' بادشاہت اسی کے لیے تمام شتائشیں ہیں اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ تنہا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا' اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اس اکیلے نے مخالفت کرنے والے تمام گروہوں کو شکست دی۔)

آٹھویں ذی الحجہ کو اپنی قیام گاہ مکہ سے روانہ ہو کر منی میں ٹھہرے۔ ظہر' عصر' مغرب' عشا اور فجر کی نمازیں منیٰ میں پڑھیں نو ذی الحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد وادی نمرہ میں تشریف لے گئے۔ اس وادی کے ایک طرف عرفات اور دوسری طرف مزدلفہ ہے۔ زوال آفتاب کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر عرفات پہنچے۔ عرفات کا تمام میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر شخص اللہ کی تکبیرو تحمید میں مصروف تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں ایک لاکھ چوالیس ہزار اور ایک روایت کی رو سے ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد جمع تھے۔

نبی کریم ﷺ نے پہاڑی پر چڑھے اور اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہوئے۔ وہاں خطبہ ارشاد فرمایا جو حدیث اور اسلامی تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ خطبے میں بہت سی اہم باتیں ارشاد فرمائیں۔ یہ بھی فرمایا کہ۔

"لوگو! میرا خیال ہے کہ آئندہ میں اور تم کبھی یہاں جمع نہیں ہوں گے۔"

نبی کریم ﷺ خطبہ ارشاد فرما چکے تو یہیں قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

**اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔** (المائدہ: ۳)

(آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے پسند کر لیا کہ تمہارا دین اسلام ہو۔)

منیٰ میں آپ نے ۶۳ اونٹوں کی قربانی کی۔ صحابہ نے بھی قربانی کی۔ کسی نے اونٹ ذبح کیے، کسی نے گائیں، کسی نے بکرے، اور مینڈھے ذبح کیے۔

قربانی سے فارغ ہو کر آپ بیت اللہ تشریف لے گئے اور طواف افاضہ کیا۔

## اللہ کی نصرت و فتح:

نبوت کا گیارھواں سال نبی کریم ﷺ کی دنیوی زندگی کا آخری سال تھا۔ وصال سے تھوڑا عرصہ قبل سورۂ نصر نازل ہوئی۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔

(جب اللہ کی نصرت آ پہنچی اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ لوگ جوق در جوق دین الٰہی میں داخل ہو رہے ہیں، تو اب اپنے پروردگار کی حمد و ثنا بیان کرو اور اللہ سے کثرت کے ساتھ استغفار کرو۔ یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔)

## وفات:

اس سورت سے اور آیت **الیوم اکملت لکم** سے خود آنحضرت بھی سمجھ گئے اور لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ اب آپؐ کی اس عارضی دنیا کی زندگی ختم ہونے والی ہے اور حیات جاودانی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ ۱۱ ہجری کے ۲۹ رمضان کو آپؐ کی بیماری کا آغاز ہوا۔ پہلے سر درد کا عارضہ لاحق ہوا۔ پھر شدید بخار ہو گیا۔ کبھی کچھ افاقہ ہو جاتا اور کبھی تکلیف بڑھ جاتی۔ بالآخر دو شنبہ کے دن چاشت کے وقت ۹۔ ربیع الاول کو جسم اطہر سے روح پُر نور پرواز کر گئی۔ اس وقت عمر مبارک قمری حساب سے ۶۳ سال چار دن تھی۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

## صحابہ کرام میں اضطراب اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فراست:

نبی کریم ﷺ کی خبر وفات صحابہ کرام کے لیے نہایت ذہنی اذیت اور اضطراب کا باعث تھی اور وہ نہایت حیرانی اور صراسیمگی کی حالت میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تو یہ کیفیت تھی کہ وہ مان بھی نہیں رہے۔ کہ آنحضرت ﷺ اس دینائے فانی کا سفر طے کر کے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے جسد اطہر کو دیکھا اور صحابہ کے تحیر کا اندازہ کیا تو بہ آواز بلند فرمایا:

فمن کان منکم یعبد محمدًا فان محمدا قدمات و من کان منکم یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حیٌّ لا یموت۔

(جو شخص تم میں سے محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا' اسے یاد رکھنا چاہیے کہ محمد ﷺ رحلت فرماگئے اور جو شخص اللہ کا عبادت گزار تھا' وہ سن لے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے' اس پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی۔)

اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ ط عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَ سَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۔ (آل عمران: ۱۴۱)

(محمدؐ تو اللہ کے ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر اگر وہ وفات پا جائیں (یا بالغرض لڑائی میں) قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں راہ حق سے پھر جاؤ گے۔ یاد رکھو! جو کوئی راہ حق سے الٹے پاؤں پھر جائے گا۔ وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جلد ہی اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں کو اس کا اجر

عطا فرمائے گا۔)

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ آیت کسی کے علم میں نہ تھی، ہم آج سے پہلی بار سن رہے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کے یہ الفاظ بھی تلاوت کیے۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ۝۔ (الزمر: ۳۰)

(اے پیغمبرؐ! موت یقیناً آپ پر بھی طاری ہونے والی ہے اور خود یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔)

یہ آیت اس وقت اتری تھی جب مشرکین مکہ اور منکرین اسلام شدت سے اس خواہش کا اظہار کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ حیات منقطع ہو۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منزل سے گزرنا ہے تو مخالفین بھی موت سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ اس موقعے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کی یہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط أَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ۔ (الانبیا: ۳۴)

(اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ سے پہلے کسی شخص کو ہمیشگی نہیں دی۔ پھر اگر آپ کو مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔)

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بے پناہ فراست تھی کہ اس نازک موقعے پر آپ نے یہ آیات پڑھیں اور صحابہ کی بے چینی اور حیرانی ختم ہو گئی۔

## نماز جنازہ اور اس کی دعا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ آپؐ کے گھر ہی میں پڑھی گئی جگہ تنگ تھی اس لیے دس دس آدمیوں نے باری باری پڑھی۔ جنازے میں مندرجہ ذیل دعا پڑھی گئی۔

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلآئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَا اَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ اَللّٰھُمَّ رَبنا لبیک وسعدیک صلوۃ اللّٰہ البر الرحیم والملئکۃ المقربین والنبیین والصدیقین والصالحین وما سبح لک من شیء یا رب العالمین علی محمد بن عبداللّٰہ خاتم النبیین وسید المرسلین وامام المتقین و رسول رب العالمین الشاھد المبشر الداعی باذنک السراج المنیر و بارک علیہ وسلم۔

* * *

عطیہ کتاب عبدالوحید صاحب

جامعہ نذیریہ اہلحدیث
لائبریری
سلسلہ نمبر........
سدھو فیروزپور روڈ لاہور

# ہماری دیگر کتب

شمائل ترمذی
لسان القرآن
علم و عرفان
پبلشرز
فقہ عمرؓ
تربیت اولاد کا اسلامی نظام
تربیۃ الاولاد فی الاسلام

علم و عرفان پبلشرز